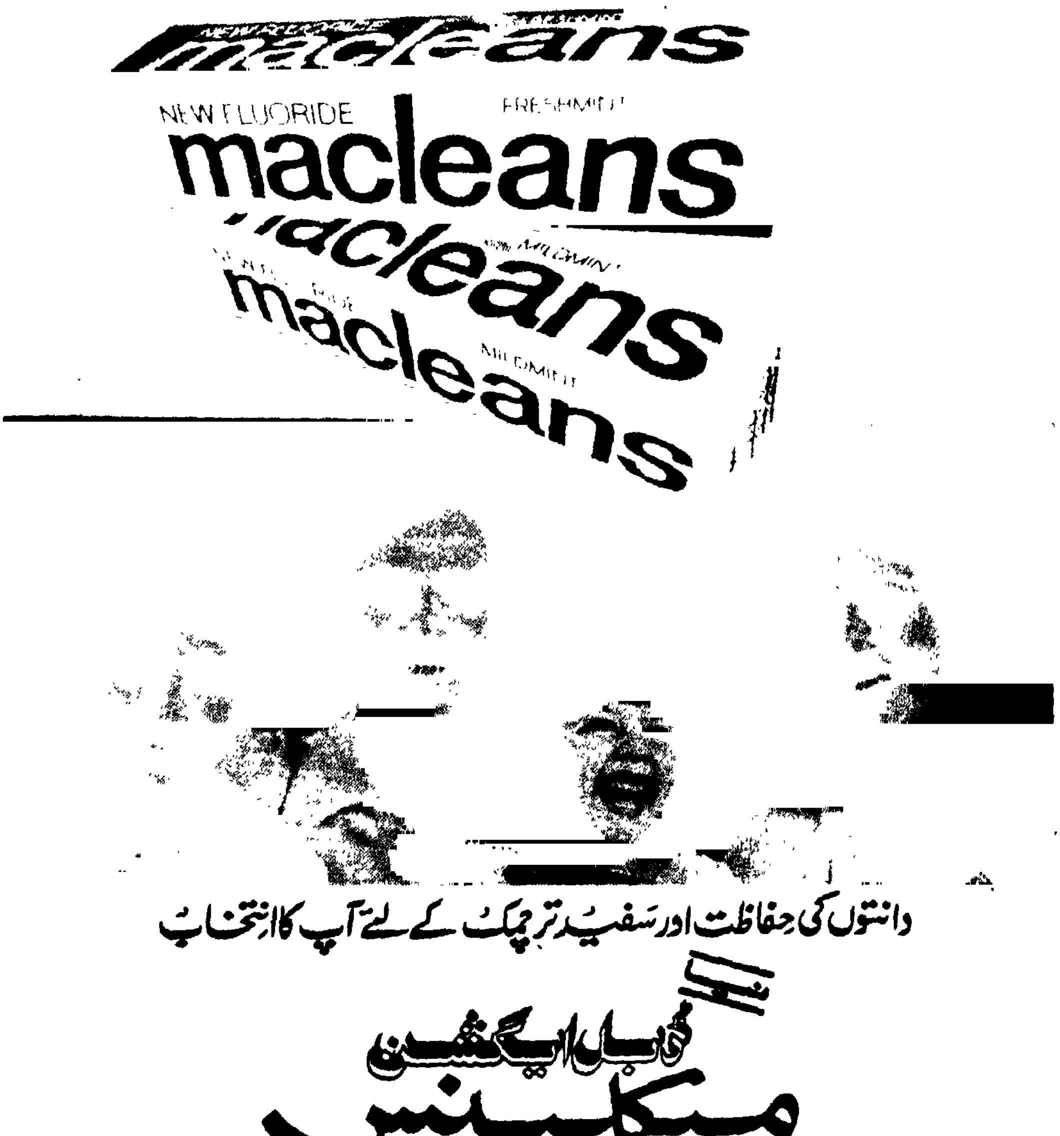

H
3
A. RSV
20.10.91


رنگِ بہاراں
آدم جی کا
شبنم
لان
آدم جی کے شبنم لان میں بھی
پُرکشش، جاذبِ نظر شخصیت
رنگا رنگ ڈیزائن۔
جدید ترین فیشن کے پرنٹس
خریدتے وقت




vespa
new line


دنیا بھر میں اہل ذوق
طلب کرتے ہیں
CAPSTAN
۴۰ر۶ روپے میں ۲۰
۲۰ر۳ روپے میں ۱۰
PTC 79-CA


NEW FLUORIDE
FRESHMINT
macleans
macleans
macleans
macleans
MILDMINT

سیپ کراچی

شہر کے مرکزی علاقے میں
جدید دور کی آسائشوں سے مزین
ایک باوقار رہائشی کمپلکس

کریم اپارٹمنٹس

شہر کے بیچوں بیچ پُرسکون اور خوشگوار فضا میں رہائش کے متلاشی
کرم فرماؤں کے لئے کشادہ اور آرام دہ اپارٹمنٹس پر مشتمل یہ بے مثال منصوبہ
جدید دور کی آسائشوں سے مزین ہوگا۔ بیک وقت تمام خوبیوں سے آراستہ
رہائش حاصل کرنے کا ایسا سنہری موقع شاذونادر ہی دستیاب ہوتا ہے۔
اسلامیہ کالج کے قریب ایم۔اے جناح روڈ پر مالکانہ حقوق کے ساتھ
کریم اپارٹمنٹس شہر کے بارونق رہائشی علاقوں اور معروف تجارتی مراکز سے قریب ترین ہونگے۔

بکنگ "پہلے آیئے پہلے حاصل کیجئے" کی بنیاد پر۔ کے ڈی اے کی منظور شدہ قیمت اور مقررکردہ وقت پر قبضے کی ضمانت

- تین بیڈ روم اٹیچڈ باتھ کے ساتھ
- ماربل ٹائلڈ باتھ روم
- کشادہ ڈرائنگ/ڈائننگ روم
- خوبصورت ٹی وی لاؤنج اور بالکنی
- ماربل فلور کے ساتھ لگژری کچن
- وہائٹ موزیک فلورنگ
- ٹھنڈے اور گرم پانی کی لائنیں
- کنسیلڈ وائرنگ • لفٹ کی سہولت
- کار پارکنگ کی وسیع گنجائش
- مسجد۔اسکول۔کالج۔ہسپتال شاپنگ سینٹر اور دوسری ضروری سہولتیں قریب ہی موجود
- چوبیس گھنٹے ہر طرح کی ٹرانسپورٹ بآسانی دستیاب

آرکیٹیکٹس اینڈ کنسلٹنٹس: کے۔آر۔ڈی ایسوسی ایٹس
اسٹرکچرل انجینیئر: مشتاق اینڈ بلال

بکنگ آفس:

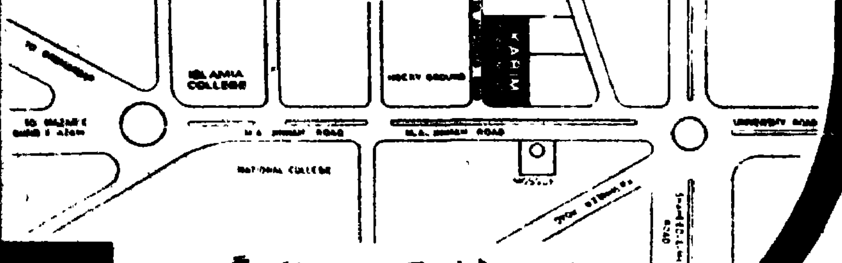
کریم ہاؤسنگ انٹرپرائزز

فرسٹ فلور، کریم سینٹر، جہانگیر پارک روڈ۔ کراچی۔
فون: 512374

سائٹ بکنگ آفس:

۴/۴۸ - ایم اے جناح روڈ (جے۔ایم۔کوارٹرز)
نزد اسلامیہ کالج۔ کراچی
اوقات کار سائٹ آفس:
صبح ۹ سے رات ۹ بجے تک
اور سائٹ آفس جمعہ کو بھی کھلا رہے گا۔

Approved by the Master plan Department vide letter No. MP/DCB(D)/311/ADV/108/80 Dt: 18.2.1980



پروموٹرز
کریم ہاؤسنگ انٹرپرائزز
KHE
فرسٹ فلور، کریم سینٹر، جہانگیر پارک روڈ، کراچی

فکرِ نو کا ترجمان

سیپ

شمارہ — ۴۰

سہ ماہی اشاعت خاص

مارچ۔ اپریل ۱۹۸۰

مدیر

نسیم درّانی

قیمت: ۱۵ روپے — سالانہ ۶۰ روپے مع رجسٹری خرچ

پوسٹ بکس نمبر ۳۲۲۴، کراچی ۲۸

فون: ۶۸۰۱۰۴ — ۲۹۰۸۳۷

ترتیب

اداریہ	نسیم درانی	۲۰
سرورق	جمیل نقش	
حمد	سرشار صدیقی	۲۳
نعت	عابد جشری	۲۴
مرسلِ آخر	قمر ہاشمی	۲۵

مضامین

خواب اور حقیقت کا شاعر	احمد ہمدانی	۲۰۰
مغرب میں احیائے علوم	ڈاکٹر انور سدید	۲۰۴
سوتے میں چلتی ہوا سے لڑنے والی شاعرہ	ڈاکٹر سلیم اختر	۲۱۰
رائٹرز نوٹ بک	جوگندر پال	۲۱۶
چھوٹی صنف کا بڑا شاعر	جمال پانی پتی	۲۲۰
نئے افسانے کا قد آور بونا	نجم الحسن رضوی	۲۲۸
تصوف اور وجودیت	ہری داس چودھری / نسیم نیشوفوز	۲۳۲

افسانے

سیٹرڈے نائٹ فیور	خواجہ احمد عبّاس	۳۲
تعبیر	رضیہ سجّاد ظہیر	۴۴
چوتھا کھونٹ	افسر آذر	۴۸
گریز پا	سلیم اختر	۵۲
پہرے	جوگندر پال	۶۰
۷۸۶	مظہر الاسلام	۶۶
زیتون کی ایک شاخ	زاہدہ حنا	۷۰
اُجلے تھل کی مچھلی	علی حیدر ملک	۸۴
برف کا دھواں	شکیلہ رفیق	۸۸
پانی کو چلتا رہنے دو	ایوب خاور	۹۶
روز روز کا قصّہ	علی تنہا	۱۰۴
حبس	شہناز پروین	۱۰۸
پہلے آدمی کی موت	طارق جامی	۱۱۲
لایعنی صورتِ حال میں ایک کہانی	محمودہ غازیہ	۱۱۵
کورس	دودھناتھ سنگھ / اسد محمد خاں	۱۱۸

سرگزشت

کھوئے ہوؤں کی جستجو	شہرت بخاری	۱۲۷

نظمیں

متاعِ رائیگاں گریز تادیب لطیفہ ایک کیفیت	اختر الایمان	۱۵۴

اب شکر	سلیم احمد	۱۵۷
میرا ہم سفر زودِ نمو پت جھڑ رنگ سہانے	انجم اعظمی	۱۵۸
دھوپ گھڑی فاصلہ تنسیخ دل دریا پیمان ویرانے اَنا	سرشار صدیقی	۱۶۰
انتہائے الم کا پہلا خواب دن کا کالا سورج گل دوپہر	احمد ظفر	۱۶۳
مائیکل انجیلو کی ایک رات	قمر جمیل	۱۶۵
اِک پل	عبید اللہ علیم	۱۶۶
جو سراپا ہے غزل کردار	محسن احسان	۱۶۷
ایک نظم ایک شاعرہ کے لئے	سحر انصاری	۱۶۸
جھیل، ہونٹ اور جلتی لکیریں	سیّد احمد شمیم	۱۷۱
جل پریاں کینسر وارڈ	حسن اکبر کمال	۱۷۲
کیوں آنکھ بے چراغ	انور شعور	۱۷۵
ایک اداس شام کے نام پیش لفظ	افتخار عارف	۱۷۶
اے شبِ ماہ مجھے جینے دے پیمانہ	شاہدہ حسن	۱۷۷

تکمیل کی آرزو بے خبر کنارا	ارمان نجمی	۱۷۸
گیلری میں ایک تصویر	ایوب خاور	۱۷۹
صحرا اور سمندر کے درمیان	سید جلیل ہاشمی	۱۸۰
سالِ رفتہ کی آخری نظم	صفدر سلیم سیال	۱۸۱
خزاں چہرہ نظم	علی عباس امید	۱۸۲
بارھواں جنم دن حوا کی بیٹی کا پہلا دکھ	عشرت آفریں	۱۸۳
درخت اور بارش برگد کا پیڑ	ذاکر نسیم	۱۸۴
نئے لمحوں کی خوشبو جب گلاب واپس آئے گا	محمودہ غازیہ	۱۸۵
آغاز	ایڈرینارچ ظہیر پراچہ	۱۸۶
عام سے عاشق کا گیت	فلورین رینے وو اصغر ندیم سید	۱۸۸

گیت

چونک پڑے ہیں سوئے ہوئے تھے رین باٹ پہ جھل مل جھل مل گونج ہواؤں میں رہتی ہے بیتے جیون کی گلیوں سے آنے لگی	نگار صہبائی	۱۸۹
ہرے ہرے ری رات پہلے مکھ اس جانب موڑ تو رادھا اپنے رام کی تیرے رنگ رنگے مورے نین	ناصر شہزاد	۱۹۳
تمھیں جانا تھا من آنگن میں دریا ہے	سلیم کوثر	۱۹۷

غزلیں

کب تلک بے مہریٔ حالات کی باتیں کریں گھٹ کے رہ جاتے ہیں دریا خاکنائے دہر میں ناچتے ہیں سربسر کون و مکاں، اللہ بس	خورشید الاسلام	۲۴۰
رخ پہ گردِ ملال تھی کیا تھی دنیا داری تو کیا آتی دامن سینا سیکھ لیا جلتا نہیں اور جل رہا ہوں	خلیل الرحمٰن اعظمی	۲۴۲
آؤ ڈھونڈلیں لذت ہی کا ہی پہلو کوئی غم میں ہم نے یہ درس پایا ہے دے کے زندگی سے	شان الحق حقی	۲۴۴
لکھی نہ کوئی بات رُلانے کے واسطے	احمد ظفر	۲۴۵
ہائے وہ دل جو محبت کا طلبگار بھی تھا تجھ کو پایا بھی تو کیسے تجھے کھویا کب تھا	کرار نوری	۲۴۶
لوٹ کر نہ آئے کیوں روٹھ کے جانے والے جب سے سیکھا تری آنکھوں سے مروت کرنا	جمیل ملک	۲۴۷
میری نظر میں وہی کچھ خیالِ فن کرتے کسی کا ہاتھ نہیں ہے مری تباہی میں آوارگی کا حسن نکھر جانا چاہیئے وقت کا زہر مری آنکھ سے کب اچھل تھا	عابد حشری	۲۴۸
وہ پیار کی خوشبو جو چھپائی نہیں جاتی	امید فاضلی	۲۵۰
اس سے بچھڑے ہیں تو کیا مر جائیں گے	انجم اعظمی	۲۵۱
وہ رہ رہ کے جو چھپتا نا رہے گا بچھڑ کے ہم سے وہ اب تک بچھڑ سکے بھی کہاں ہر اک جھونکے پہ منہ کیوں فق ہوا ہے عجب دکھ ہے کہیں بھی کیا کسی سے	احمد ہمدانی	۲۵۲
روشنی کے ساتھ پہنچی تیرگی انجام کی پھر اس کے بعد کی جو روش ایجاد کی ہم نے	صہبا اختر	۲۵۴
بہت دنوں بعد منہ سے دانش کی بات نکلی	فضا ابنِ فیضی	۲۵۵

ہم اپنے سر پہ کھلا آسمان رکھتے ہیں اب جدھر جائیں لے کے سر جائیں	اختر ہوشیارپوری	۲۵۶
تو اپنی آواز میں گم ہے میں اپنی آواز میں چپ	عبیداللہ علیم	۲۵۷
رواں بدن سے ہر اک شب ہے خواب میں دریا	محسن احسان	۲۵۸
دل پہ کس کے در جاتا ہے مشاعرے میں جنہیں داد دے کے آتے ہیں آکے ترستا ہوں میں ہمسفری کے لئے	انور شعور	۲۵۹
حقیقتوں سے ملاقات خواب میں رکھئے نقشِ سفال چاک سے اُترا بکھر گیا	سحر انصاری	۲۶۱
جب سے قریب ہو کے چلے زندگی سے ہم جہاں نہ تیری مہک ہو اُدھر نہ جاؤں میں	ندا فاضلی	۲۶۲
تیرے قرب کا آنند تیرے ہجر کا صدمہ شبد میری شوبھا ہے، گیت تیرا گہنا ہے	ناصر شہزاد	۲۶۳
سرِ شاخِ صبح کھلا گلاب یقین کا کہیں سے کوئی حرف معتبر شاید نہ آئے	افتخار عارف	۲۶۴
کراہتی ریت کے گھروں کو ابھی تو ٹھہریں گے الفاظ معتبر اس کے لمحہ لمحہ میری راہ میں بکھرا ہے	احسن زیدی	۲۶۵
تیرے عارض سے خوش رنگی کا ہر رشتہ سوادِ جاں میں نہ یوں دربدر پھرا مجھ کو	عالمتاب تشنہ	۲۶۶
رنگِ شفق سے مطلعِ انوار سے چلے	جمیل عظیم آبادی	۲۶۸
پاپایوں کا شوق بھی مہنگا پڑا ہمیں وہ تیرا ہجر کہ آئے خیال بھی کیا کیا	ثمر نظامی	۲۶۹
جھانکے ان انکھڑیوں میں تو مر جائے آدمی بادل کی طرح تو جو کبھی کھل کے برس جائے	تبسم رضوی	۲۷۰
وہ جس نے شہر ستمگر کی خاک چھانی ہے میں تو پھر میں ہوں، وہاں میرا نہ سایہ جائے	رئیس باغی	۲۷۱
دکھ کا احساس نہ مارا جائے	محمد علوی	۲۷۲
جلے گا بھی کہاں جائے گا پاؤں والا	شاہد کبیر	۲۷۲

خود آشنائی کا لمحہ ذرا گزر جائے		
پیڑوں کو درکار تو ہے ہریالی مٹی	سلیم کوثر	۲۷۳
میں تنگدست تھا ایسا گزارا کیا کرتا		۲۷۱
تنہا بھی منہ اٹھا کے نکلنا محال ہے		
ملنا نہیں تو یاد اسے کرنا چھوڑ دے	جمال احسانی	۲۷۴
جمال وعدہ یک نان خشک پہ رہنا		
ہجر کی ساعتیں وصال کا وقت		
زخم کب کا تھا درد اٹھا ہے اب	تاجدار عادل	۲۷۶
تمام رات جاگنے کے بعد چاند سو گئے		
پھر اک رات انوکھے پن کی پھر اک شام سفر میں	غلام حسین ساجد	۲۷۷
خطوں میں لکھی گئی تھیں عبارتیں کیسی		
گذرتے لمحوں میں جاگتے ہیں خواب	محمد علی سیّد	۲۷۸
بندۂ جبر کو دھن، مرد خدا کیسے ہو	س یونس	۲۷۹
الجھا ہوا سا تھا کبھی سہما ہوا سا تھا	بدر جمیل	۲۷۹
بیتی رت کا میں ساتھی ہوں لوگ مجھے پہچانیں کیا		
ٹیڑھی میڑھی راہ مجھے کس موڑ پہ لے کر جائے گی	دل شیر ساجد	۲۸۰

(۲)
شاہدہ حسن کی غزلیں

ہوا پہ چل رہا ہے چاند راہوار کی طرح		
تنہائی سے دامن بھر لائی		
خاک ہوں یا کسی سحاب میں ہوں		
کوئی سرد ہوا لب بام چلی		
جب گھر ہی جدا جدا رہے گا		
سوادِ شام سے تا صبح بے کنار گئی	شاہدہ حسن	۲۸۱
جب سے وہ مہمان ہوا		
چراغ شام ہی تنہا نہیں ہے		
لمس آہٹ کے ہواؤں کے نشاں کچھ بھی نہیں		
موسم ہی مرے نہ ان کی ہوں میں		

کیا ہوا صبح کے تارے نے جو در کھول دیا ایک چھوٹی سی کہانی ہے تری یاد مجھے ستارہ چشم ہے اور مہرباں ہے رہی رگوں میں دیر تک انکار تھا بے شمار میرا	شاہدہ حسن	۲۸۶

تبصرے ۲۸۹–۲۹۷

کوندے سطح آب والگینو	سرشار صدیقی	
نئے شعری تجزیے کتنی دیر چراغ جلا تعارف	احمد ہمدانی	
گذرے وقتوں کی عبارت سورج کی آنکھ	حسن اکبر کمال	
لوک تماشا	اعجاز راہی	
مجلّہ	مہر افروز	

اداریہ / نسیم دُرّانی

آغاز رحمٰن و رحیم اللہ کے نام سے

عبیداللہ علیم
اے۔۴۱۔آر
ناظم آباد۔کراچی

نسیم خان

صبح و شام ملاقات رہنے کے بعد بھی تمھیں خط لکھنا کچھ عجیب سی بات ہے مگر یونہی خیال آیا کہ وہ گفتگو جو محض فضاؤں کی سماعت میں محفوظ ہوتی رہتی ہے اسے کیوں نہ اپنے رفیق لکھنے والوں کی بصیرت کا دکھ بنایا جائے۔

تمھیں "سیپ" نکالتے ہوئے ، ابرس ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے تم بچّوں کے رسالے "میرا رسالہ" کے مدیر تھے۔ شمش زبیری صاحب والے نقش میں بھی تم نے بہت جان کھپائی۔ "الفاظ" کا تمھیں الگ دکھ ہے اور آرٹس انٹرنیشنل کے تم الگ خواب دیکھتے رہتے ہو۔ میں سوچتا ہوں۔ اگر ان تمام روحانی اور جسمانی آزاروں کے بجائے تمھاری کوئی پرچون کی دوکان ہوتی تو شاید آج تم کسی بڑے پلازہ کے مالک ہوتے اور اگر یہ بھی تمھاری طبع کے موافق بات نہیں تھی تو تم نے ایم اے فرسٹ کلاس کیا ہی تھا، گولڈ میڈلسٹ ہو سی ایس پی میں Try کرتے تو اب تک کسی ثقافتی ادارے کے سربراہ ہوتے، کہیں ڈپٹی کمشنر ہوتے، کمشنر ہوتے۔ لکھنے پڑھنے کے دکھ سے بھی نجات ملتی ادھر ہوتے تم کوئی نہ کوئی پھڑلس چیز۔

اب ایڈیٹر ہو، افسانہ نگار ہو، ادب اور ادیبوں کے بُرے بھلے کی سوچتے ہو۔ گرمیوں سردیوں، ماجیوں کے ٹھنڈے اور گرم کمروں میں جا کر ادب کی تہذیبی قوت پہ باتیں کرتے ہو اور ان کے کلام بلاغت نظام کو برداشت کرتے ہو۔ یار میرے یہ کیسی آگ ہے۔ یہ کیسی روشنی ہے جو بونوں کے سامنے گھگھیائی ہوئی کیفیت میں رہتی ہے۔ ادب کے احترام و حرمت کی بات کس کے منہ پر نہیں۔ مگر دلوں میں بھوتوں اور چڑیلوں کے مسکن۔ ذرا سوچو عالم فاضل فلمی ستارے اور اسٹیج، ٹیلی وژن، پر کولھے مٹکا مٹکا کر گانے والے اور گانے والیوں اور ایکٹروں کے مقابلے میں تم کون ہو میں کون ہوں۔ فنون لطیفہ کا تقدس اب شاید ہمارے یہاں سے رخصت ہو چکا ہے۔ ادب ہو، موسیقی ہو، پینٹنگ ہو، رقص ہو، آرکیٹیکچر ہو، سب اپنی اصل سے پیچھے دھکیلے جا رہے ہیں اور ان کے نام پر ایک بھونڈا پن اور بدشکلی اس معاشرے کی ضرورت بنائے جا رہے ہیں۔ اس کا جواب تمھیں بھی معلوم ہے مجھے بھی معلوم۔ مگر تم کیا کرو ہم کیا کریں۔

بہت سے لوگ کہتے ہیں میاں ڈائجسٹ وائجسٹ نکالو۔ جس سے پیسہ ویسہ آئے۔ اس ادب ودب میں کیا رکھا ہے۔ کیوں اپنی عمریں گنوار ہے ہو۔ مگر ہم کیا کریں کہ ہم ہر قیمت میں ادب ہی کو زندگی سمجھتے ہیں اور اسی میں ضائع ہونے کو اپنی زندگی کی مجبوری خیال کرتے ہیں۔

کسی شریف عورت کو کسی طوائف کی سج دھج اور تموّل دیکھ کر زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہیے لیکن اگر طوائف شریف عورت کے مقابلے میں زیادہ باعزّت اور قابل احترام سمجھی جانے لگے تو یوں سمجھنا چاہیے کہ وہ تہذیب اپنے

زوال کے آخری زمانے میں آ چکی ہے۔

ڈائجسٹوں کی بلندی سے ادبی رسالوں کی پستی بھلی کہ یہ پستی ذات و زمان کے الجھاؤ کی ہے اور وہ بلندی سہل پسندی، بھونڈے اور ہر قیمت پر دولت کمانے کی ہے۔ نسیم خاں مجھے بھوت پریت ٹائپ کے ڈائجسٹ نکالنے والے خواتین و حضرات کے گھروں میں سیپ، نقوش، فنون اور دوسرے ادبی جرائد کو بہت قیمتی جلدوں میں نمبروار سجایا ہوا دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ شاید یہ ان کی ایسی ضرورت ہے کہ کبھی کبھار انھیں بھی سر اور سینہ ڈھانپنے کی مصنوعی خواہش ہو جاتی ہے اور وہ ادھر اُدھر سے کچھ مال لے کر اور کچھ نام لے کر اپنے ضمیر کو اطمینان دلاتے ہیں کہ صاحب ہم بھی ادب چھاپتے ہیں۔ خیر جانے دو۔ ردّی بھی تو ایک ضرورت ہے۔

تم نے ایڈورٹائزنگ کمپنیوں کی گزشتہ سال منعقد ہونے والی کانگریس کا وہ سوونیر تو دیکھا ہے جس میں بطور "میڈیا" ریڈیو، ٹیلی وژن، اخبارات، فلمی سیاسی رسالے، ڈائجسٹ سبھی کے نام دیکھے۔ اگر نہیں دیکھا تو کسی ادبی رسالے کا نام۔ مجھے حیرت سے زیادہ شرم محسوس ہوئی کہ چلو اپنے یہاں کی تو خیر ہے باہر کے ممالک میں کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا کہ ہمارے یہاں سرے سے ادب نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ مشتہرین کے یہاں بھی کوئی نہ کوئی ادیب، شاعر، محقق، نقاد ضرور پیدا ہوا ہوگا۔ اور ان کے خاندان کی عزّت کا باعث بھی ہوگا اور وہ ایسے ہی رسالوں میں لکھتا لکھاتا بھی ہوگا۔ یہ لوگ کیا یہ بات بالکل بھول گئے کہ جتنے بڑے ادبی نام تہذیبی سماعتوں میں گونجتے ہیں یا گونج رہے ہیں وہ سب انہی رسالوں کا خزانہ ہیں جن کا ذکر کرنا اب ایڈورٹائزنگ والے ضروری نہیں سمجھتے۔ افسوس صد افسوس۔ انھیں کون بتائے کہ یہ کم چھپنے والے رسالے تمھاری ہی آبرو ہیں، تمھاری ہی زندگی ہیں اور تمھاری ہی تہذیب ہیں۔

نسیم خاں یہ ساری باتیں اس مجموعی فضا کی ہیں جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ نہ یہاں سب زندہ ہیں نہ سب مردہ۔ نجیب اور شریف لوگوں سے یہ کائنات کبھی خالی نہیں ہو سکتی۔ ہزار گھٹیاپن اور سستے پن کے باوجود ایسے لوگوں سے آج بھی ملاقات ہوتی ہے جو ادب کو حرمت اور عزّت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ حرفِ زندہ پھر حرفِ زندہ ہے اور حرفِ زندہ کو موت نہیں آتی اور یہ حرفِ زندہ چپ چاپ مہذب گھروں میں، محفلوں میں اور کتب خانوں میں اپنا دیا جلائے رکھتا ہے اور یہ ایک نسل کا ہاتھ دوسری نسل کے ہاتھ میں دیتا چلا جاتا ہے۔

جی چاہتا ہے کہ تمھیں سینے سے لگا لوں، پیار کروں اور خوب داد دوں کہ تم اس گروہ کا علم اٹھائے ہوئے ہو جو زندگی تک تاریک رہتا ہے اور مرنے کے بعد چراغ بن جاتا ہے۔ بڑے کام کی بڑی مشکل ہوتی ہے۔ سو یہ دکھ تمھیں سہنا ہے اور اب اور بھی زیادہ سہنا ہے کہ آسیبوں کے سائے روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ سو ہمیں اندر بھی لڑنا ہے اور باہر بھی لڑنا ہے۔ اور ابھی ہم زندہ ہیں کہ ہمارے جسموں پر نئے تیروں کے لئے بہت سی جگہ باقی ہے۔ خدا تمھیں خوش رکھے۔

علیم
۸۰-۴-۲۲

پچھلے دنوں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا احتشام الحق تھانوی، رازق الخیری، سہیل عظیم آبادی، ڈاکٹر صفدر حسین، رضیہ سجاد ظہیر، سرور بارہ بنکوی، احمد پرویز، ذکی انور، ڈاکٹر احراز نقوی، ڈاکٹر خان رشید، پریم [illegible] اور [illegible] سارتر ہم سے بچھڑ گئے۔ کیسے کیسے زخم لگے ہیں، اور کتنے کاری زخم ہیں۔ ادارہ "سیپ" ان بزرگوں اور دوستوں کے بچھڑ جانے پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

این آئی ٹی
اسلامی نظامِ معیشت کی جانب پیش قدمی

این آئی ٹی اسلامی جمہوریۂ پاکستان میں سرمایہ کاری کا واحد قومی ادارہ ہے جس نے یکم جولائی ۱۹۷۹ء سے اپنے کاروبار کو کلی طور پر سود سے مبرا شراکت کی بنیاد پر استوار کر لیا ہے۔

این آئی ٹی یونٹ کی فروخت سے جمع شدہ کثیر رقوم کی سرمایہ کاری ۵۰ سے زائد پبلک لمیٹڈ کمپنیوں کے حصص میں کی گئی ہے اور این آئی ٹی کے موجودہ اثاثہ جات ایک ارب روپے سے متجاوز ہیں۔

این آئی ٹی کی سرمایہ کاری سے حاصل شدہ آمدنی کو این آئی ٹی کے حصہ داروں میں بطور سالانہ منافع تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ این آئی ٹی نے ۱۹۶۲ء سے ہر سال باقاعدگی سے معقول شرح پر منافع تقسیم کیا ہے اور ۸۰-۱۹۷۹ء کے لئے این آئی ٹی کی شرح منافع ایک روپیہ ۳۰ پیسہ فی یونٹ تھی۔ سالانہ منافع کے علاوہ این آئی ٹی یونٹ کی قیمت بتدریج بڑھنے سے اصل سرمایہ میں اضافہ کے امکانات بھی موجود ہیں۔

این آئی ٹی یونٹ میں مقررہ حد تک سرمایہ کاری سے انکم ٹیکس کے مروجہ قوانین کے تحت ٹیکس کی چھوٹ (بطور انوسٹمنٹ الاؤنس) حاصل کی جا سکتی ہے۔ این آئی ٹی سے حاصل شدہ منافع بھی مقررہ حد تک انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

این آئی ٹی کے حصہ داروں کی تعداد ۸۰ ہزار سے زائد ہے اور ان میں غالب اکثریت متوسط طبقہ کے افراد کی ہے۔ ان حصہ داروں کا اعتماد ہی این آئی ٹی کا سرمایۂ افتخار ہے۔

این آئی ٹی یونٹ خرید کر سود سے پاک سرمایہ کاری کی برکتوں سے مستفید ہوں۔

این آئی ٹی — قومی سرمایہ کاری کا قابلِ اعتماد ادارہ

نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ لمیٹڈ

کراچی۔ لاہور۔ راولپنڈی۔ اسلام آباد۔ پشاور۔ کوئٹہ۔ حیدرآباد۔ ملتان۔ فیصل آباد

سرشار صدیقی

حمد

وحدہٗ

صبحِ ازل کیا
شامِ ابد کیا
قیدِ مکاں کیا
وقت کی حد کیا
تو ان سب سے بالاتر ہے
تو ہی مخفی تو ہی خبر ہے
سب چہرے تیرے ہی چہرے
سارے نام ترے ہی نام
تو خود ہی اپنا شہ کار
تو خود ہی اپنا انعام

○

عابد حشری

نعت

نہ جس کا ثانی کوئی زمیں پر / نہ کوئی جس کا فلک پہ ہمسر
جو سب سے اعلیٰ جو سب سے برتر / ہے بعدِ ربِّ قدیر و اکبر
وہ فخرِ محراب و نازِ منبر / زمیں پہ آیاتِ حق کا مظہر
وہ جس سے صبحِ ازل فروزاں / وہ جس سے شامِ ابد منوّر
شہود جس کا تجلّیٔ حق / وجود جس کا دلیلِ داور
وہ آئینہ ہے جمالِ حق کا / وہ حسنِ انسانیت کا جوہر
وہ طلعتِ مہرِ آگہی ہے / وہ علم و عرفاں کا اِک سمندر
وہ دشتِ بے مہرِ آرزو میں / ہے موجِ تسنیم و جوئے کوثر
وہ زندگی کے ہر اک سفر میں / نظر کا مرکز دلوں کا محور
ہے آگہی جس کے در کی درباں / ہے روشنی جس کے گھر کی چاکر
کہاں ثنا اس کی اور کہاں میں / میں ایک قطرہ وہ اک سمندر
اسیرِ لوح و قلم کے آگے / ہیں تنگ حرف و بیاں کے گوہر
مگر لبوں پر ہے ذکرِ انور / وہ میرا آقا وہ میرا سرور

عظیم انساں، عظیم رہبرؐ

قمر ہاشمی

مُرسلِ آخرؐ

(طویل نعتیہ نظم سے اقتباس)

میں جس زمین پر قدم جمائے کھڑا ہوں
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے
قرونِ اولیٰ کا ریگ زارِ عرب ہے یہ بھی
وہی جہالت وہی تعصب وہی تنفّر
وہی غرض مند خانوادے
بایں ہمہ اس کا معترف ہوں
وہ قول فیصل تھے دست و بازوئے تیغ زن تھے
یہ ایک کردار تھا عرب کا

فریب سب سے بڑی سیاست
ریا ہے سب سے بڑا عقیدہ
اور ان مفاسد کی زہرناکی ہے بین قومی
میں ہاشمی ہوں
صداقتوں کا امین و وارث
جو دیکھتا ہوں
جو سن رہا ہوں
وہی کہوں گا
وہی لکھوں گا

یہاں اگر میں کسی کے مدمقابل آؤں
تو صرف گفتار کا ہوں غازی
مبارزت میں
زباں حریفوں کے
شجرہ ہائے نسب میں
کیڑے نکالتی ہے

مری زباں پر ہیں صرف انسان کے کارنامے
زمیں سے کائنات کی وسعتوں
خلائے بسیط و سیارگانِ گردوں کی
فتح و نصرت کے خوابِ زرّیں
سیاسی تعبیر زندگی کی
میں ہم نوائی نہیں کروں گا
میں اک گروہی کی عظمتوں کا ہوں صرف قائل

جسے حقیقی دوام حاصل ہے
عرش کی رفعتوں سے
ہر ابر و باد کے کرۂ جہاں تک
جو عرش کی رفعتوں پہ ہو کر
زمین کی پستیوں کو
شمس و قمر کی تسخیر کی بشارت بھی دے چکی ہے
اور اس کی اُم الکتاب
تشریح کر رہی ہے

وہ ریگ زاروں میں کھلنے والا گلاب
نکہت فروزِ گیتی
مشامِ ذہن و خیال آسودہ کرنے والا
ہتھیلیوں پر اٹھاتے
عظمت کے چاند سورج
فرازِ آدم کا پاسباں ہے
قُلْ اِنَّمَا کی مقدس آیت
عروجِ انساں کی ترجماں ہے

آگ برسے فضا سے تو موجِ نسیم
پیکرِ عزم و ایثار دُرِ یتیم
دورِ تخریب میں آشتی کے رسول
جیسے شعلوں میں کھل جائے بیلے کا پھول
دشتِ آزار میں
راحتوں کی خبر
سربلندی نوعِ بشر
وادیٔ خار میں سردِ آرامِ جاں
زیرِ افلاک رفعت نشاں
زیست کی شعلگی میں سحابِ کرم
زرفشاں صبح کا حسن
آثارِ خیرُ الامم
سینۂ انساں کے درد کا مہرِ نصف النہار
سخت جس طرح تلوار ہو
نرم جوں شاخسار
اشرفُ الانبیا مُرسلِ آخریں
رحمتِ مستقل کارِ خیر آفریں

؎ قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ الخ (القرآن الحکیم)

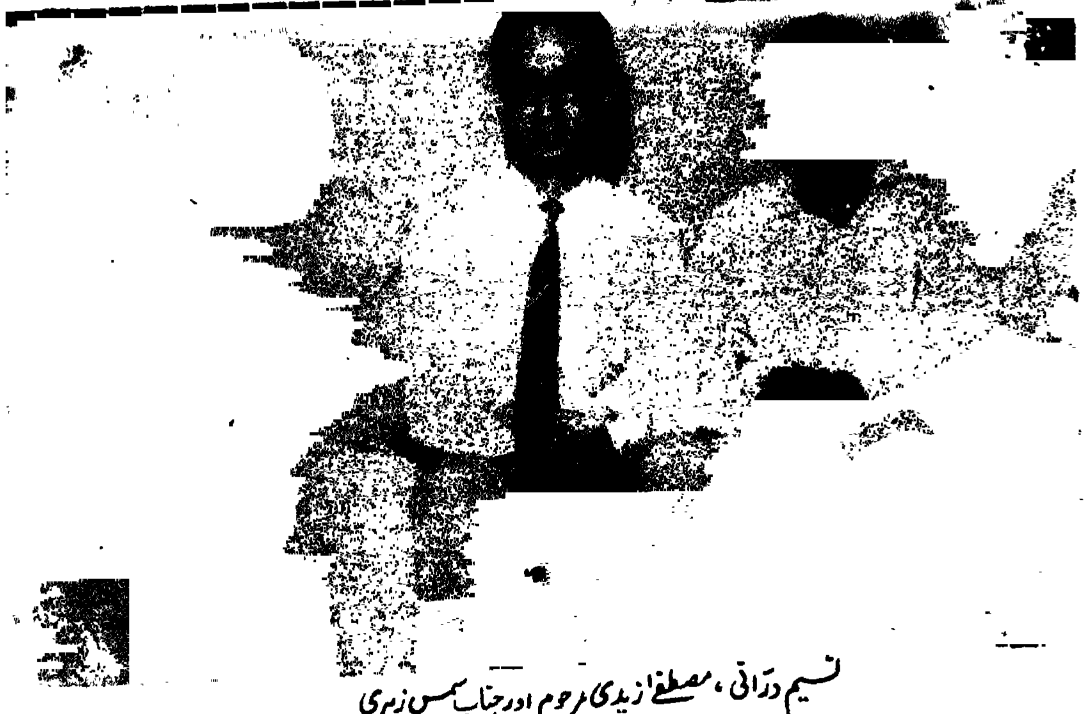


"بحیثیت انسان میں نے انھیں بڑا پیارا آدمی پایا، وہ بڑی گرم جوشی سے ملتے تھے، اگر چار پانچ آدمیوں میں سے ادیب اور دوست کی حیثیت سے مجھے انتخاب کرنے کو کہا جائے تو میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا انتخاب کروں گا۔"

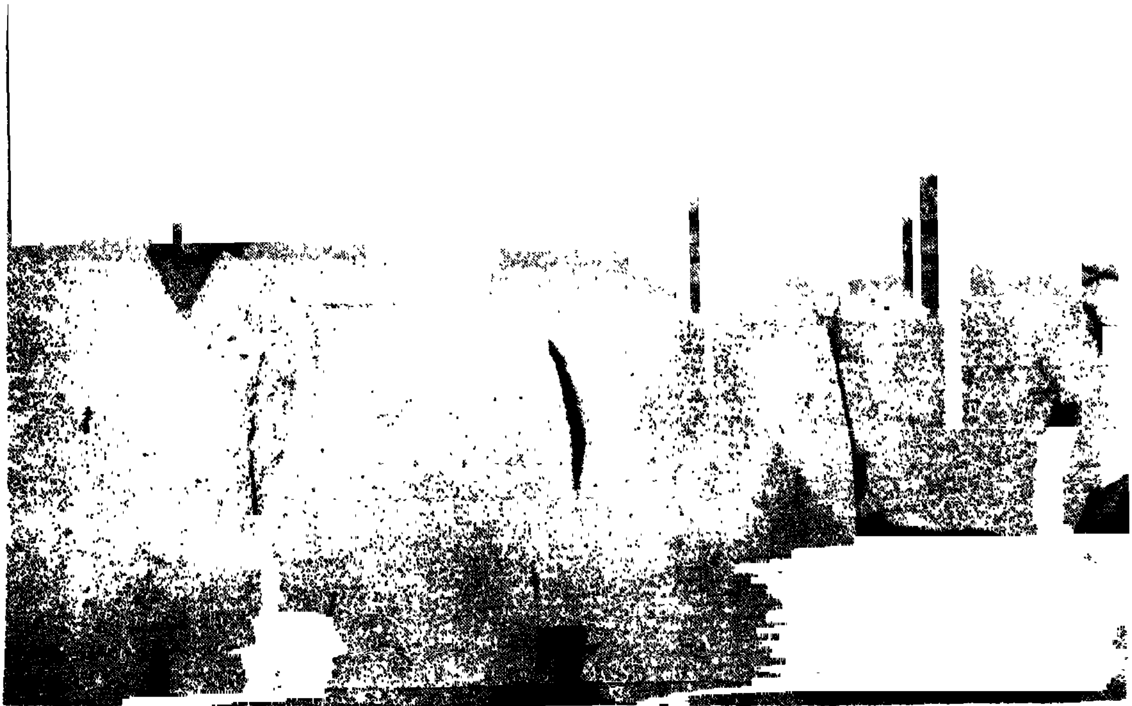
——— ڈاکٹر محمد احسن فاروقی مرحوم کی دوسری برسی پر جناب سلیم احمد کی تقریر کا اقتباس ———



سیپ کی چوتھی سالگرہ کی تقریب کی ایک یادگار تصویر: دائیں [illegible]ممتاز حسن مرحوم "سیپ" کے ناولٹ نمبر کی
رونمائی کر رہے ہیں، بائیں طرف جناب شمس زبیری



نسیم درانی، مصطفیٰ زیدی مرحوم اور جناب شمس زبیری



جناب عبیداللہ علیم، جناب شاذ تمکنت، جناب اختر الایمان اور نسیم درانی



دائیں سے بائیں: جناب شاذ تمکنت، جناب حمایت علی شاعر، جناب مشرف احمد، جناب اختر الایمان
جناب خالد شمس الحسن، جناب سلیم صدیقی، نسیم درانی، جناب جمیل الدین عالی اور جناب شان الحق حقی



نسیم درانی، جناب کیفی اعظمی اور جناب عبیداللہ علیم



ایک یادگار تصویر: جناب امید فاضلی اور جناب سلیم احمد

افسانے

سیٹرڈے نائٹ فیور

خواجہ احمد عباس

یہ "بخار" امریکہ سے آیا تھا۔

ایک متعدی مرض کی طرح سے ـــــ گویا ایشین فلو کے جواب میں ـــــ یہ بخار بڑی تیزی سے ہندوستان بھر میں پھیل گیا تھا۔ مگر سب سے خطرناک حالت بمبئی کی تھی۔

سینا کو بھی یہ بیماری لگ گئی تھی۔ پہلے دن جب جان ٹریولٹا کی فلم "سیٹرڈے نائٹ فیور" اس نے دیکھی تھی اسی دن اس کو اس "بخار" نے آدبوچا تھا۔ نہ صرف وہ بلکہ اس کی تمام سہیلیاں اور بوائے فرینڈ اس بخار میں مبتلا ہو گئے تھے۔ جب سے آج تیسری بار سینا یہ فلم دیکھ رہی تھی، اور جیسے جیسے وقت گذر رہا تھا اس "بخار" کی تپش اور تیزی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

آج وہ تیسری بار یہ فلم دیکھنے آئی تھی۔ بغیر کسی سہیلی یا بوائے فرینڈ کو ساتھ لئے۔ بوائے فرینڈ تو اب اس کا خود جان ٹریولٹا تھا ـــــ نظروں نظروں ہی میں اس کا بس چلتا تو اس کو لپٹ جاتی۔ اس کے ساتھ بغل گیر ہو کر ڈانس کرتی۔ غرض ہر طرح سے چوبیس سالہ امریکن اسٹار کو اپنا ـــــ اور صرف اپنا بنا لیتی۔

ٹریولٹا ڈانس اسکرین پر کر رہا تھا مگر اس کے سانسوں کی تپش سینا اپنے گالوں پر محسوس کر سکتی تھی۔ جب بھی وہ ڈانس کرتے ہوئے اپنے بدن کے اگلے حصے کو حرکت دیتا تو سینا کے سارے تن بدن میں جھرجھریاں سی محسوس ہوتیں۔ سینما کے جادو سے سینا ہی نہیں بلکہ سینما میں بیٹھی ہوئی ہر لڑکی یہی محسوس کرتی تھی کہ "حملہ" اس پر اور صرف اسی پر ـــــ ہو رہا ہے۔ مگر اس وقت تو ہم سینا کی کہانی بیان کر رہے ہیں جو اس "بخار" میں مبتلا ہو گئی تھی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ "راک اینڈ رول" کے بعد ایک تصویر ہالی وڈ سے آئی تھی جس نے بمبئی کی تمام TEEN AGERS کو اس طرح پاگل بنا دیا تھا۔

سینما کے اندھیرے ماحول میں سینا نے اپنے آپ کو ٹریولٹا کی معشوقہ تصور کر لیا۔

معشوقہ یا عاشق؟ ـــــ کیوں کہ اس کو جو عشق تھا اس میں اتنی گرمی اور شدت تھی جو کسی معشوقہ کے بس کی بات نہ تھی۔ ابھی ابھی وہ ادھیڑ عمر کی عورت تھی جو ٹریولٹا کی ڈانسنگ پارٹنر تھی۔ اور جس کے ساتھ وہ اپنا پیٹ پالنے کے لئے ڈانس کرتا تھا۔ مگر دوسرے لمحے وہ ٹریولٹا کی معشوقہ بن جاتی جس کے پیچھے خوبصورت امریکن اسٹار دیوانہ ہو رہا تھا۔ موسیقی اور ترنم کی ہر تان پر، ہر جنبش پر وہ ایسا رد عمل محسوس کرتی گویا یہ سب اس کے ساتھ اسکرین پر ہو رہا ہو۔

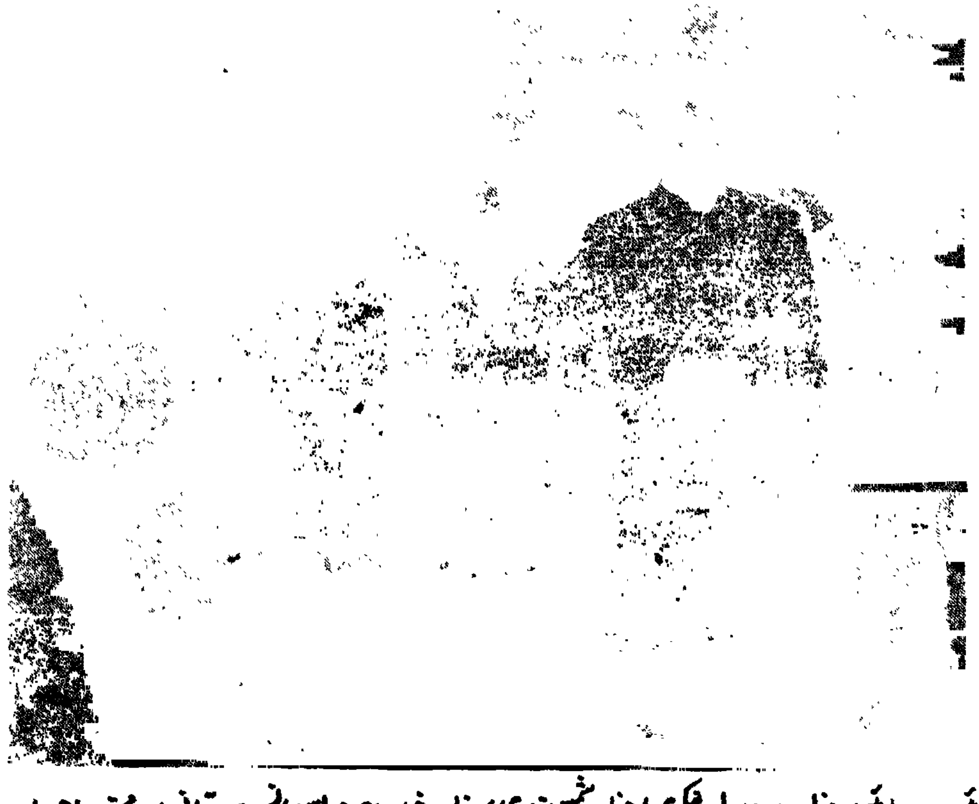
اور ٹریولٹا کی دونوں معشوقاؤں کو دیکھ کر اس کو ایک احساس برتری ہوتا۔ وہ ان دونوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ خوش پوشاک اور

خوش ادا بھی تھی۔ وہ دونوں تو میک اپ بھی کئے ہوئے نہیں تھیں۔ اس کے سامنے شہتیاں لگتی تھیں۔ اس کا دھڑکتا ہوا دل تو یہی کہتا تھا "کاش ان دونوں کی جگہ میں ٹریولٹا کی باہنوں میں ہوتی!"

اس نے اسکول میں انگریزی رومانی شاعری پڑھی تھی۔ کیٹس، بائرن، شیلی۔ سب کی پوری پوری نظمیں اس کو یاد تھیں۔ مگر آج تک اس نے شاعری کو اسکرین پر نہ دیکھا تھا۔ ٹریولٹا کا بدن خود ایک نظم تھا۔ موسیقی کی لہروں پر اس کی ہر ایک جنبش بذات خود ایک شعر تھی۔

مگر یہ کیا ہو رہا تھا؟ اس نے اندھیرے میں اپنی بغیر آستینوں کے بلاؤز میں سے نکلے ہوئے گداز بازو پر ایک مردانہ کوٹ کے کھردرے پن کو ہلکے سے گزرتا ہوا محسوس کیا۔ ساتھ ہی اس ان جانے مرد کا دایاں گھٹنا سینتا کے بائیں گھٹنے کو چھو رہا تھا۔ اور اندھیرے میں وہ دیکھ تو نہ سکتی تھی مگر اس کی چھٹی حس نے اسے بتایا کہ مرد کا ہاتھ اس کی ٹانگ کی طرف آہستہ آہستہ آرہا ہے۔ وہ ان مردانہ پینتروں کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔ آخر اسے دو سال بمبئی آئے ہوئے ہوگئے تھے۔ ایسے اشارے اور کنائے اس جیسی خوبصورت اکیلی لڑکی کی طرف ضرور کئے جاتے تھے۔ اس نے اپنی سیٹ پر کھسک کر اپنے آپ کو بائیں پڑوسی سے تو الگ کر لیا۔ مگر اس کے سامنے ایک لمبا چوڑا عرب سر پر رومال باندھے بیٹھا تھا، اس لئے اسے بائیں کو نہیں تو دائیں طرف کو جھکنا ضروری تھا۔ دائیں طرف کو سرکی تو اس کا دایاں بازو ایک ہٹے کٹے پہلوانی بازو سے مس ہوا۔ یہ مرد کا بازو تو ضرور تھا مگر یہ بھی بغیر آستین کا بلاؤز نما "ٹی شرٹ" پہنے ہوا تھا۔

آج کل جدھر دیکھو ہٹے کٹے نوجوان SLEEVELESS T. [redacted] میں دکھائی دیتے تھے۔ اب اس لمس کو سینتا کو گوارا کرنا پڑا، ٹریولٹا کی خاطر۔ کیوں کہ صرف اس زاویے سے وہ اسکرین پر اپنے "معشوق" کو دیکھ سکتی تھی۔ دائیں طرف کے پڑوسی کو غلط فہمی ہوئی تو بہت "غلط" نہیں تھی۔ کیونکہ سینتا



دائیں سے بائیں جناب سرور بارہ بنکوی، جناب شمس زبیری، جناب خواجہ احمد عباس، نسیم درانی اور محترمہ ہاجرہ مسرور

نے اس صورت حالات سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ گویا اس لمس کو وہ ٹریوولٹا کا لمس سمجھ بیٹھی تھی۔

جیسے امریکن نوجوان جادوگر نے اسکرین سے اپنا ہاتھ بڑھا کر سینا کے ننگے بازو پر رکھ دیا ہو اور اب اسے دھیرے دھیرے مگر مشاقانہ طرز سے سہلا رہا ہو۔ سینا کو فلم کی موسیقی تو ازبر تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور ٹریوولٹا اس کا بازو سہلاتا رہا۔ سینا نے دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اس کے دائیں طرف کے پڑوسی میں بھی کچھ نہ کچھ ٹریوولٹا کا ہی لمس تھا۔

پکچر ختم ہونے پر جب دھیرے دھیرے روشنیاں جلنا شروع ہوئیں تو نیم اندھیرے میں سینا نے دائیں طرف سے ایک لفافہ اپنی طرف بڑھتا ہوا محسوس کیا۔ اس نے لفافہ ہاتھ میں لے لیا۔ پھر وہ دائیں طرف مڑی۔ اس مرد کا چہرہ دیکھنے کے لئے جس نے یہ لفافہ اسے دیا تھا۔ مگر وہ منہ دوسری طرف کرکے اُٹھ چکا تھا اور ایک معمولی صورت شکل کی عورت کو سہارا دے کر باہر لے جا رہا تھا۔ "ضرور اس کی بیوی ہوگی!" سینا نے سوچا۔ سو اس وقت اس نے وہ لفافہ اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا اور اپنی ساڑی کے پلّو کو (جو کندھے سے ڈھلک آیا تھا) ٹھیک کرتی ہوئی بھیڑ کے ساتھ تھیٹر کی بالکنی سے نکل آئی اور اپنی اونچی ایڑی کے سینڈلوں سے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر سے نیچے اتر آئی۔

پانچ منٹ بعد وہ ایک ٹیکسی میں تھی جو اسے بائیکلہ برج کے پاس مسز ڈی کوسٹا کے بورڈنگ ہاؤس لے جا رہی تھی۔ ٹیکسی میں اندھیرا تھا مگر پھر بھی اس سے رہا نہ گیا۔ لفافہ نکالا۔ اس کے اندر ہاتھ ڈال کر جھلملاتی ہوئی روشنیوں میں دیکھا کہ کوئی انویٹیشن کارڈ ہے۔ کوئی وزیٹنگ کارڈ نہیں ہے جس کی اسے امید تھی —— اس نے پھر لفافہ کو بیگ میں رکھ لیا اور ٹیکسی کی سیٹ پر کمر لگا کر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کرلیں۔ جان ٹریوولٹا اس کی بند آنکھوں میں سمایا ہوا تھا۔ مگر یہ ٹریوولٹا اس کے دائیں بازو کے پڑوسی کی بغیر آستینوں کی ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے جلدی جلدی اپنی لینڈ لیڈی کی فیملی کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اندر سے چٹخنی لگا کر اس نے ہینڈ بیگ میں سے وہ لفافہ نکالا۔ اوپر ٹائپ کیا ہوا تھا "مسٹر مارکو پولو۔ دی اسٹار میکر۔ اینڈ اے فرینڈ" اور پتہ ایک وارڈن روڈ کے فلیٹ کا تھا۔ اندر ایک مشہور فلم اسٹار کی طرف سے دعوت نامہ تھا۔ کل رات کو ڈنر اور کاک ٹیلز پارٹی تھی۔ سینا کی نگاہ بے اختیار کیلنڈر کی طرف گئی۔ کل ہفتہ تھا، SATURDAY۔

مارکو پولو۔ اسٹار میکر۔ یعنی اسٹار بنانے والا۔ مگر اس نام کے پروڈیوسر کا نام اس نے آج تک نہیں سنا تھا۔ حالانکہ دو برس ہو گئے تھے اسے بمبئی میں رہتے اور فلم انڈسٹری کے گلی کوچوں کی خاک چھانتے ہوئے۔ سارے فلمی میگزین ہر ہفتے اور ہر مہینے وہ پڑھتی تھی۔ مگر مارکو پولو نام کے کسی پروڈیوسر کا نام تو اس نے سنا ہی نہیں تھا۔

خیر کوئی بھی ہو۔ وہ اسٹار میکر تھا یا سمجھا جاتا تھا۔ "اینڈ اے فرینڈ" یعنی نہ صرف اسے دعوت دی گئی تھی بلکہ اس کے ساتھ ایک "فرینڈ" کو بھی، اور وہ "فرینڈ" وہ تھی، سینا تھی۔ اس کے خواب و خیال میں بھی یہ نہیں آیا تھا کہ ایک دن اتنے بڑے اسٹار کی برتھ ڈے پارٹی میں وہ شریک ہوسکے گی۔ کتنے دنوں بعد اس کے ارمانوں اور آرزوئیں حقیقت بننے والی تھیں۔

پچھلے دو سال ہوئے وہ پنجاب سے گھر سے بھاگ کر بمبئی آئی۔ خوبصورت تھی۔ خوش پوشاک تھی۔ اس لئے امید تھی کہ ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔ فوراً اسٹار بن جائے گی۔ مگر بمبئی آکر اسے معلوم ہوا کہ فوٹوگرافروں کی مدد کے بغیر فلم انڈسٹری سے تعارف ہی نہیں ہو سکتا۔ اس نے فلم انڈسٹری کے بہت سے فوٹوگرافروں سے راہ و رسم پیدا کی تھی۔ انھوں نے اس کی ہر زاویے سے تصویریں لی تھیں۔ کبھی پنجابی شلوار قمیص میں، کبھی بنگالی ساڑی میں، کبھی راجستھانی لباس میں۔ ان تصویروں کو لے کر وہ ان گنت پروڈیوسروں کے پاس گئی۔ "تصویر چھوڑ جائیے، اپنے پتے کے ساتھ، جب ضرورت ہوئی تو بلا لیا جائے گا۔" وہ تصویریں چھوڑ آئی تھی۔ مگر آج تک کسی نے نہیں بلایا تھا۔ پھر ایک فوٹوگرافر نے کہا "آپ کو DARING اور چونکا دینے والے لباس میں تصویریں کھنچوانی

چاہئیں۔ فلم اسٹار نہیں تو ماڈل ضرور ہو جائیں گی۔" سوبن بلاؤز کے ساڑی پہن کر فوٹو اتارا گیا، پھر صرف بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں، بعد میں بلاؤز بھی اتار دیا گیا اور پیٹی کوٹ بھی۔ مگر اتنی شرم تو تھی سنیتا میں کہ اپنے منہ کو اس نے اپنے گھنگھریالے کالے بالوں سے چھپا لیا۔ یہ تصویر ایک آرٹ میگزین میں چھپی اور اس ماڈل کی کافی مانگ ہوئی۔ کئی ماڈلنگ کے کام ملے۔ جو لباس ماڈل نے پہنے پھر وہ اسی کے ہو گئے۔ فلم پروڈیوسر بھی کچھ دن اس چکر میں رہے کہ اس ماڈل سے راہ و رسم بڑھائی جائے۔ مگر وہ اسے اپنے بیڈ روم کی زینت بنانا چاہتے تھے، یا کوئی چھوٹا موٹا رول دینے کو تیار تھے، اور وہ فلم اسٹار بننے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اس لئے بات آگے نہ بڑھی۔

اب ماڈلنگ ہی کو سنیتا نے اپنا پیشہ بنا لیا۔ جب تک کہ کوئی فلم پروڈیوسر اس کو ہیروئن بنانے کو تیار نہ ہو۔ کس کی ہمت تھی کہ آج کل جب ملٹی اسٹارز پکچرز کا زمانہ ہے ایک نئی لڑکی پر لاکھوں روپے کی پکچر کا جُوا کھیلے۔

اب یہ انویٹیشن کارڈ آسمان سے اس کی گود میں گرا تھا۔ وہ بھی ایک "اسٹار میکر" کے ساتھ جو ایک کامیاب پروڈیوسر ہی ہو سکتا ہے۔ اور کون ہو سکتا ہے "اسٹار میکر"؟ سنیتا کی یہی تو ایک آرزو تھی کہ ایک بار میں پروڈیوسروں اور اسٹاروں کی ایک محفل میں گھس جاؤں۔ پھر دیکھتی ہوں کیسے مجھے نظرانداز کرتے ہیں! اور اب یہ موقع قسمت نے ـــــ یا جان ٹریولٹا نے اس کو دیدیا تھا۔ کل رات کو وہ اپنا سب سے چونکا دینے والا ڈریس پہنے گی۔ جس کو دیکھ کر ہی سب عورتیں جل مریں گی اور سب مرد اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے ـــــ (یہ سب ڈریس اس کی "ماڈلنگ" کی آمدنی تھی) وہ سینٹ بھی ایسا متوالا اور خوشبودار لگائے گی جو اس کے قریب سے ہر گذرنے والے پر اپنا جادو کر دے گا۔

مارکو پولو (اگر یہ اس کا اصل نام تھا۔ نہ جانے کیوں سنیتا کو اس میں شک تھا) اسٹار کے دروازے کے قریب ہی کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا تاکہ سنیتا کو اندر جانے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اس وقت وہ ٹریولٹا ہی کے اسٹائل میں سفید سوٹ پہنے تھا۔ اس چست اور اسمارٹ لباس میں اس کی عمر کا اندازہ لگانا تو مشکل تھا، لیکن (سنیتا نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ) چالیس برس کا تو ضرور ہو گا۔ بال اس کے ٹریولٹا ہی کی طرز میں بنے ہوئے تھے۔ سنیتا کو اتنا جاذب نظر لباس پہنے اور بالوں کی بناوٹ کو دیکھ کر وہ بول اٹھا "ڈارلنگ تم تو "الاگرینڈ" دکھ رہی ہو! شعلہ لگتی ہو شعلہ!" کیونکہ سنیتا واقعی ایک سیلا بیکسی ڈریس پہنے ہوئے تھی جس میں سے اس کا بدن بڑے دلکش ڈھنگ سے جھلکتا تھا (سنیتا کو اندازہ ہوا کہ اس کی انگریزی بس فلمی پارٹی کی ضروریات کے قابل ہی تھی) وہ سنیتا کی کمر میں اپنا ہاتھ ڈال کر اسے اندر لے چلا اور راستے میں اس پر اپنا رعب اور اپنے اثر کا اظہار کرنے کے لئے جتنے مشہور اسٹار ملتے گئے ان سے بے تکلفانہ انداز میں علیک سلیک کرتا رہا۔

"ہائی دھرم!" سنیتا نے دیکھا کہ یہ سچ مچ دھرمیندر ہی تھا۔

"ہائی۔ مارکو!" دھرمیندر نے ایک چھلتی ہوئی نظر مارکو کے پہلو میں جو لڑکی تھی اس کی طرف ڈالی اور پھر ہیما مالنی کی طرف مخاطب ہو گیا۔

"ہائی۔ ڈارلنگ!" یہ پروین بابی تھی۔ ایک سفید لباس میں۔

"ہائی۔ مارکو۔ ہمیں اپنے دوست سے نہ ملاؤ گے؟" پروین بابی نے کہا۔

مگر اس وقت وہ آگے بڑھ چکے تھے۔

"ہائی۔ امیت!" اب تو سنیتا کے چھکے اڑ گئے۔ کیونکہ سامنے والا آدمی واقعی امیتابھ بچن ہی تھا۔ جس پر وہ مدت سے فدا تھی۔ جب تک ٹریولٹا کو اس نے اسکرین پر نہیں دیکھا تھا۔

"ہائی مارکو۔ کل آجاؤں تمھارے ہاں اگر تمھیں وقت ہو تو؟"

"تمھارے لئے وقت ہی وقت ہے یار، آجاؤ جب جی چاہے۔"

... سر چکرا رہا تھا۔ اتنے مشہور فلمی چہرے اتنے قریب سے تو اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔

"ہیلو ۔ ... صاحب!"

"ہیلو ۔ ... جی"

سنیتا نے محسوس کیا کہ ان دو کی مارکو پولو بھی عزت کرتا ہے اور ان سے بے تکلفی سے "ہائی" نہیں کرتا جیسے اوروں سے۔ یہ بھی کسی زمانے میں سنیتا کے پسندیدہ رہ چکے تھے، جن کی تصویریں اس نے اپنے کمرے میں لگا رکھی تھیں لیکن تصویریں وقت کی دھول سے دھندلی پڑ چکی تھیں۔

"ہیلو ۔ ڈبلو!"

"ہیلو ..."

اب وہ ... کے قریب پہنچے جو باغ ہی میں تین چار میزوں پر سفید چادریں بچھا کر لگا ہوا تھا۔ ہر قسم کی شراب وہاں موجود تھی۔ وہسکی، برانڈی، جن، رم، ووڈکا، بیئر، اور ان سب کے مختلف "کاک ٹیل" جو چاندی کے "شیکرز" میں ملائے اور ہلائے جا رہے تھے۔ بار کے قریب ہی ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی جس کو اکثر ٹی وی پر سنیتا نے دیکھا تھا۔

"ہیلو ۔ مارکو!" جوہر نے جو ایک نیلے بلیزر میں ملبوس تھا ایک وہسکی کا پیگ لے کر بڑی گرمجوشی سے کہا۔ مگر اس کی نگاہیں سنیتا کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں "تمہاری یہ دوست میری اگلی ٹی وی فلم میں کام کرنا پسند کریں گی؟"

"کیوں نہیں کریں گی؟ آپ کی نگاہ تو جوہر کی بھی ہے اور جوہری کی بھی! مگر آج رات کو نہیں۔ پھر کسی دن، پھر کسی روز!"

یہ کہہ کر مارکو نے جوہر کو ایک آنکھ ماری جس کے جواب میں جوہر نے بھی ایک آنکھ بند کر کے مارکو کو جواب دیا۔

جب جوہر اپنی وہسکی کا گلاس لے کر وہاں سے نکل گیا تب مارکو بارمین کی طرف متوجہ ہوا "لاؤ یار ہمیں تو دو پٹیالہ پیگ ڈال دو۔ ہمارے گلاسوں میں سوڈا کم اور برف زیادہ ہو!"

"نہیں مارکو صاحب۔ میں تو بہت ہی کم پیتی ہوں!"

مگر مارکو نے اپنی مے نوشی کا فلسفہ اسے سمجھایا "بجائے بار بار "بار" پر آنے کے ایک بار ہی میں تو پٹیالہ پیگ ڈلوا لیتا ہوں۔ پھر گھنٹہ بھر کی چھٹی! تم آہستہ آہستہ پیو ڈارلنگ۔ کوئی جلدی نہیں ہے!" سنیتا کے ہاتھ میں گلاس تھما کر اس نے خود ایک بڑا گھونٹ اپنے گلے میں انڈیلا اور اسے پھر کچھ یاد آیا۔

"چیرز!" اس نے اپنے گلاس کو سنیتا کے گلاس سے ٹکراتے ہوئے کہا۔

سنیتا کو یہ فکر تھی کہ کہیں مارکو اسے "ہائی" سوسائٹی میں ایک اناڑی نہ سمجھے۔ اس لئے اس نے بھی اتنا ہی بڑا گھونٹ لیا جتنا مارکو نے لیا تھا ایک آتشیں دو دھاری چاقو اس کے حلق کو چیرتا ہوا اس کے پیٹ تک چلا گیا۔

مگر اس نے ایر ہوسٹس والی مسکراہٹ بدستور اپنے چہرے پر جمائے رکھی۔ کیوں کہ "اسٹار" بننے کے لئے وہ سمجھتی تھی یہ ضروری ہے۔

"بار" سے واپس آتے وقت ان کو راستہ میں ایک موٹا اور بدہیئت ۔ پروڈیوسر مل گیا۔ جس کو سنیتا نے پہچان لیا کہ وہ بمبئی آنے کے بعد ہی ایک بار اس کے دفتر میں گئی تھی اور باوجود اس کے کہ وہ خود ایک چھوٹا موٹا غیر معروف پروڈیوسر ہی تھا، اس نے بڑے روکھے پن سے سنیتا کی طرف ایک دفعہ دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا کیوں کہ وہ اس وقت معمولی چھینٹ کی شلوار پہنے ہوئے تھی اس زمانے میں اس کے بال بھی سیدھے سادے تھے۔ "تم کو ... بڑا رول تو دے نہیں سکتے!" پروڈیوسر نے اس وقت فیصلہ سنایا تھا "مگر ایکسٹرا رول کے لئے اپنا پتہ اور فوٹوگراف ہمارے



بائیں سے دائیں: جناب خواجہ احمد عباس، محترمہ ہاجرہ مسرور، محترمہ صالحہ عابد حسین، اور نسیم درّانی

پروڈکشن کنٹرولر کے پاس چھوڑ جاؤ۔ جب ضرورت ہوئی تو بلالیں گے۔" دو برس گذرنے کو آئے تھے مگر اس کمپنی سے اس کو اب تک کوئی بلاوا نہیں آیا تھا!___ مگر آج کی رات جب اس نے ایک شعلہ جوالہ کو مارکو کے پہلو میں دیکھا تو پہچانے بغیر چکر کھا گیا۔ وہ ابھی سے نشہ میں تھا مگر اس حالت میں بھی اسے سنیتا کی شکل کچھ جانی بوجھی لگی۔ وہ سوچنے لگا یا تو یہ وہ کال گرل تھی جو اس نے اپنے دہلی کے ڈسٹری بیوٹر دوستوں کی خاطر ایک ہوٹل میں منگوائی تھی؟___ یا پھر کوئی ماڈل تھی جسے اس نے کسی رسالے یا ٹی وی کے اشتہار میں دیکھا تھا؟ اس نے لڑکھڑاتے ہوئے مارکو کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

"مارکو صاحب، ایسا لگتا ہے تمھاری فرینڈ کو کہیں پہلے ہم نے ضرور دیکھا ہے؟"

"نہیں جناب۔" سنیتا نے فوراً جواب دیا "آپ کو میں نے تو اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے پہچان کے حلقے ذرا مختلف ہیں!"

موٹا پروڈیوسر جو ایک ڈھیلا گھٹیا کپڑے کا سوٹ پہنے ہوئے تھا یہ سن کر پنکچر ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کسی نے سُوا گھسا کر اس کی پھونک نکال دی ہے۔ سنیتا نے اس کو چڑانے کے لئے اپنی وہسکی کے گلاس میں سے ایک اور گھونٹ پیا۔ اس دفعہ ایسا لگا کہ جا تو جو اس کے حلق کے نیچے اترا وہ گرما گرم مکھن کا بنا ہوا تھا۔ سنیتا نے مارکو کا ہاتھ زور سے تھام لیا اور اس بے ہنگم پروڈیوسر پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتی ہوئی وہاں سے گذر گئی۔

"اچھا جواب دیا اس سالے کو" مارکو نے اسے شاباش دی "مجھے یہ حرامزادہ پسند ہی نہیں ہے۔ اوروں کے معاملے میں ہمیشہ ٹانگ اٹھاتا رہتا ہے۔ ساری باتیں تم پر رعب ڈالنے کے لئے کر رہا تھا۔ میرا بل تو دو مہینے سے نہیں دیا ہے۔"

"میرا بل" سنیتا نے سوچا۔ مارکو کیا کام کرتا ہے اور کس چیز کا بل بناتا ہے؟ اس کا تو خیال تھا کہ وہ خود ایک پروڈیوسر ہے۔ ورنہ اسے "اسٹار میکر" کیوں کہتے؟

مگر وہ زیادہ دیر اس مسئلہ پر نہ سوچ سکی۔ کیونکہ اسی وقت "سیٹر ڈے نائٹ فیور" کے سنگیت کا کیسٹ لاؤڈ اسپیکر پر لگادیا گیا۔ لوگوں نے ناچنا شروع کر دیا۔ ٹینس کورٹ کو عارضی طور سے ڈانس فلور بنادیا گیا تھا اور اس کے چاروں طرف درختوں میں "سائیکی ڈالک" روشنیاں لگی ہوئی تھیں۔ کبھی جلتی تھیں کبھی بجھتی تھیں۔ کبھی لال رنگ پھینکتی تھیں، کبھی ہرا، کبھی نیلا۔

"کیوں ڈانس کروگی؟" مارکو نے پوچھا۔

"ضرور" سنیتا نے جواب دیا۔

وہ ڈانس کرنے ٹینس کورٹ پر پہنچے تو کوئی بیس پچیس جوڑے پہلے سے وہاں موجود تھے۔ مگر روشنی اتنی کم تھی اور اتنی جلدی جلدی رنگ بدلتی تھی کہ کون کس کے ساتھ ڈانس کر رہا ہے اس کے بارے میں کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

مارکو کے علاوہ تین نوجوان اسٹار ٹریوولٹا جیسے سفید رنگ کے سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ سنیتا نے مارکو کے ساتھ ڈانس کرنا شروع کیا۔ وہ بُرا ڈانسر نہیں تھا۔ مگر چار ٹریوولٹا جو ڈانس کر رہے تھے ان میں ایک (جس کے نام اور شکل سے سنیتا واقف نہیں تھی) اس کے انداز میں سب سے زیادہ ٹریوولٹا پن تھا۔ نوجوان تھا۔ صورت شکل بھی اچھی تھی۔ سنیتا آپ سے آپ اس کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ جس قسم کی ڈسکو ڈانسنگ ہو رہی تھی اس میں اکثر پارٹنر تو بدل ہی جاتے ہیں اور کوئی اس کی پرواہ نہیں کرتا، نہ کوئی اعتراض کرتا ہے۔

روشنیاں جلتی اور بجھتی رہیں۔ کبھی لال ہو جاتیں، کبھی نیلی۔ اور برابر آنکھ مارتی رہتیں۔

نیا نوجوان لڑکا جو سنیتا کے ساتھ اب ڈانس کر رہا تھا، وہ ان کی جوڑی ڈانس میں سب سے خوب صورت اور ڈانس کی ماہر سمجھی گئی، دونوں کی حرکتوں میں ایک آہنگ پیدا ہو گیا تھا جو ٹریوولٹا اور اس کی پارٹنر کے ساتھ ہوتا تھا۔

بٹیالہ پیگ نے سنیتا کے سر کو چکرا دیا تھا مگر ساتھ میں اس کو مزا بھی آرہا تھا۔ گویا وہ اپنا تماشا آپ ہی باہر سے دیکھ رہی ہو! اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ ایک بیلے ڈانس ہو جس میں ٹریوولٹا ہیرو ہو اور وہ ہیروئن۔ وہ اس نقلی ٹریوولٹا کا نام تو نہ جانتی تھی لیکن اس کا اندازہ ضرور تھا کہ وہ خوش شکل اور خوش مذاق تھا۔ اگرچہ کئی وقت کا بھوکا لگ رہا تھا۔

جب سنگیت کی دھن دھیمی پڑ گئی تو دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر آہستہ آہستہ ڈانس کر رہے تھے۔ "ٹریوولٹا" نے سنیتا سے کہا، "تم ڈانس تو بہت اچھا کرتی ہو۔ مگر اس سے پہلے تمھیں کہیں دیکھا نہیں۔ نام کیا ہے تمھارا؟"

"پریما پریم چند" سنیتا نے جواب دیا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ جب وہ اسٹار بن جائے گی تو یہی نام رکھے گی۔ اب اس کی باری تھی سوال کرنے کی "تم خود بہت اچھے ڈانسر ہو۔ کیا نام ہے تمھارا؟ کیا تم ان سب ستاروں کو جانتے ہو؟"

اب ڈانس کی لے اور جھٹکے دار ہو گئی تھی۔

اس لئے سنیتا کے سوالوں کے جواب بھی جھٹکے دار ہی تھے۔

"تھینک یو" لڑکے نے جواب دیا۔ آگے کی طرف جھٹکے کے ساتھ بڑھتے ہوئے۔ یہ تو اس کی تعریف (جو سنیتا نے کی تھی) اس کے لئے تھی۔

"میرا نام ہے" اس نے پیچھے کی طرف ہٹتے ہوئے کہا۔ جب کہ سنیتا اس کی طرف ڈانس کرتے ہوئے بڑھ رہی تھی "ٹونی ٹریوولٹا!"

"اتفاق کی بات ہے۔" اس نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے سنیتا کے مونڈھے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے اس کے کان میں کہا "دراصل میں بھی فلم اسٹار بننے کی کوشش میں لگا ہوں۔ یہاں میں بھی بغیر دعوت نامے کے گھس آیا ہوں۔"

"میں بھی" سینتا نے سوچا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کو میرے بارے میں معلوم ہے؟

"میں ڈانس جانتا ہوں۔ اس لئے کیبرے سینٹر میں لے لیا جاتا ہوں" ٹونی نے اپنی بات جاری رکھی اور پھر سینتا کے کان میں کہا "تم اگر میری پارٹنر بن جاؤ تو ہم دونوں کی جوڑی اچھی رہے گی۔ دونوں ساتھ ڈانس کیا کریں گے۔ کیوں؟"

سینتا کو ایسا لگا گویا اسے کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا ہو۔ وہ سمجھ گئی کہ ٹونی کوئی چھوٹا موٹا اسٹار تو ہوگا ہی۔ یہ جان کر وہ بغیر دعوت نامے کے سفید سوٹ پہن کر یہاں گھس آیا ہے، اس کو تعجب بھی ہوا اور کراہیت بھی آئی۔ اس ایکسٹرا کے ساتھ وہ اتنی دیر تک وہاں ڈانس کر سکتی تھی! ایک لمحے تو اس کو خیال آیا کہ میزبان اسٹار سے جا کر کہہ دے کہ ٹونی بن بلایا مہمان ہے! پھر اس نے سوچا کہ وہ بھی تو ایک طرح سے بن بلائی مہمان ہی ہے۔ اگر اس سے کسی نے پوچھ لیا کہ اس کو کس نے بلایا تھا؟ — صرف مارکو کی ایک گرل فرینڈ کے طور پر ہی تو وہ وہاں تھی، ورنہ اس کا تعارف بھی میزبان اسٹار سے مارکو نے کرانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

"جیسے ہی اسے مارکو کا خیال آیا وہ اسے نظر آ گیا۔ وہ ایک موٹی تازی ایکٹریس کے ساتھ ٹینگو ڈانس کر رہا تھا۔ سینتا نے ٹونی کا ساتھ چھوڑا اور بڑی بے حیائی کے ساتھ سیدھی مارکو کی طرف چلی۔

"ہیلو سینتا جی! ادھر آؤ جی!" مارکو نے اسے آواز دی۔ اس نے کوئی شکایت نہیں کی لیکن اس کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے سینتا کا کسی اور کے ساتھ ڈانس کرنا اچھا نہ لگا تھا۔ گویا وہ اس کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتا تھا۔ کم از کم اس شام کے لئے —! "کہاں رہیں ڈارلنگ؟" اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"یہیں تو تھی — پتہ نہیں کس کس کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی۔"

"ڈیو، جینٹو، معشوق، جگر وغیرہ۔" جتنے لوگ وہاں تھے ان میں سب سے اچھے ڈانسرز جو تھے ان کے نام سینتا نے لے ڈالے۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ ٹونی ان سب سے اچھا ڈانس کرتا تھا۔ مارکو کا ہاتھ پکڑ کر اس نے کہا "تم کہاں چلے گئے تھے، مجھے نظر ہی نہیں آئے۔ اتنے بہت سفید سوٹ ہیں کہ پہچاننا مشکل ہے۔"

"اری سویو۔ ادھر تو دیکھو۔" مارکو نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک گلاس وہسکی کا سنبھالے وہ ڈانس کر رہا تھا "میں نے تو یہ اس لئے رکھ لیا تھا کہ تم دور سے مجھے پہچان لو۔"

"اوہ مارکو — تم کتنے عقلمند ہو اور کتنے سوئٹ!" سینتا نے اس کے سر سے وہسکی کا گلاس لے کر ایک گھونٹ خود بھی پیا اور پھر باقی مارکو کو ختم کرنے کو دیا۔

مارکو نے ایک گھونٹ لے کر کہا "تم نے تو اپنے ہونٹوں سے اس وہسکی کو شربت گلبرگ بنا دیا ہے۔"

سینتا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ پسندیدگی کا اظہار تھا یا ناپسندیدگی کا!

"کوئی پرواہ نہیں" اگلے لمحے مارکو نے کہا، "چلو یہاں سے نکل چلیں۔ ایک بجنے والا ہی ہے۔ میوزک بھی اب بند ہو گیا ہے۔"

میوزک بند ہونے سے پانچ سو مہمانوں کی بات چیت کا شور سنائی دیا۔

میوزک بند ہوا تھا۔ مہمانوں کی توجہ ڈائننگ ٹیبلز کی طرف مبذول کرانے کے لئے، جہاں انواع و اقسام کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ کئی قسم کی مچھلی، بھنی ہوئی، کری میں پڑی ہوئی، چار پانچ قسم کے مرغ، تندوری مرغ مسلم، مسالہ چکن، چینی کھانے، ویجیٹیرینز کے لئے الگ میزیں۔

سینتا کو بھوک لگی ہوئی تھی اور اس کی نگاہیں ڈائننگ ٹیبلز پر لگی ہوئی تھیں جہاں اب آہستہ آہستہ بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔

سیپ کراچی

"کہیں اور چلتے ہیں، جہاں ہم خاموشی کے ساتھ بات کر سکیں اور تمھارا جو جی چاہے وہ کھا بھی سکتی ہو۔"
وہ اس کو کمرے سہارا دے کر بھیڑ بھاڑ میں سے باہر نکال لایا۔
باہر اس کی لال گاڑی کھڑی ہوئی تھی جسے چلانے والا ایک ڈرائیور بھی تھا۔ ڈرائیور نے انھیں سلام کیا۔ پیچھے کا دروازہ کھولا اور دونوں کے اندر بیٹھتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ سنیتا اور مارکو دونوں پچھلی سیٹ میں دھنس گئے۔
موٹر چلی اور جوہو بیچ کے کنارے ہوٹل ریلز میں آکر رکی جو اسٹار کے گھر سے دور نہیں تھا۔ ریشپسنٹ مارکو کو پہچانتا تھا۔ فوراً اس کے کمرے کی چابی اسے سلام کر کے دیدی۔
لفٹ میں گھس کر جب وہ اوپر چلا تو سنیتا نے پوچھا "آپ اس ہوٹل میں رہتے ہیں؟"
"نہیں۔ یہاں تو کبھی کبھی کام سے آتا ہوں۔ جب مجھے کسی اسٹار کے چہرے کا خاص مطالعہ کرنا ہوتا ہے، یا کسی خاص پروڈیوسر سے کچھ پرائیویٹ بات کرنی ہوتی ہے۔"
دروازہ کھول کر وہ ایک شاندار سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ جس کی سب دیواروں پر فریموں میں لگے ہوئے اسٹار انھیں گھور رہے تھے۔ ہر ایک فوٹو کے ساتھ آٹو گراف تھا۔ کسی پر لکھا تھا "اسٹار میکر کو ہدیہ محبت"۔ کسی پر "آپ کا چاہنے والا" یا "آپ کی چاہنے والی" وغیرہ وغیرہ۔
"کیا آپ نے ان سب اسٹاروں کو بنایا ہے؟" سنیتا نے پوچھا۔
"میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا۔ ہر ایک کی شخصیت اور اس کی قسمت اس کے ساتھ آئی ہے اور اسے یہاں تک لائی ہے! میں تو صرف ان کی شخصیت کو روشنی میں لانے کا ذمہ دار ہوں تاکہ ان کی اسٹار پرسنیلٹی ابھر کر آگے آجائے۔"
سنیتا کچھ سمجھی اور کچھ نہ سمجھی ——— زیادہ سوال کرنا اس نے مناسب نہ سمجھا۔
سو اس نے فقط کہا "مارکو!"
"جانتی ہو یہ میرا اصلی نام نہیں ہے۔ فلمی دنیا میں سب مجھے مارکو پولو کہتے ہیں!"
"مگر کیوں؟ یہ نام تمھارا کیسے رکھا گیا؟"
"کہتے ہیں کہ ایک مارکو پولو نے کبھی نئے ملک اور برّاعظم اور جزیرے دریافت کئے تھے۔ میں نئے ستاروں کو دریافت کرتا ہوں کبھی کبھی ان کو ایجاد بھی کرتا ہوں۔"
دروازے کی گھنٹی بجی اور ایک ویٹر ایک پوری ڈائننگ ٹیبل کو (جس میں ربر کے پہیے لگے ہوئے تھے) دھکیلتا ہوا اندر لایا۔ ایک بوتل شامپین کی اس پر رکھی تھی۔ ڈھکنے ہٹانے پر قابوں میں چکن سلاڈ، تلی ہوئی مچھلی اور چکن سینڈوچز نکلیں۔
"جب کبھی کسی فلم اسٹار کے ہاں پارٹی ہوتی ہے تو میں پینا وہاں پسند کرتا ہوں اور کھانا اپنی مرضی کے مطابق یہاں!" دس روپے کا ایک نوٹ "ٹپ" پاکر ویٹر چلا گیا۔
دوسرے شامپین کے گلاس کے بعد سنیتا نے مارکو سے جھجکتے ہوئے یہ کہنے کی جرأت کی "آپ نے تو نہ جانے کتنے اسٹار بنائے ہیں! کیا آپ کے خیال میں، میں بھی یہ سپنا دیکھ سکتی ہوں؟"
مارکو نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے سنیتا کی طرف دیکھا۔ پھر لیمپ کی روشنی مختلف زاویوں سے اس کے چہرے پر ڈالی۔ پھر

اس نے نرم نرم انگلیوں سے اس کے بالوں کو مختلف طریقوں سے سنوارا۔ تب جا کر اس نے کہا "ہاں میرے خیال میں تم یہ سپنا دیکھ سکتی ہو بلکہ کامیابی کی امید رکھ سکتی ہو۔ تمھاری شخصیت میں وہ سب کچھ ہے جو ایک اسٹار میں ہونا چاہیئے۔ بس کسر ایک بات کی ہی ہے۔ تمھارے بالوں کو سادھنا کی طرح ماتھے پر سے کاٹ کر ایک فرنچ بنا دیا جائے۔"

سنیتا نے اس شام "دو پٹیالہ پیگ" وہسکی کے پئے تھے۔ اس کے بعد تیسرا گلاس شامپین کا پی رہی تھی مگر سب سے نشہ آور مارکو کا یہ کہنا تھا۔ اس کا سر (بلکہ دماغ بھی) گھوم رہا تھا۔ لیمپ کی روشنی آؤٹ آف فوکس ہوئے جا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے ایک سینڈوچ منہ میں ڈال کر میز کا سہارا لیا۔

اس نے مارکو کو غور سے دیکھا۔ اس وقت اس روشنی میں ——— وہ اس کو پریوں کی دنیا کا ایک شہزادہ لگا جو سنڈریلا کو اپنی بلوری گاڑی میں بٹھا کر پرستان کے محل میں لے گیا تھا۔

پیار اور گرم جوشی کی ایک لہر آئی اور وہ اس میں ڈوب گئی۔ اس کی طرف جا کر سنیتا نے مارکو کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں اور بڑے پیار سے اس کے گال کا ایک بوسہ لے لیا۔ اس کے گالوں سے، شیو کرنے کے بعد جو خوشبو لگاتے ہیں، اس کی مہک آئی۔

بتی بجھانے کا سوئچ دبا دیا گیا۔

بجلی کی روشنی کے بجائے باہر سے چاندنی کمرے میں بکھر گئی۔

پھر سنڈریلا نے محسوس کیا کہ پریوں کے دیش کے شہزادے نے اسے گود میں اٹھا لیا اور اپنی بلوری بگھی کی طرف لے چلا۔

چاندنی کے بجائے دھوپ نکل آئی تھی جب سنیتا نے کروٹ لے کر آنکھیں کھولیں۔

اس نے اپنی کلائی کی گھڑی کے ڈائل کی طرف دیکھا ——— دس بج چکے تھے۔

وہ کہاں تھی؟ کیا جو کچھ رات کو اس نے تجربہ کیا تھا وہ سب "سیٹرڈے نائٹ فیور" کا بخار ہی تھا۔

کیا اس کا خیالی تصور تھا اور کیا حقیقت تھی۔

وہ ایک ہوٹل کے بیڈ روم میں ایک ڈبل بیڈ پر پڑی تھی۔ لیکن اس وقت بھی وہ وہی شعلے کے رنگ کا بیلا اسکیی پہنے ہوئے تھی۔ اس کا ڈریس ویسا کا ویسا ہی تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی!

وہ ڈبل بیڈ پر ایک طرف لیٹی ہوئی تھی۔ اور دوسرے پلنگ پر ایک استعمال کیا ہوا نیلا کمبل پڑا تھا۔ ایسا ہی ایک دوسرا کمبل اس کے اوپر پڑا تھا۔

دوسرے بیڈ کے سرہانے اسے لگا کہ ایک آدمی کھڑا ہے۔ وہی سفید سوٹ۔ ویسے ہی جان ٹراولٹا جیسے بال ——— مگر اس آدمی کے آنکھیں نہیں تھیں ——— آنکھیں مل کر دیکھا تو سوٹ ایک ہینگر پر لٹکا ہوا تھا اور ہیٹ اسٹینڈ پر ٹراولٹا جیسے نقلی بالوں کی ایک وگ دھری تھی۔

کیا ٹراولٹا کی بس یہی ایک حقیقت تھی؟ ایک تنگ پتلون کا سفید سوٹ اور ایک نقلی بالوں والی وگ۔

اگر مارکو کو ایک وگ لگانی پڑی تھی تو وہ ضرور گنجا ہوگا؟ ادھیڑ یا پھر بوڑھا؟

اب اس کو رات کی باتوں میں سے کچھ ٹکڑے یاد آئے۔

"حرام زادے نے میرے دو مہینے کا بل نہیں ادا کیا ...."

"تمہارے بالوں کو سادھنا کی طرح ماتھے پر سے کاٹ کر ایک فرنج بنادی جائے ....."
"میں نئے ستاروں کو دریافت کرتا ہوں۔ کبھی کبھی انھیں ایجاد بھی کرتا ہوں ......"
اپنی پیشانی پر اس نے مارکو کی نرم نرم انگلیوں کا لمس محسوس کیا جب وہ اس کے بالوں کو سنوار رہا تھا۔
وہ جلدی سے پلنگ پر سے اٹھی اور ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں کو کھول کر انھیں جلدی جلدی ٹٹولا۔
اور کارڈوں میں سے دو ایک کارڈ نکل آئے جن کے اوپر لکھا تھا "مارکو پولو —— ہیر اسٹائلسٹ اور وگ بنانے والے" ایک کونے میں وارڈن روڈ کا پتہ تھا۔ دوسرے کونے میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے "بیوٹی سیلون" کا پتہ تھا۔
اس نے بڑی بے صبری سے گھنٹی بجائی۔
وہی رات والا بیرا اندر آیا۔ ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ اس میں ایک لفافہ رکھا تھا۔
"پہلوان صاحب تو سویرے ہی کام پر چلے گئے ہیں۔ یہ آپ کے لئے دے گئے ہیں۔"
"کیا نام کہا تم نے ؟"
"سیتا پہلوان صاحب۔ یہ ان ہی کا تو کمرہ ہے۔"
بیرا یہ اطلاع دے کر اور چائے کی ایک پیالی رکھ کر باہر چلا گیا۔
مارکو پولو —— م۔ پ —— سیتا پہلوان —— م۔ پ۔ یہ دونوں ایک ہی آدمی تھے۔
سیتا پہلوان تو فلم انڈسٹری کا مشہور میک اپ آرٹسٹ اور ہیر اسٹائلسٹ تھا! گنجا۔ ادھیڑ۔ اسٹارز کے ساتھ اس کی تصویریں نکلی تھیں ان میں وہ تو گنجا اور ادھیڑ نظر آتا تھا۔ مگر جو اوروں کو اسٹار بنا سکتا تھا، کیا وہ اپنے لئے بھی ایک وگ نہیں بنا سکتا تھا۔
اس نے لفافہ کھولا۔ اندر سے سو سو روپے کے دو نوٹ گر پڑے۔
مارکو پولو کا ایک کارڈ بھی تھا۔ جس پر بچکانہ خط میں لکھا تھا:
"مائی ڈیر سیتا۔ خدا حافظ۔ اس وقت جانے کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ مگر تم جب چاہو میرے "بیوٹی سیلون" میں ملنے آنا —— فون کرنا یا نہ کرنا۔ میں تمہارے بالوں کو سنوار کر تمھیں ایک نئی شخصیت دیدوں گا اور ساتھ میں جتنے پروڈیوسر میرے جاننے والے ہیں ان کے نام تعارفی خط بھی۔ رات کو تمھیں کچھ نہیں ہوا۔ جیسی تم آئی تھیں ویسی ہی یہاں سے جارہی ہو۔ یہ روپے تمہارے ٹیکسی میں آنے جانے کے لئے ہیں، تمہاری قیمت نہیں۔ شکریہ۔ فقط۔
سیتا پہلوان"



تعبیر

رضیہ سجّاد ظہیر

پہاڑوں کے سفر یا قیام میں جان پہچان ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ کچھ وقت کے لئے بس یا ریل میں آپ کا پہلے ساتھ ہوتا ہے، پھر جس کسی اسٹیشن پر اترنا ہو، وہاں اسباب کی لدائی اور دھکا پیل میں بار بار ایک دوسرے کا سامنا ہوتا ہے اور پھر جب بس آہیں بھرتی ہوئی بلندی پر چڑھنے لگتی ہے تو کبھی کوئی نہ کوئی گرم کپڑا نکال کر پہنتے یا اوڑھتے ہیں۔ یہ ایک آدھ گرم کپڑے کسی چھوٹی سی اٹیچی میں دبے رکھے ہوتے ہیں جہاں آپ خود بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس گڑبڑ میں کوئی آپ سے معافی مانگتا ہوا آپ کے ہینڈ بیگ یا آپ کے پیروں کے نیچے سے اپنا جھولا یا اپنی اٹیچی کھینچتا ہے اور آپ اس کو غور سے دیکھتے ہیں اور وہ آپ کو اچھا لگتا ہے . . . . . مجھے بھی وہ لڑکا اسی طرح اچھا لگا تھا —— لمبے سے قد کا، گندمی رنگت والا لڑکا۔ جس کے گھنگریالے بال تھے۔ جسم کی بناوٹ سے کوئی کھلاڑی لگتا تھا —— پھر ہم دونوں باتیں کرنے لگے تھے۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ کچھ گنگناتی ہوئی سی۔ مگر الفاظ کی ادائیگی صاف ستھری، کپڑے، جوتے سلیقے سے پہنے تھا۔ گلے میں لٹکا کیمرہ قیمتی معلوم ہوتا تھا۔

پھر نینی تال آگیا تھا، جھیل کے کنارے بس رکی، قلیوں کا ہنگامہ مچا، جس کو دیکھئے وہ میلے سے فیتے میں بندھا، اپنے نمبر کا بلّہ آپ کے منہ میں ٹھونسے دیتا ہے! —— اوپر سے ذرا ذرا سا پانی بھی برسنے لگا تھا، پھوار پڑنے سے اور بھی ہڑبونگ مچ گئی تھی اور اسی لے دے میں وہ کسی اور طرف کو نکل گیا اور میں کسی اور طرف کو مڑ گئی۔

شاید چوتھا دن ہو گا یا تیسرا رہا ہو، یہ ٹھیک سے یاد نہیں۔ میں اوپر کہیں ٹھہری تھی۔ لہٰذا مجھے کھانے کا سامان وغیرہ خریدنے نیچے فلیٹ پر آنا پڑتا تھا۔ تو اس دن میں بازار کی ڈھلوان پر ایک دوکان کے آگے، لکڑی کے ایک ہلکے سے بکس پر جھکی ہوئی اس میں سے خوبانیاں چھانٹ رہی تھی کہ یکایک میرے کان میں ویسی آواز آئی جیسی اس لڑکے کی تھی —— یادوں میں انسان کے لئے 'آواز' اور 'خوشبو' ان دو چیزوں کی یاد بھی کتنی عجیب ہوتی ہے۔ کتنی ہی مدت کیوں نہ گزر جائے اگر وہ آواز یا خوشبو ایک پل کے لئے بھی پسندیدہ لگی ہو تو زندگی بھر اس کی یاد اور پہچان ذہن سے محو نہیں ہوتی اور جب بھی وہ، ہلکے سے ہی سہی، پاس سے گزر جائے تو انسان چونک کر دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا —— میں بھی چونکی، سر اٹھا کر دیکھا بھی مگر پھر فوراً اس طرح سر جھکا لیا جیسے میں نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو کیونکہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ گندمی سے ذرا گہرا رنگ، سیدھے مگر بہت گھنے سیاہ بال، پتلا دبلا جسم تھا۔ ایک ہاتھ میں سبز اور ایک ہاتھ میں سرخ بہت سی چوڑیاں پہنے قبول صورت!

دونوں پان نواز ہے تھے۔

میری نگاہوں نے فوراً ان دونوں کے انداز سے تاڑ لیا کہ وہ لڑکی اس لڑکے کی کون تھی —— پھر آپ ہی بتائیے کہ اگر میں نے یہ سوچ کر سر جھکا لیا کہ وہ اس کی کون تھی اور یہ سوچا کہ دو میں تیسرا ، آنکھ میں ٹھیکرا ، بننے کی آخر مجھے کیا ضرورت ہے تو میں نے کیا غلط کیا ؟ البتہ میں یہ قبولنا چاہتی ہوں کہ جب وہ دونوں روانہ ہوئے تو میں ان کے پیچھے پیچھے اس طرح چلنے لگی تھی کہ ان کو نظر تو نہ آؤں مگر ان کی گفتگو سن سکوں! بازار میں کافی بھیڑ تھی اس لئے ایسا ہو بھی سکتا تھا —— ویسے ان دونوں کو یوں بھی غالباً اپنے سوا کسی اور کی موجودگی کا احساس نہ تھا۔

لڑکے نے کہا "مگر میں نے تمھیں چار خط لکھے اور تم نے صرف دو۔ اس کا کیا مطلب ہے ؟"

"اوہو، مطلب کیا ہوتا۔ ایک دن ابا جان کے کچھ دوست آ گئے تھے ، اور امی کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو مجھ کو کھانا دانا دیکھنا پڑا اس لئے فرصت ہی نہیں ملی۔ اور ایک دن تو تمھارے لئے ہی اون خریدنے چلی گئی تھی ، اس دن گھر میں ڈاک کے ٹکٹ نہیں تھے۔ سوچا تھا کہ اون خرید



رضیہ سجاد ظہیر اور سجاد ظہیر کی ایک یادگار تصویر

کرادھر ہی ڈاک خانے سے لے لوں گی، سو اُون کے شیڈوں میں ایسی اُلجھی کہ بھول ہی گئی۔ جب گھر پہنچی تب یاد آیا ـــ اچھا خیر ـــ اور ابھی چھٹی دن تو مجھے آئے ہوئے ہوئے ہیں، اچھا، چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تمھیں چھٹی تو چار ہی روز کی ہے اور کمرہ تم نے چھ روز کے لئے بُک کر لیا۔ اگر بڑے صاحب نے کچھ کہا تو؟"

"ارے گولی مارو بڑے صاحب کو، میں کسی صاحب واحب کی پرواہ نہیں کرتا۔"

"مگر تم اتنے مہنگے ہوٹل میں اتنے دن کیسے رہو گے؟"

"میرے پاس جو کچھ ہے میں لُٹا دوں گا مگر اب کی بار تمھیں ہاں کہنا ہی پڑے گا۔ میں یہ سب کچھ نہیں سنوں گا کہ ابا جان یہ کہتے ہیں اور امی یہ کہتی ہیں ـــ سمجھیں! اچھا بتاؤ تم نے میرا انتظار کیا تھا؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ مجھے ہر وقت تمھارا انتظار رہتا تھا ـــ صرف تمھارا انتظار اور سارے وقت!"

لڑکے نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا "ثریا ـــ میرا جی چاہتا ہے آسمان پر جگمگانے والے یہ سب ننھے ننھے ستارے توڑ کر تمھارے بالوں میں ٹانک دوں جیسے چنبیلی کے پھول۔ آؤ کشتی میں چلو گی نا؟"

"نہیں بھئی۔ اب میں واپس جاؤں گی۔ رات تو ہو ہی چلی ہے اور گھر پہنچتے پہنچتے بھی آدھا گھنٹے سے تو زیادہ ہی لگے گا۔ اور دیر ہو گی تو ابا جان، بڑا ہنگامہ کریں گے۔ دیکھو سات بجنے ہی والے ہیں ـــ" اس نے گھڑی والا ہاتھ آگے بڑھایا۔ لڑکے نے گھڑی سمیت اس کی کلائی پکڑ لی اور بولا "اچھا ـــ تو اس راستے سے چلو۔"

دونوں ایک اونچائی کی طرف بڑھنے لگے جدھر اکیلا تھا۔ خاموشی اور سناٹا ـــ اور چیڑ کے پیڑوں کی آڑ تھی۔ یہاں چاندنی بھی نظر بچا کر ہی ان دونوں کو دیکھ سکتی تھی۔

میں جہاں اوپر ٹھہری تھی وہ جگہ کافی بلندی پر تھی۔ اترنے میں تو لڑھکتے چلے آنا آسان تھا مگر واپسی کی چڑھائی مزاج پوچھ لیتی تھی، پھر بھی مجھے ان دونوں کو دیکھنے کا ایسا چسکا لگا کہ میں روز کئی کئی گھنٹے ان کے انتظار میں فلیٹ پر گزارتی اور چوری چھپے ان کی باتیں سُن سُن کر ان کے متعلق کافی معلومات بھی حاصل ہو گئیں ـــ وہ دونوں کس خاندان کے ہیں، ان کے نام کیا ہیں، کب سے آپس میں محبت کرتے ہیں، کیا چاہتے ہیں، آئندہ کے لئے کیا پلان بنا رہے ہیں وغیرہ ـــ کوئی ہفتہ بھر بعد وہ لڑکا غائب ہو گیا۔ لڑکی اپنے خاندان کے ساتھ دو چار بار دکھائی دی، پھر وہ بھی ندارد ـــ بارشیں شروع ہو گئیں، میں بھی نیچے آ گئی، زندگی اپنے معمولی ڈھرّے پر چل پڑی۔ ایک دلچسپ منظر فیڈ آؤٹ ہو گیا۔

اس بات کو بیس سال سے اوپر ہوتے ہیں۔

تین چار دن ہوئے میں بھوالی سے لوٹ کر آئی ہوں۔ بھوالی ہے تو کمایوں کے ہی پہاڑوں میں سے ایک لیکن نینی تال کے مقابلے میں بہت سستا۔ چوں کہ گزشتہ اتنے سالوں میں مہنگائی نے زبردست چھلانگیں لگائی ہیں اس لئے میں نینی تال کے بجائے چند دنوں کو بھوالی گئی تھی۔ وہاں میں ایک سستے سے ہوٹل میں ٹھہری تھی ـــ سب کمروں کے آگے برآمدہ ایک ہی تھا البتہ اس لمبے برآمدے میں سے ہر کمرے کے سامنے کا ایک چھوٹا سا حصہ لکڑی کے پارٹیشن سے الگ کر دیا گیا تھا۔ بھوالی میں ٹھیٹ ہل اسٹیشن کی سی دلچسپیاں نہیں ـــ بس نیچے میدانوں کی گرمی سے آپ بچ سکتے ہیں، فطرت کی خوبصورتی کا نظارہ کر سکتے ہیں، پہاڑی پھل، خوب سستے اور اچھے خرید کر کھا سکتے ہیں۔ اس لئے وہاں رات کے نو بجے سے خاموشی طاری ہونی شروع ہو جاتی ہے اور دس بجتے بجتے تو بالکل سناٹا ہو جاتا ہے۔

پہلی رات کو میں اپنے کمرے کے آگے والی، گز دو گز لمبی چوڑی، برآمدے سے پارٹیشن کی ہوئی اگاچی میں آرام کرسی پر اطمینان سے آگے کو پیر پھیلائے بیٹھی تھی کہ یکایک جیسے تیز ہوا کے جھونکے سے ماضی کا ایک دریچہ کھل گیا ـــ میں نے آپ سے کہا تا کہ خوشبو اور آواز کی

یادوں کا احساس ایک مدّت بعد بھی یکایک جاگ اٹھتا ہے۔ ایسے لگا جیسے دور سے کسی نے کہا "معاف کیجئے گا، میں ذرا آپ کے پاؤں کے نیچے سے یہ اینچی نکالنا چاہتا ہوں، مجھے سوئٹر بننا ہے۔"

چونک کر میں نے سر گھمایا! ــــ صرف لکڑی کا پارٹیشن تھا لیکن آواز اسی کے پیچھے سے آرہی تھی ــــ وہی گنگناتی ہوئی، الفاظ کو صاف ادا کرتی ہوئی آواز! ــــ جو مدھم تو تھی مگر رات کے سناٹے میں تو سرگوشیاں بھی سنائی دے جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ کوئی عورت بھی تھی جو کہہ رہی تھی "لیکن میں نے تمھیں تین خط لکھے، تم نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔"

اس گنگناتی ہوئی دلکش آواز نے ایک ٹھنڈی سانس بھری "لیکن میں تو اس بھروسے تھا کہ اسلم آئے گا۔"

"ہاں ــــ مجھے بھی اس کا بہت انتظار تھا۔ دراصل میں تو سوچ رہی تھی کہ وہ آئے گا تو میں بھی اس کے ساتھ ہی آجاؤں گی۔ مگر جب اس نے لکھ دیا کہ آخری میچ اب ۲۰ر جون کو مسوری میں ہوگا، تب ہی تو میں نے تمھیں تار دیا کہ اب . . . ."

"اگر ہم لوگ نینی تال چل سکتے تو بڑا اچھا ہوتا۔ مگر اب میں سب کچھ تو لٹانے سے رہا۔ دسمبر میں سلیمہ کی شادی کرنی ہے۔ منّو بھی اگر پاس ہوگیا تو اسی سال سے کالج جائے گا۔"

"مگر تم تھوڑی چھٹی اور لے لیتے تو بہت اچھا رہتا، تمہاری تو ایک مہینے کی ڈیو ہے، ادھر تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔"

"ہاں ــــ وہ تو ہے مگر بڑے صاحب کی مرضی بھی تو دیکھنی ہے ثریا ــــ آخر نوکری کرنی ہے، بچوں کو پالنا ہے، پڑھانا لکھانا ہے، ان کو اپنی اپنی جگہ سیٹل کرنا ہے۔"

"ہاں" ثریا نے ٹھنڈی سانس بھری ــــ پھر ایک دو منٹ سناٹے کے بعد عورت کی آواز آئی "چلو ٹہلنے چلتے ہو؟"

"نہیں بھئی، پچھلے ہفتہ بخار آنے کے بعد سے ابھی تک میں زیادہ نہیں ٹہل سکتا ہوں، یہاں کی سڑکیں بھی بہت اکیلی ہیں ــــ اور کل تم جدھر مجھے لے گئی تھیں ادھر تو اونچائیاں بھی کافی پڑتی ہیں۔ ہر طرف دو قدم کے بعد اونچائی . . . . ."

"اچھا جانے دو . . . ." عورت نے پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور میری آنکھوں کے سامنے ایک نوجوان لڑکا گھوم گیا جو ایک نوجوان لڑکی کا ہاتھ پکڑے تھا ــــ اور دونوں ایک طرف، اونچائی کی طرف جا رہے تھے۔ جدھر کی سڑکیں بہت اکیلی تھیں، بلکہ سڑکیں کیا پگڈنڈیاں تھیں، خاموشی چھائی تھی اور ہُو کا عالم اور سناٹا تھا۔ چیڑ کے درختوں کی گھنی آڑ تھی جہاں چاندنی بھی ان کو نظر بچا کر ہی دیکھ سکتی تھی لڑکی صرف اس کا انتظار کرتی تھی اور وہ آسمان کے تارے توڑ کر اس کے بالوں میں ٹانکنے کا خواب دیکھا کرتا تھا۔



چوتھا کھونٹ

افسر آذر

اس وقت وہ چاروں سمتوں کے وسط میں طویل مسافت طے کرنے کے بعد چاروں خانے چت نڈھال پڑا تھا۔ اس کے تمام جسم کی گویا جان نکل چکی تھی۔ وہ جس مقام پر پڑا تھا وہاں سے چاروں سمتوں کے تیر چاروں طرف پھوٹتے تھے حالانکہ اس نے اپنے سفر کا آغاز ایک ہی سمت میں کیا تھا۔

سفر کی تکان اس کے روم روم میں بس گئی تھی۔ درد اور ٹیسوں کی سوئیاں ان کی نس نس میں چبھی ہوئی تھیں، مگر وہ جانتا تھا کہ یہ سب بونے، نہیں بلکہ بالشتیے، بلکہ انگشتیے ہیں۔ اور وہ خود گولیور ہے۔ اس کے جسم کا ہر جوڑ ڈھیلا ہو گیا تھا۔ آنکھیں حلقوں میں تیر رہی تھیں اور سفر کی گرد سے بار بار اس کی آنکھوں میں پانی بھر آتا تھا۔ اس کا سر زخمی تھا بعض زخموں پر کھرنڈ تھا بعض رِس رہے تھے اور بعض میں پیپ پڑ چکی تھی۔ راستے بھر کوّے، گدھ، چیلیں اور شکرے اس کے سر پر حملے کرتے رہے تھے۔ کیونکہ اس کے سر میں سودا سمایا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر لمبی لمبی خراشیں اور کھرونچیں تھیں جو خاردار جھاڑیوں سے گزرتے ہوئے اس کے جسم پر آئیں تھیں۔ اس کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے اس کے تلووں کے زخم تازہ گلال تھے۔ جن سے بہنے والے لہو نے اس خطرناک راستے پر نقشِ پا بنا دیئے تھے اور اس کے پیروں کی انگلیاں آپس میں چپک کر رہ گئیں تھیں پھر بھی اس کے ذہن میں کامیابی کی خوشبو گھلی ہوئی تھی، اعصاب میں کامرانی کا میٹھا میٹھا نشہ سا گھلا ہوا تھا کہ اس کے حوصلے جوان تھے۔ اس کے دل میں امید کا دیا روشن تھا۔ اس کا وجود اسی خوشبو، اسی نشے، اور اسی روشنی سے توانائی حاصل کر رہا تھا کہ وہ چوتھی سمت کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔

ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا، ہریالی ہی ہریالی تھی، طویل تناور سبز پوش اشجار تھے، جن کے پتوں سے ہوا سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی، اور سرسراتی ہوا کے تاروں سے چڑیوں کی چہکار کے نغمے پھوٹ رہے تھے۔ کہیں پاس ہی سے کسی نرم رو چشمے کی گنگناہٹ اس نغمگی میں شامل ہو رہی تھی، دور کہیں کسی جھرنے کا جلترنگ نغمہ سرا تھا۔ اس نے وہیں لیٹے لیٹے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ہر سمت سکون اور شانتی کا راج تھا۔

اس نے اس تمام نغمگی اور سکون و شانتی، خوشبو اور روشنی، اور نشے سے بوجھل فضا میں گہرا سانس لیا۔ "میں بھی کتنا خوش قسمت ہوں؟" تکان سے چور چور جسم کے اندر تازہ دم اور جاگتے ذہن سے اُس نے سوچا "میں اپنے وقت کا کولمبس ہوں، ابن بطوطہ ہوں۔ میں نے معدوم براعظم اٹلانٹس بازیافت کر لیا ہے جہاں سرد اور گرم پانیوں کے ابلتے ہوئے چشمے ہیں۔ جہاں کی آب و ہوا ایسی ہے کہ ہر رس دار شیریں پھل، ہر میوہ اور ہر اناج پیدا ہو سکتا ہے۔ افلاطون نے غلط کہا تھا کہ اٹلانٹس سمندر بُرد ہو چکا ہے۔ دیکھو اٹلانٹس اسی جگہ موجود ہے جہاں میں ہوں۔"

پھر وہ یہ سوچتا ہوا سو گیا کہ بیدار ہونے کے بعد وہ اٹلانٹس کے تلاش کرنے کی نوید لے کر اپنی بستی کی طرف واپسی کا سفر شروع کرے گا۔

وہ بڑے حسین خواب دیکھ رہا تھا کہ ناقوس کی بھیانک آواز اُس کے کانوں کے پردے پھاڑتی، اس کے جسم کو چیرتی ہوئی اس کے زخمی تلوؤں کے پار ہو گئی۔ ہڑبڑا کر کپکپاتا ہوا وہ اٹھ بیٹھا، اس کے تمام جسم پر رعشہ طاری تھا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک بندر نما انسان کھڑا تھا جس کے ہاتھوں میں کھوکھلا سینگ تھا۔ اس نے اس بندر نما انسان کو غور سے دیکھا، بندر اپنی جگہ اچھلا اور پھر کھوکھلے سینگ کا ایک سرا منہ پر رکھ کر اسے زور سے پھونکا۔ بے ہنگم اور بھیانک آواز فضا میں پھیل گئی۔ تب اس کو احساس ہوا کہ اطراف میں پھیلی ہوئی فضا کی خوشبو اور ترنم غائب ہو چکا ہے۔ ہر طرف سے سڑانڈ اٹھ رہی ہے اور بین کرنے کی آوازیں ابھر رہی ہیں۔

سنکھ کی آواز پھر ابھری۔ بندر نما انسان نے پھر بے ہنگم اور وحشیانہ انداز میں اچھل کود کی اور باقی تین سمتوں سے تین اور بدہیبت اور خوفناک چہروں والے وحشی خونخوار انسان اندھیروں سے نکل کر اس کی طرف بڑھے۔ اور اسے چاروں سمتوں سے گھیر لیا۔ اس نے زمین پر بیٹھے بیٹھے گھوم گھوم کر چاروں کو دیکھا اور سمجھ لیا کہ یہ سب اس کے دشمن ہیں۔

"کون ہو تم۔؟" اس نے زمین سے اٹھنا چاہا۔

چاروں نے اس پر دو ہتھڑ مارے اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

"کون ہو تم ؟" اس نے اپنا سوال پھر دہرایا لیکن اس مرتبہ اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی اجواب میں چاروں نے قہقہے لگائے۔

"بتاؤ تم کون ہو؟" اس نے پھر کہا۔



دائیں سے بائیں: جناب عبیداللہ علیم، جناب افسر آذر، نسیم درانی اور جناب سلیم صدیقی

"ہا۔ہا۔ہا" وہ چاروں ہنسے لیکن اسے یہ آواز، بھیانک ہنسی کی یہ آواز ان چاروں کے وجود سے پرے سے بھی آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کانوں میں ہزاروں کنکھجورے جیسے گھس گئے تھے اس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے۔

"تم کون ہو؟" ان چاروں نے، اور ان کے ساتھ چاروں سمتوں نے اس سے پوچھا۔

"میں اس دنیا کا کھویا ہوا انسان ہوں جو کانٹوں بھرے راستے اور خونی پرندوں سے بھری ہوئی فضاؤں کے اس پار ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہیں اس جگہ کا پتہ کس نے دیا" ان چاروں نے اور چاروں سمتوں نے اس سے تند لہجے میں پوچھا۔

"اس علم نے جو بزرگوں سے مجھے عطا ہوا۔" اس نے جواب دیا۔

"یہاں کیوں آئے ہو؟" آس پاس، دور بہت دور سے متعدد آوازوں نے ایک ہی سوال کیا۔

"امن، سکون، سلامتی کی تلاش میں۔"

"جہاں تم رہتے ہو کیا وہاں یہ چیزیں نہیں پائی جاتیں۔؟" اُس سے پھر اجتماعی طور پر پوچھا گیا۔

"نہیں؟" مگر مجھ ایسے چہرے والے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"کیا تم زندہ ہو۔؟

"ہاں۔؟

"کیا تمہاری دنیا میں رہنے والے لوگ زندہ ہیں۔؟"

"میری طرح وہ بھی زندہ ہیں۔؟

"جھوٹ مت بولو۔ غلط بیانی سے مت کام لو۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔؟"

"سچ حُسن ہے، زندگی حسن ہے! اور زندگی امن سکون اور سلامتی ہے۔ سمجھے۔"

"مگر میں نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے۔؟" اس نے اپنی بات پر اصرار جاری رکھا۔

"تم نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ کے علاوہ سب کچھ ہے۔" ان چاروں نے اور چاروں طرف پھیلی فضاؤں نے اُس کو جواب دیا۔ لہجہ ترش اور ناگوار تھا۔

"جہاں زندگی ہوتی ہے، جہاں زندہ لوگ بستے ہیں، وہاں نیکیوں کا راج ہوتا ہے۔ وہاں زندگی امن، سکون، راحت اور سلامتی کو نہیں ترستی۔ وہاں کے زندہ افراد بدی کی قوتوں، اور شر کی طاقتوں کو غلبہ نہیں پانے دیتے۔ زندہ افراد ان تخریبی شیاطین کو پابند سلاسل رکھتے ہیں۔"

اس پر ایک بہت بڑی حقیقت منکشف ہوئی تھی۔ وہ رو پڑا۔ "مگر میری دنیا میں تو عالم بے عمل ہیں۔ وہ لوگوں سے جھوٹ بولتے ہیں۔ انھیں فریب دیتے ہیں۔ سبز باغ دکھاتے ہیں۔ حاکم غنڈوں کی سرپرستی کرتے ہیں کوتوال چوروں اور مجرموں کے حامی ہیں حرفِ شکایت زبان پر لانے والا قابلِ گردن زدنی ہے۔ آلات حرب کے کارخانے چل رہے ہیں۔ فنون لطیفہ کے مدرسے بند ہیں۔ علم کے نام پر جھوٹ کا جہل پھیلایا جا رہا ہے۔"

"تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

"میں یہاں رہنے آیا ہوں۔ میرے پیچھے اور بھی بہت سے آئیں گے۔"
اور پیچھے آنے والوں میں بہت سے قابیل، بہت سے فرعون، بہت سے قارون، بہت سے قیصر، بہت سے کسریٰ اور بہت سے چنگیز و ہلاکو مختلف سامراجی اور نوآبادیاتی فاتحین بھی آجائیں گے۔ ہم نے ان سب کو یہاں دفن کردیا ہے۔ تم بھی واپس جاؤ۔ تم بھی اپنی دنیا کو بدی اور جنگ کی ان طاقتوں کا قبرستان بنادو۔"

نوکیلے پتھروں پر اپنے تلوؤں سے رسنے والے لہو کے نشانوں، اور جھاڑیوں کے کانٹوں سے لپٹے ہوئے اپنے جسم کے گوشت کے ٹکڑوں کی مدد سے راستہ تلاش کرتا ہوا وہ اٹلانٹس سے واپس اپنی بستی میں پہنچا اور اس نے ان حقیقتوں کا پرچار اپنی بستی میں شروع کردیا جو اس پر اس سفر کے نتیجے میں منکشف ہوئی تھیں۔ بستی کے لوگوں نے اسے پاگل قرار دیا۔ اس پر پتھر مار مار کے اسے لہولہان کیا۔ بچے اس کے سر پر چپت مارتے شریر نوجوان اسے کچھ کہتے۔ کمزور عقیدے کے لوگ اسے ولی اور مجذوب گردانتے مگر کچھ ایسے بھی تھے جو اس کی باتوں کو عقل و دانش کی باتیں قرار دیتے
اور وہ جو زبردست تھے، کمزور تھے۔ جو امن سکون اور شانتی کے متلاشی تھے، جو زندگی کو حسین دیکھنے کے خواہشمند تھے پھر پابند سلاسل ہوگئے۔ بزرگوں اور بڑے بوڑھوں نے پھر اپنے بچوں کو تلقین شروع کردی۔
"بیٹا۔ ہر کھونٹ جانا۔ تینوں کھونٹ جانا پر چوتھے کھونٹ نہ جانا"
مگر اس تلقین کے باوجود، چوتھے کھونٹ جانے کی تمنا لوگوں میں پھیلتی گئی"
اور اگلی جماعت جو اس سمت روانہ ہوئی اس میں ایک سے زائد افراد شامل تھے۔
ان کی رہنمائی کے لئے مسافرِ اوّل کے تلوؤں سے بہنے والے خون کے نشانات موجود تھے۔
مگر وہ بھول گئے تھے کہ وہ کوئی نیا علم، نئی نوید، نیا پیغام لے کر واپس نہیں آئیں گے۔
انھیں واپس آنا ہوگا، اور اپنا یوٹوپیا اپنی ہی بستی کے حدود اربعہ میں تلاش کرنا پڑے گا۔

●●



گریز پا

سلیم اختر

سیاہ سڑک کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والی موٹی سی سفید لکیر دھوپ میں چمک رہی تھی اس لکیر کے قریب کسی شوقین امیرزادہ کا پھینکا ہوا آدھا سگریٹ نیلگوں بل کھاتے دھوئیں کی لکیر میں تبدیل ہو رہا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے بس اسٹاپ کے قریب فٹ پاتھ پر بیٹھا تھا۔ بس ابھی ابھی مسافروں کو سمیٹ کر گویا اسٹاپ پر جھاڑو پھیر گئی تھی اور اب فٹ پاتھ پر وہ بے زار بے زار سا بیٹھا تھا۔ دھوپ میں خاصی شدت محسوس ہو رہی تھی لیکن کچھ ایسی سستی تھی کہ ہلنے کو بھی دل نہ چاہا۔ اس کے رنگ، جانگیہ اور بنیان میں صرف کپڑے اور جلد کا فرق تھا اور دور سے وہ کول تار کی سڑک ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتا۔ اس نے بنیان میں ہاتھ ڈال کر پہلے پیٹ کھجایا اور پھر سینہ ملنے لگا۔ ملنے کیا لگا میل کی مروڑیاں اتارنے لگا یہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ایسے ہی جیسے بعض شریف آدمی تنہائی میں ناک میں انگلی گھماتے رہتے ہیں۔ اچانک ہی اس کی عقابی نگاہوں نے کسی شوقین امیرزادہ کا پھینکا ہوا آدھا سگریٹ نیلگوں بل کھاتے دھوئیں کی لکیر میں تبدیل ہوتے دیکھا میل کی مروڑی ملتی انگلیاں ایک دم رک گئیں وہ کھڑا ہو گیا پاس سے ایک راہگیر گزرا، اس نے اس کی طرف بھی توجہ نہ کی اور دوسرے لمحہ وہ آتی جاتی بسوں، ٹیکسوں، رکشوں اور سائیکلوں کے سیلاب میں تیرتا اس ٹکڑے پر جھپٹ پڑا۔

چیں.........س......س.......ں

عین اس کے جھکے سر کے قریب ہی بریکوں کی آواز سنائی دی، اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا مچھلی ایسی سرخ رنگ کی کار میں سیاہ چشمہ لگائے ایک پھلجھڑی بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک موٹا سا پھولے پھولے گالوں اور لٹکتی ٹھوڑی والا آدمی تھا۔ دونوں ہی اسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے ایک لمحہ کو انگلیوں میں سلگتے سگریٹ کو دیکھا اور پھر عورت کی طرف جو اب دوبارہ کار چلانے والی تھی۔

"اللہ کے نام پر"

اس نے اپنے مخصوص انداز میں حلق سے آواز نکالی۔

"چل اوئے دفا ہو!"

مرد کا لہجہ گوجروں ایسا تھا جبکہ عورت بریک پر سے نازک تلے کی سینڈل کا دباؤ کم کرتی ہوئی بولی "ڈرٹی سوائین"! کار پھر سے اس کے پاس سے نکل گئی، اس نے دل میں دونوں کی ماں اور بہن سے نہایت ہی متبرک رشتہ قائم کرتے ہوئے

سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور احتیاط سے سڑک پار کرنے لگا یہ کوئی بڑھیا سگریٹ تھا کیونکہ دو کش لینے پر ہی اس نے اپنے اعصاب پُر سکون محسوس کیا۔ دھوئیں نے پھیپھڑوں کو گویا لوری سنائی۔ معدہ خوشی سے پھڑپھڑایا اور آنکھوں کی چمک بڑھ گئی ..... اس نے اس ان دیکھے امیر زادہ کو دل سے دعا دی!

ویسے دعا دینا اس کا پیشہ تھا مانگنے کی طرح ..... "دے اس کا بھی بھلا اور جو نہ دے اس کا بھی بھلا" اس کے لئے ایک طرح سے تکیہ کلام کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ ایسے ہی جیسے بعض پڑھے لکھے اور امیر آدمیوں کے لئے ماں بہن کی گالی تکیہ کلام ہوتی ہے۔

اس نے دو تین اور کش لینے کے بعد سگریٹ کا ٹکڑا بجھا کر کسی اچھے وقت کی عیاشی کے لئے سنبھال رکھا۔ ادھر گردن نگاہ دوڑائی تو ذرا فاصلے پر بس اسٹاپ پر لوگوں کو جمع ہوتے دیکھا وہ پھرتی سے ان کی طرف بڑھا۔ سب سے پہلے اس نے کالج کی کچھ لڑکیوں کے سامنے جا کر آنکھیں جھکا کر اور ہونٹوں کے بائیں کونے کو ٹیڑھا کر کے حلق سے اپنی مخصوص آواز نکالی۔

"اللہ کے نام پر۔ بی بی جی!"

اس کا تجربہ یہی تھا کہ کالج کے لڑکے لڑکیاں بالعموم خیرات نہیں دیتے لیکن اس کے باوجود ہر ایک سے مانگنا ضروری تھا یہ بھی اس کے پیشہ کا ایک اصول تھا جو اس کی استاد ماں نے بچپن ہی سے اس کے کان میں پھونک رکھا تھا۔ ہر ایک سے مانگو اور جب تک اس کے منہ سے گالی نہ سن لو یا جیب سے خیرات نہ نکلوا لو مسلسل مانگتے جاؤ۔

چنانچہ اس نے بھی یہ جانتے ہوئے کہ ان لڑکیوں کے خوبصورت پرسوں سے کچھ نہ نکلے گا فرداً فرداً سب سے مانگا۔ کچھ نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ لئے بعض نے اپنی باتوں میں رکاوٹ ڈالے بغیر ہی اسے ہاتھ کے اشارے سے برخواست کر دیا ایک نے منہ ہی منہ میں کہا۔

"معاف کرو بابا!"

اس کی ساتھی بولی، "صبح صبح ہی سر پر سوار ہو جاتے ہیں!"

اس تمام ٹولی میں سے ایک سخی داتا نکلی جس نے پانچ ٹیڈی پیسوں کا سکہ اُسے دیا۔ اس نے دل کھول کر دعائیں دیں۔

بس اسٹاپ کے کونے پر ایک جوڑا ایک دوسرے میں مست کھڑا تھا اس کی چشم مردم شناس انھیں اور ان کے مقصد کو بھانپ گئی وہ فوراً ان کی طرف لپکا اور کچھ کہے بغیر منہ ٹیڑھا کر کے میمنے ایسی مسکین صورت بنا کر ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر تک انھوں نے اس کی طرف توجہ ہی نہ کی اپنی باتوں میں مصروف رہے۔ دونوں کے ہاتھوں میں کاپیاں اور کتابیں تھیں اتنے میں بس بھی آگئی اور لڑکی چونک کے بولی

"تین نمبر؟"

نوجوان نے بھی بس میں سوار ہوتی صرف دو تین سواریوں کو دیکھا اور کہنے لگا۔

"اوہ! اس میں تو بڑا رش ہے۔ اگلی سے چلی جانا!"

لڑکی نے سانولی کلائی پر چوڑی ایسے باریک فیتے سے بندھی گھڑی دیکھی اور کہنے لگی۔

"اچھا پھر میں دوسرا پیریڈ مس کر دیتی ہوں!"

اب ان کی نگاہ اس پر پڑی تو نوجوان چڑ کر بولا "کیا ہے؟"

اس کی صورت پر پوری یتیمی برس رہی تھی۔

نوجوان نے اس سے جلد پیچھا چھڑانے کو جیب میں ہاتھ ڈالا تو چونی نکلی۔ وہی اس کی طرف اچھال دی۔ اس نے خوشی سے کہا۔

"اللہ بھلا کرے جوڑی سلامت رہے" لڑکی کے چہرے پر شرم کی سرخی چھا گئی وہ مڑا ہی تھا کہ وہ بولی "ٹھہرو!" وہ مٹھی میں دبائے ننھے سے پرس

سے روپے کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا۔ اس نے اسے انگلیوں میں الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہنے لگا۔

"بی بی جی باقی پیسے نہیں۔"

"کوئی بات نہیں" لڑکی کی آنکھیں چمک رہی تھیں "یہ رکھ لو۔"

وہ اتنا متاثر ہوا کہ زبان سے دعا دینی بھی بھول گیا۔

آج کا دن تو بہت بھاگوان ثابت ہوا، ذرا سی دیر میں آدھا سگریٹ اور ایک روپیہ تیس پیسے! اس کا دل چاہا کہ اب سارا دن آرام کرے مگر جیسے قبر سے اس کی ماں نے پکار کر وہی نصیحت دہرائی جو بچپن سے وہ سنتا آ رہا تھا۔ "زیادہ خیرات لے کر بھی مانگنے میں سستی نہ کرو کیا پتہ اگلے دنوں کچھ بھی نہ ملے۔"

"مگر کیوں؟" اس نے پہلی مرتبہ سوال کیا تھا۔

"اس لئے کہ سخی داتا کم ہیں اور شوم زیادہ۔"

اس کی ماں بھی فقیرنی تھی اور اس لحاظ سے وہ بھی خاندانی فقیر تھا۔ وہ بعض اوقات مانگنے والوں کی ٹولی میں بیٹھ کر فخریہ کہا کرتا "میں کوئی مہاجر فقیر نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ ہی کاروبار یا گھربار تباہ کر کے مانگنا سیکھا۔ ہم تو خاندانی ہیں خاندانی" اس نے جب سے آنکھیں کھولیں خود کو مانگتے ہی پایا۔ اسے اپنے باپ کا علم نہ تھا شاید وہ مر چکا تھا یا ہو سکتا ہے کہ وہ بن باپ ہی کا ہو۔ ویسے اس نے کبھی اس مسئلہ میں زیادہ دلچسپی بھی نہ لی۔ آنکھیں کھولنے کے بعد اس نے ڈیرے میں صرف اپنی ماں ہی کو دیکھا، الجھے اور خشک بال، میل لگے گال اور بدبودار کپڑے۔ اور اب وہ اپنی ماں کو صرف ان ہی کے حوالہ سے یاد کر سکتا تھا اس کی ماں نے گو اسے کھلانے پلانے میں کبھی کمی نہ کی لیکن مانگنے کے معاملہ میں وہ سستی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ اسے ایک ایک ٹانگہ کے پیچھے دوڑاتی۔ سائیکل سواروں کے ساتھ ساتھ بھگاتی اور ذرا سی کوتاہی پر اس کی کھال ادھیڑ دیتی۔ اس پیشہ ورانہ تربیت کے علاوہ باقی ہر معاملہ میں وہ بہت اچھی تھی رات کو اسے اپنے ساتھ لپٹا کر سوتی بعض راتوں کو اس کی نیند کھل جاتی تو وہ اسے غائب پاتا لیکن صبح کو وہ پھر اس طرح موجود ہوتی۔ ایک دو مرتبہ اس نے پوچھا تو وہ بولی "میں نے کہاں جانا تھا سپنا دیکھا ہوگا تو نے۔"

بچپن کے جن حادثات نے اس کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے ان میں سے ایک تو اس کی ماں کی موت تھی۔ وہ دونوں حسب معمول سڑک کے کنارے بیٹھے تھے کہ اچانک اس کی ماں ایک چمکیلی کار کی طرف لپکی۔ عین اسی وقت ایک ٹرک نے چوک سے موڑ کاٹا اور اس کی ماں کو کچل ڈالا۔

وہ کئی راتوں تک ماں کی کچلی لاش خواب میں دیکھ کر چیخ اٹھتا چند دنوں بعد ڈیرہ دار نے اسے وہاں سے نکال دیا وہ بہت رویا پیٹا منت سماجت کی مگر کسی نے نہ سنی پہلی رات وہ ایک مسجد کے دروازہ آ بیٹھا جب عشا کے نمازی اسے کچھ دیئے بغیر چلے گئے اور مسجد خالی ہو گئی تو اس نے ان کی جوتیوں کی جگہ پڑ کر سو جانے کا سوچا اتنے میں مسجد کا موذن آ گیا

"ادئے" وہ چیخ کر بولا۔

وہ ابھی تک سو نہ سکا تھا۔ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا "میں۔ میں۔"

"ایتھے کی کرنا ایں" وہ غصہ سے بولا

جی میں سوتا ہوں۔"

"سوتا ہوں" وہ کسی کٹنے زین کی طرح ہاتھ نچا کر بولا "ادئے تیرے پیو دا گھر وے۔"

وہ خاموش رہا تو وہ پھر دُھاڑا "نکل اپنھوں"
وہ خاموشی سے اٹھا تو موذن پھر بولا "جوتی چور"

۲

ان دنوں وہ راتیں ایک زیرِ تعمیر کوٹھی میں بسر کر رہا تھا وہ عام طور سے کھلے آسمان تلے سونے کا عادی تھا لیکن اب برسات میں رات کو نیند خراب ہوتی رہتی۔ کوٹھی میں سامان کی رکھوالی کرنے والے سے اس کی دوستی ہو گئی یوں وہ رات کو کوٹھی اس کے حوالہ کر کے اپنے گھر چلا جاتا اور یہ سیمنٹ اور ریت کی بوریوں، اینٹوں، لکڑی اور لوہے کی سلاخوں سے اٹی پڑی کوٹھی کو اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے ساری رات خراٹوں میں گزار دیتا۔ کوٹھی پر چھت پڑ چکی تھی لینٹر ابھی نہ اترا تھا فرش بھی نہ بنا تھا۔ بس یہ ٹھاٹھ سے وہیں سوتا۔

گو ابھی بارش نہ شروع ہوئی تھی لیکن بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک نے رات کو خوفناک بنا دیا تھا اسے ابھی تک نیند نہ آئی تھی اور وہ آدھے چھتے ہوئے برآمدہ میں اینٹوں کی چوکی بنا کر اس پر بیٹھا تھا۔ نم ہوا بہت خوشگوار تھی اور تمام دن کے حبس اور گھٹن کے بعد یہ ہوا تھپکیاں دیتی محسوس ہوئی تمام دن پھرنے کے بعد وہ تھکن سے چور تھا آج بس اسٹاپ سے ایک روپیہ تیس پیسوں کے علاوہ اور کچھ ملا بھی نہ۔

ابھی نیند نہیں آ رہی تھی اس نے جیب ٹٹولی تو سگریٹوں کے کئی ٹکڑے نکلے اس نے مسلسل دو تین ٹوٹے پیے۔ طرح طرح کے ذائقوں والے ٹوٹوں نے اس کے اعصاب پر رنگ برنگ اثر کیا اور اس نے ماندگی کے احساس سے ٹانگیں پھیلا دیں۔

بجلی کی چمک سے جب ایک لمحہ کو آنکھیں چندھیا دینے والی نیلگوں روشنی ہوتی تو اسے عجیب سا احساس ہوتا اور پھر ایک چمک اس نے اینٹوں کے پاس دو سائے دیکھے۔ کہیں مالک لوگ نہ آ گئے ہوں اس نے پریشانی سے سوچا۔ اب جوتے کھا کر نکلنا پڑے گا مگر نہیں یقیناً ایک آواز لڑکی کی بھی تھی وہ اندھیرے میں راستہ ٹٹولتے ادھر ہی آ رہے تھے اس نے ماچس جلائی اور اونچی آواز سے بولا

"کون ہے"

"اللہ کے نام پر بابا"! آواز بوڑھی تھی۔

"اوہ!" اس نے اطمینان سے سوچا یہ تو اپنی ہی قوم ہے......"کیوں؟" اس نے پوچھا۔ بوڑھا کچھ بولنے کو تھا کہ لڑکی فوراً بولی۔

"بارش آنے والی ہے اگر ہم رات گزار سکیں یہاں"

"اچھا! اچھا"! اس نے لاپرواہی سے کہا مگر ایسے ٹھکانہ میں ان کی شرکت اسے ناگوار گزری۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑے تھے اور اس نے انھیں آنے کو نہ کہا تھا کہ بجلی کی چمک میں لڑکی نے اشارہ مارا وہ فوراً بولا آؤ! آؤ! وہ دونوں جھجکتے برآمدہ میں اس کے پاس آ کھڑے ہوئے۔

"بیٹھو بھئی! یہاں رات گزارنا ٹھیک تو نہیں مگر اب آ گئے ہو تو پھر......"

لڑکی نے بڈھے کو دیوار کے سہارے بٹھا کر آٹے اور روٹیوں سے بھرا ہوا تھیلا بھی اس کے ساتھ رکھ دیا۔ بڈھا اطمینان کا طویل سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔

"اللہ بھلا کرے بابا"!

لڑکی بولی "ہم رات گزار کر چلے جائیں گے"۔

"کوئی بات نہیں" وہ فیاضانہ لہجہ میں بولا۔

بڈھا بولا: "تم یہاں چوکیدار ہو"؟

بجلی کی روشنی میں اس نے لڑکی کا چہرہ جب قریب سے دیکھا تو پتہ چلا کہ پوری جوان ہے۔

لڑکی نے تھیلا اپنے آگے کر لیا اور اس میں سے طرح طرح کے چاول اور روٹیاں نکالنی شروع کیں ایک بڑے سے سلور کے کٹورے میں رنگ برنگ سالن تھے وہ دونوں کھانے لگے۔ تھوڑا سا کھا کر لڑکی بولی

"تم بھی کھالو خان"!

وہ دل میں خوش ہوا کہ اسے پٹھان سمجھا جا رہا ہے۔

"نہیں! نہیں!" وہ بولا "میں نے روٹی کھالی ہے"!

"آجاؤ بابا!" بڈھے نے بھی نوالہ چباتے وقت چپڑ چپڑ کی آوازوں کے درمیان اسے دعوت دی۔

لڑکی کہنے لگی "ہم فقیروں کا کھانا ہے یہ"

"نہیں یہ بات تو نہیں"!

لڑکی نے بجلی کی چمک میں مٹھی بھر چاول اسے دیئے "لو یہ پلاؤ ہے"!

اس نے خاموشی سے لے لئے اور کھانے لگا یہ ختم کر کے لڑکی نے اسے گڑ کے چاول دیئے وہ بھی اس نے کھائے۔ اس دوران میں ادھر اُدھر کی باتیں بھی ہوتی رہیں اور باتوں میں اسے پتہ چلا کہ بڈھا اندھا ہے اور یہ اس کی بیٹی ہے۔

کھانا کھا کر بڈھے نے لمبے لمبے دو چار زوردار ڈکار لئے اور پھر بولا "پانی مل جاتا تو اچھا تھا"!

پانی یہاں کہاں ہوگا" لڑکی نے کہا۔

"پانی"؟ وہ بولا "دیکھتا ہوں......" وہ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا گیا۔ چوکیدار کی صراحی اٹھا لایا وہ خالی تھی پھر اسے تعمیر کے لئے لگائے گئے ہینڈ پمپ کا خیال آیا۔ چنانچہ وہاں سے صراحی بھری اور لے آیا سب نے صراحی سے منہ لگا کر پانی پیا۔ بڈھے نے ایک دو اور ڈکار لئے اور پھر وہیں لیٹ گیا۔

اس نے سگریٹ کا ایک اور ٹوٹا نکالا اور سلگا لیا اس نے خاموشی سے دو تین اور کش لئے اتنے میں اچانک شور کے ساتھ بارش شروع ہو گئی۔ بھوار دوسری طرف کی تھی اس لئے یہ وہیں بیٹھے رہ سکتے تھے۔ بڈھے کے خراٹے گونج رہے تھے انھیں خراٹوں میں ناک اور حلق سے سیٹی ایسی آواز بھی نکلتی۔

"تمہارا باپ سو گیا" وہ بارش کے شور کی وجہ سے بلند آواز سے بولا۔

"ہاں بے چارا سارا دن کا تھکا ہوتا ہے"!

اتنے میں زور سے بادل گرجا تو وہ اس کے قریب سرک آئی۔

"ڈر لگتا ہے"؟ اس نے پوچھا۔
"ہوں" اب وہ دونوں پاس پاس بیٹھے تھے، کش سے جب سگریٹ چمکتا تو لڑکی کے گال پر سرخی لرز جاتی۔
"تمہارے پاس اور سگریٹ ہے؟" وہ بولی۔
تم سگریٹ بھی پیتی ہو؟"
"کبھی کبھی!!"
اس نے ہاتھ والا ٹوٹا اسے تھما دیا، لڑکی نے دو تین کش لئے اور سر دیوار سے ٹکا دیا، سگریٹ کی چمک میں وہ اس کی آنکھیں ناک اور ہونٹوں کو دیکھ سکتا تھا۔ لڑکی نے آخری کش لے کر باقی سگریٹ پھینک دیا۔
اس نے پوچھا "اور لوگی؟"
"نہیں بس؟"
"اچھا تھا؟"
"ہاں مزا آگیا!"
اب بجلی کڑکی تو لڑکی بدک کر اس کے ساتھ آلگی۔ اس نے کندھوں سے پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور سرگوشی میں بولا۔
"اب ڈر لگتا ہے!"
وہ ہنسی مگر منہ سے کچھ نہ بولی اس نے دوسرے ہاتھ سے اسے اپنی طرف کھینچا وہ کھنچتی چلی گئی دونوں ایک دوسرے سے اس طرح لپٹے بیٹھے رہے اس نے لڑکی کے گالوں سے اپنے ہونٹ لگا دیئے تو گرد کا ذائقہ محسوس ہوا اس کے جسم سے پسینہ اور گندے کپڑوں کی بو آرہی تھی۔ اس نے اسے زور سے دبایا تو وہ نرم گیند کی طرح دبتی چلی گئی۔
وہ سرگوشی میں بولا "اندر آجاؤ!"
"کیوں؟" وہ پھولی ہوئی سانسوں سے بولی۔
"تمہارا باپ نہ جاگ جائے!"
"ہاں؟" اس کے جسم میں کپکپی تھی "وہ تو مجھے یاد ہی نہ رہا!"
شرابی کی طرح لڑکھڑاتی لڑکی کو سہارا دیئے وہ اسے اندر کمرے میں لے گیا۔ جہاں فرش ابھی نہ بنا تھا اور چھت کا لینٹر نہ اترا تھا باہر طوفانی ہواؤں میں جھاجوں مینہ برس رہا تھا۔

۳

اب وہ تینوں مل کر رہنے لگے وہ اندھے کو کسی مصروف چوک پر چھوڑ دیتے اور خود دونوں اکٹھے نکل جاتے۔ لڑکی ٹی بی چیلی ثابت ہوئی آنکھوں کی مانند جسم کی بوٹی بوٹی تھرکتی رہتی۔ وہ چلتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے کرچیوں پر چل رہی ہو یہ چال کا وہ انداز تھا جو بڑے نصیبے والی بیگمات کو جو اونچی لمبی ہیل کی جوتی پہن کر بھی نصیب نہ ہو سکتا تھا اگرچہ اس کے جسم میں سے پسینہ اور گلیوں کی گرد کی بو نہ چھپتی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اب اس کی آسودہ جوانی کی مہک بھی شامل ہو گئی تھی اور ان سب کے امتزاج نے اسے نشیلی بنا دیا تھا اس کی معیت میں بھیک مانگنا بھیک مانگنا نہ رہا تھا۔ چنانچہ دونوں ساتھ ساتھ یوں چلتے گویا ٹورسٹ ہوں۔
ادھر زیر تعمیر کوٹھیوں کی کمی نہ تھی اور یوں وہ تینوں بڑی بڑی کوٹھیوں میں بسیرا کرتے یہ پچیس تیس لاکھ آبادی کے شہر کے

ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جن کے لئے کسی طرح کے رہائشی مسائل نہ تھے۔

وہ بہت خوش تھا ان تینوں کی مجموعی کمائی کافی سے زیادہ تھی اندھا ان سے کچھ طلب نہ کرتا جہاں بٹھا دیا بیٹھ گیا جو کھانے کو دے دیا کھا لیا بلکہ یوں بیٹی کے ٹھکانے لگ جانے سے وہ مطمئن تھا اگرچہ اس نے اپنے اس "داماد" کو نہ دیکھا تھا لیکن وہ آواز سے اچھا انسان لگتا تھا اور اس کے سخت ہاتھوں کو چھونے سے اس کی مردانگی کا احساس ہوتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کبھی کبھی راتوں کو اس کی بیٹی کیوں غائب ہو جاتی ہے لیکن یہ تو ہوتا ہی ہے۔

اس مثلث کے دو زاویئے اس صورت حال سے بے حد مطمئن تھے البتہ تیسرا زاویہ یعنی برکتے عرف ملکی عرف تتلی اب بے زار بے زار سی تھی اسے جو شہزادہ نظر آتا تھا اب وہ محض ایک فقیر بن چکا تھا جو اسے مٹھائی کھلاتا اور آنکھوں میں کتے ایسی وفاداری لئے اس کے سامنے بیٹھا گویا دم ہلاتا رہتا پھر اسے یہ بھی احساس تھا کہ وہ زیادہ کما کر لاتی ہے اگرچہ مردوں کی گرم لگاہیں اس کے جسم کو جھلساتی رہتیں اور بعض من چلے پیسے دیتے وقت ہاتھوں کو دبا دیتے یا کہنی کو سہلا دیتے تھے اسے یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ شروع شروع میں زیر تعمیر کوٹھیوں کے لینٹر تلے سونے میں مہم جوئی کا جو احساس تھا وہ بھی اب ختم ہو چکا تھا الغرض! اس پر ان دنوں عجیب بے زاری مسلط تھی۔

اور پھر ایک دن اسے ایک اور شہزادہ مل گیا اگرچہ پہلے شہزادہ کی مانند یہ بھی فقیر ہی تھا لیکن یہ زیادہ مضبوط اور خوبصورت تھا دونوں ایک ہی اڈے پر کھڑے تھے اس لئے باتوں کا سلسلہ چل نکلا اس نے اسے بتایا کہ وہ ریلوے پل کے نیچے اپنی جھگی میں رہتا ہے۔

"اور اوپر سے گاڑیاں گزرتی ہیں؟" اس نے آنکھیں جھپکا کر پوچھا۔

"ہاں" وہ کسی بچے ایسی خوشی سے بولا" اوپر سے گاڑیاں گزرنے کا بڑا مزہ آتا ہے۔ دھڑ دھڑ سارا پل ہلتا محسوس ہوتا ہے اور اس کے نیچے جھگی بھی ہلتی لگتی ہے۔"

"جھگی بھی ہلتی لگتی ہے' اس نے ان الفاظ کو یوں زیر لب دھرایا گویا ان کا ذائقہ محسوس کر رہی ہو اور پھر پیشتر اس کے کہ اسے احساس ہوتا اس کے منہ سے نکلا" میں بھی دیکھوں گی۔"

"کیا؟" حیرت سے بولا۔

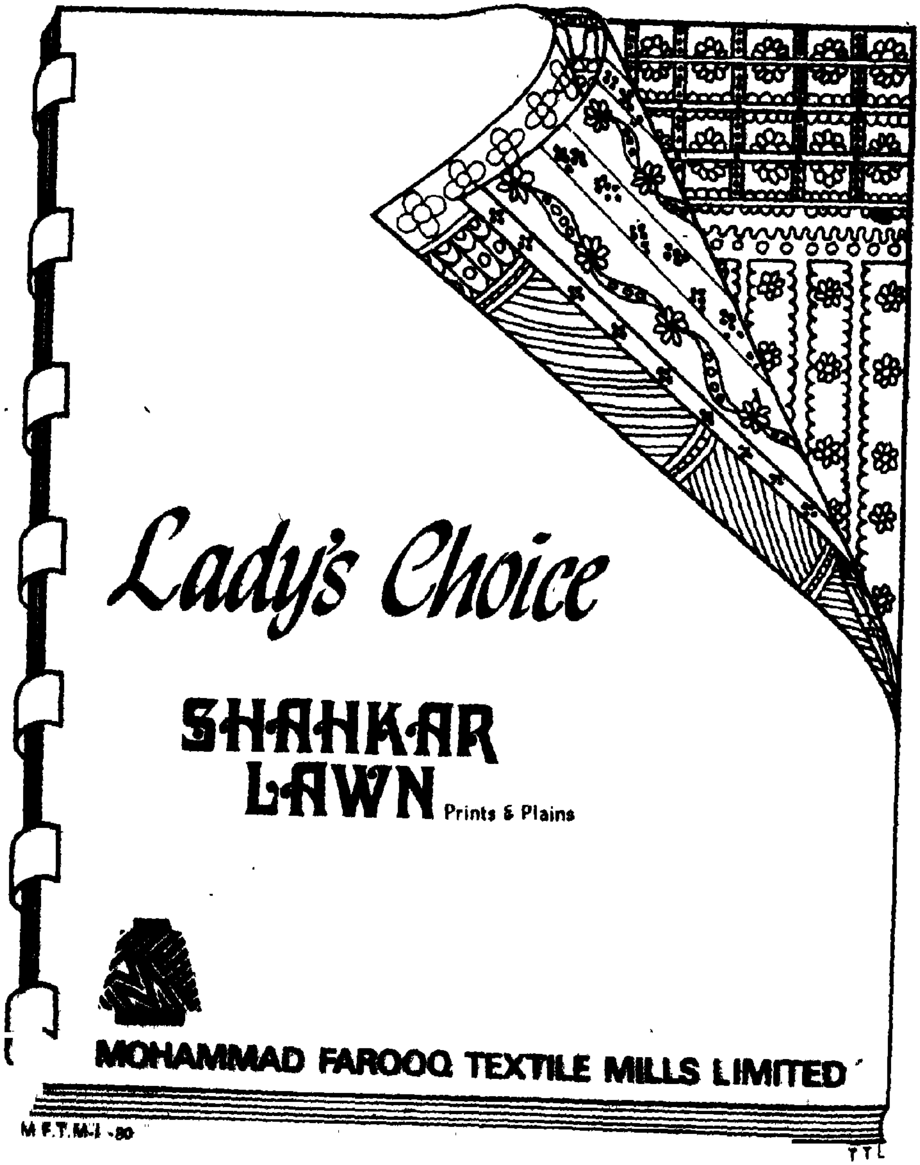
"ہلتے پل کے نیچے ہلتی جھگی۔"

اس رات وہ مارے خوشی کے سو نہ سکی تمام رات ریل گاڑیوں کے بھاری بوجھ کے نیچے پل ہلتا رہا اور اس پل کے نیچے جھگی۔ وہ بچوں ایسی خوشی سے گزرتی ہوئی ریل گاڑیوں کو گنتی رہی حتیٰ کہ بتیس کے بعد جب اسے نیند آنے لگی تو وہ دوبارہ جاگ گیا عجیب رات تھی اور وہ بار بار یہی سوچتی کہ وہ پل ہے یا جھگی۔

صبح سویرے جب وہ نئے شہزادہ کے ساتھ اڈے پر پہنچی تو باپ اور وہ دونوں کھڑے تھے اس نے انھیں دیکھ کر بھاگنا چاہا مگر ایک ہی جست میں وہ اس کے سر پر تھا اس نے چٹیا پکڑ لی اور چیخ کر بولا۔

"کہاں تھی تو حرام زادی!"

اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ جواب دیتی ایک کرارے تھپڑ نے آنکھوں میں تارے گھما دیئے۔ جھگی کا شہزادہ اس کی طرف بڑھا مگر ایک ہی گھونسہ کھا کر ٹوٹے دانت کے خون سے ایسا خوفزدہ ہوا کہ پھر اس نے پلٹ کر نہ دیکھا باپ اسے گالیاں دے رہا تھا اور لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی مگر کوئی اس کا ہاتھ روکنے والا تھا۔


Lady's Choice
SHAHKAR LAWN
Prints & Plains
MOHAMMAD FAROOQ TEXTILE MILLS LIMITED

بیگن ز ®

کام تمام کیا

بائرجرمنی کیمیائی مصنوعات اور ادویات کی دنیا میں ایک عظیم تحقیقی ادارہ ہے۔ بائر کے ماہرین کیمیا نے اڑنے اور رینگنے والے تمام کیڑے مکوڑوں کے فوری خاتمہ کے لیۓ بیگان محلول تیار کرکے اپنی روایتی سبقت کو برقرار رکھا ہے۔ بیگان ایسے تمام کیڑے مکوڑوں کے خاتمے کے لئے زود اثر ہے جو دوسری کیڑے مار مصنوعات کے خلاف قوت مدافعت پیدا کر چکے ہیں۔ یاد رکھیے کہ بیگان میں شامل اجزاء بے حد موثر ہیں اور ان کی کارکردگی دیر تک قا... ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بازار میں دوسری فروخت ہونے والی مصنوعات کے مقابلے میں بیگان قیمت میں ... نظر آتا ہے لیکن اپنی افادیت کی بناء پر یہ یقیناً ارزاں ہے۔

نوٹ۔ بیگان ایروسول ... ئل سپرے میں دستیاب ہے



BAYER Chemdyes Pakistan Limited

۴

وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں اور پھر وہ ہزاروں مرتبہ دہرایا گیا سوال کرتا ہے۔

"تم نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟"

وہ اس کی دیکھتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔

"اس دن نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ بس پاگل ہو گیا تھا میں" اس نے خاموشی سے اس کے جسم کو دیکھا "میں دراصل یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم مجھے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ چلی جاؤ۔"

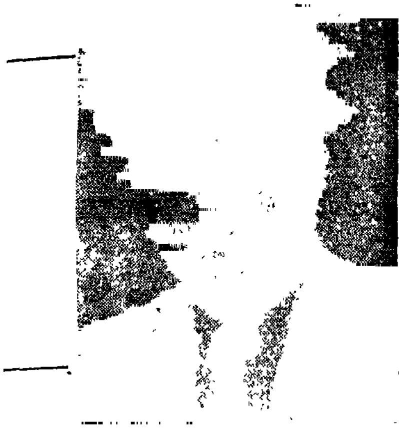
وہ سر جھکائے بیٹھی رہتی ہے وہ اس کے پاؤں پکڑ لیتا ہے۔ "مگر میری یہ نیت نہ تھی۔ میں تمہارے پاؤں توڑنا نہ چاہتا تھا میں تمہیں ڈرا رہا تھا۔"

"غلطی میری بھی تھی مجھے تمہیں گندی گالیاں نہ دینی چاہئیے تھیں۔"

"پھر بھی ــــ پھر بھی ــــ یہ سب نہ ہونا چاہئیے تھا" وہ دوبارہ اس کے پاؤں پکڑ لیتا ہے۔ وہ پاؤں جو علاج کے بغیر زخمی تھے وہ پنڈلیاں جن کے زخموں میں پیپ پڑ رہی تھی اور وہ رانیں جو سوج رہی تھیں۔

چوک کے ایک کونے میں وہ چھوٹی سی ریڑھی میں ٹانگیں سکیڑ کر بیٹھی ہے، لوگ اس کی جوانی دیکھتے ہیں پھر اس کی زخمی ٹانگیں اور ان پر بھنبھناتی مکھیاں تو رحم اور کراہت کے ملے جلے احساس سے ان کی جیبیں خود بخود پیسے اگل دیتی ہیں۔ اب اس کے باپ کو بھی اس کے پاس ٹھہرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس کے مالک کو۔ کیونکہ اسے بھی اور انھیں بھی علم ہے کہ وہ اب بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی!

●
●



پھیرے

جوگندر پال

"لیکن ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟"

"لیکن ہو گیا، تو ہو ہی سکتا ہو گا۔"

"ڈاکٹروں کا کیا کہنا تھا؟"

"کوئی درجن بھر بڑے بڑے ڈاکٹر اسی نتیجے پر پہنچے کہ لالہ کو کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ بھی نہیں تو پھر جو تھا وہ کیا تھا؟"

"یہی تو کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔"

"نہیں، پوری بات بتاؤ۔"

"کئی بار تو بتا چکا ہوں۔"

"ایک بار پھر بتاؤ۔"

"لالہ کی آنکھ کھلی تو نوکر بیڈ ٹی لیے ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ مسکرائے اور شاید چائے کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہے مگر ان کے ہاتھ بدن کی دونوں جانب جوں کے توں پڑے رہے اور مُسکان چہرے میں اس دم جہاں جہاں پہنچ پائی وہیں کی وہیں رہ گئی۔"

"ہاں، لالہ کی مسکان ان کے چہرے میں عین وہیں ساکت کھڑی تھی، مانو وہ کوئی تصویر ہوں اور مصوّر نے بھاگتے لمحے کو اچانک روک لیا ہو — تم نے وہ تصویر دیکھی ہے۔ لالہ کے بیڈ کے سامنے کی دیوار پر ٹنگی ہوتی ہے۔ بیڈ ٹی پیتے ہوئے وہ اپنے آپ کو اس تصویر میں قہقہاتے ہوئے دیکھ دیکھ کر اکثر بے اختیار ہنسنے لگتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ تصویر سے نکل کر یہاں بستر پر آ بیٹھے ہیں۔"

"سنو، کیا پتہ، اب کے وہ بستر سے اپنی اس تصویر میں منتقل ہو گئے؟"

"نہیں، ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟"

"لیکن ہو گیا تو ہو ہی سکتا ہو گا — میں بھی جب اپنی تصویر پر نظر جمائے گنگنانے لگتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اپنے آپ میں ہونے کی بجائے اپنی تصویر میں ہوں۔"

"تو پھر اس وقت ہماری بھابی تم سے کہاں ملتی ہے، تمھاری تصویر میں یا تم میں؟"

”تمہاری بھابی چلّا چلّا کر مجھے ہر جگہ ڈھونڈھتی پھرتی ہے مگر میری تصویر کی جانب جی بھر کے کبھی نہیں دیکھتی، اس لئے مجھ سے ملنے سے رہ جاتی ہے۔“

”تمہاری بے سر و پا باتیں تو سنتا ہی رہتا ہوں۔ بات اس وقت لالہ کی ہو رہی ہے۔“

”لالہ کی مشکل یہ ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے کے لالہ ہیں۔ مگر ہمارا بس یہ ہے کہ کبھی کبھار اتفاق سے لالہ بن گئے۔ ہم بھی ہر وقت تصویرین کے پڑے رہیں تو ہماری روٹی روزی کا کیا ہو؟“

”مگر تصویروں کو بھوک تھوڑا ہی لگتی ہے۔“

”نہیں لگتی تو لالہ کو ناڑی کے ذریعہ خوراک کیوں پہنچائی جا رہی ہے؟“

”لالہ کو چھوڑو، وہ تو منہ سے بھی بے بھوک ہی کھاتے ہیں۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو، نری پری مورتی ہیں۔ ان کے منہ پر بانسری جوڑ کر رکھ دو اور اپنے ہی من سے تان پھوٹنے کا انتظار کرو ——“

”خیر یہ باتیں چھوڑو اور لالہ کی بے ہوشی کی پوری بات بتاؤ۔“

”کئی بار تو بتا چکا ہوں۔“

”ایک بار پھر بتاؤ۔“

”للائن کو جب خبر ملی کہ لالہ اچانک رک کر رہ گئے ہیں تو وہ ہنسنے لگیں، اس میں برا ہی کیا ہے؟ ذرا آرام کریں گے —— پھر ہنستے ہنستے ررآئیں تو لالہ کو دیکھ کر ان کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا —— واہ لالہ، واہ! مجھے کیا پتہ تھا کہ نوٹنکی کے بھی سب سے بڑے لالہ آپ ہی ں —— اری او شیاما! —— دیال! —— آؤ! اپنے لالہ کا ناٹک دیکھو! —— للائن لالہ کی تعریف کرتیں تو لالہ کی مونچھیں اپنے پ اکڑ جاتیں۔ اب بھی للائن عادتاً لالہ کی مونچھوں پر چور نظر جمائے ہوئے تھی۔ تصویر میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی تو وہ چونکیں اور پھر سراسیمہ ہو کر بولیں، رے تم تو کہتے تھے لالہ رک کر رہ گئے ہیں، وہ تو یہاں ہیں ہی نہیں —— کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ —— جاؤ، دیکھو کس رف نکل گئے ہیں! —— لالہ! —— میں کئی دن سے محسوس کر رہی تھی کہ کھڑے پانیوں میں جہاز ڈوبنے والا ہے! —— لالہ! —— ل رات کے کھانے پر اچانک میری طرف منہ پھیر کر کہنے لگے کہ اگر میرا کہیں جانا ہو جائے تو میرا وجود سنبھال کر رکھنا —— لالہ! —— الہ! —— للائن نے لالہ کو جھنجھوڑنا چاہا مگر اس کے بیٹے دیال نے اسے روک دیا، میں ابھی ڈاکٹر کو لے کے آتا ہوں ——“

”مگر ڈاکٹروں کی سمجھ میں آنے والی بات ہوتی تو وہ بے چارے سمجھ بھی لیتے، ہارٹ بیٹ، نارمل، بلڈ پریشر، نارمل، ٹمپریچر، ارمل، پر وہی ایک وہاں نہیں، جس کا سب کچھ نارمل ہے۔“

”مگر ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟“

”مگر ہو گیا تو ہو ہی سکتا ہو گا۔“

”ہاں، اتنا بڑا آدمی ہے، جو چاہے کرے۔ لاکھوں کی آمدنی، کروڑوں کی جائداد، اور اربوں کی اس کی ذات، وہ جو کچھ چاہتا ہے ے اس کے منہ پر لانے سے پہلے ہی پورا کر دیا جاتا ہے۔“

”نہیں، کوئی خواہش پیدا ہونے سے بھی پہلے اس کی وہ خواہش پوری کر دی جاتی ہے۔“

”مگر کوئی خواہش ابھی پیدا ہی نہ ہوئی ہو تو اس کے پورا ہونے یا نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے؟“

”ہاں، میں نے بچپن میں ایک کہانی سنی تھی —— ایک تھا راجہ ——“

" نہیں، میں کوئی بچہ نہیں جو راجاؤں کی کہانیاں سن کر بہل جاؤں ۔"

" ارے بھائی، بچہ بننے سے ہی عقلمندی کا جینا ہو تو عقلمند بن کے مورکھوں کی طرح اپنا چین کیوں خراب کیا جائے ؟ ـــــ مگر تم پہلے میری کہانی سنو ـــــ اس راجہ کا یہ حال ہو گیا تھا کہ خواہشوں کے لئے لوٹتا پوٹتا رہتا مگر کیا مجال، کوئی خواہش پیدا ہو جائے ـــــ"

" مگر راجاؤں کی کہانیوں میں تو ان کے بچے پیدا نہیں ہوتے ؟"

" ایک ہی بات ہے ۔ خواہش ہی پیدا نہ ہو تو بچے کیونکر پیدا ہوں ؟ ـــــ تم کہانی سنو ـــــ آخر راجہ نے اپنے ایک چہیتے وزیر کو بلا کر کہا، اگر مجھے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر کوئی خواہش پیدا نہ ہوئی تو تمھارا سر قلم کرا دوں گا ـــــ"

" اپنے چہیتے وزیر سے یہ کہا ؟"

" ہاں، راجاؤں کے ہاتھوں ان کے چہیتوں کو ہی خلعت یا موت ملتی ہے، مگر تم کہانی سنو ـــــ وزیر بے چارہ چوبیس گھنٹے سوچ میں غلطاں رہا، اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اپنا سر قلم کروانے کے لئے راجہ کے محلوں کی طرف ہو لیا اور اس کے سامنے حاضر ہو کر یکبارگی کوئی سوچ آنے پر خوشی سے اچھل پڑا ۔ راجہ نے کہا، تمھاری خوشی بتا رہی ہے کہ ضرور کوئی کارگر ترکیب لے کے آئے ہو ـــــ نہیں، مہاراج! ـــــ تو پھر اتنے خوش کیوں ہو ؟ میری خواہش ہے کہ تمھارا سر اسی دم قلم کرا دوں ـــــ لیجئے مہاراج، آپ کی خواہش تو پیدا ہو گئی مگر اسے پورا کرنے کے لئے میرا سر قلم کروا دیں گے تو وہ اپنے وعدے سے پھر جائیں گے ـــــ راجہ نے ہنس کر جواب دیا، ٹھیک ہے، تمھیں مارنے سے کیا ہوگا ؟ آؤ آج شام کو شیر کے شکار پر جائیں گے ۔"

" ہاں، خواہش پوری ہونے سے رہ جائے تو بنی رہتی ہے، اور بنی رہے تو فکرمندی سے آدمی کا چلنا پھرنا بنا رہتا ہے ۔"

" فکرمندی کا کیا ہے ؟ لالہ چاہیں تو میری ساری فکریں لے لیں ۔ مجھے ان کے سکھ پراپت ہو جائیں تو میں بھی بلا جھجک ان کی طرح اپنا آپ کھو کر اپنی تصویر بن جاؤں ـــــ بلکہ اپنا آپ کھو کر مجھے چین آ جائے گا ۔ ہنسنے کی ہو یا رونے کی، ہم اپنے آپ میں ہی نہیں تو ہمیں کیا ؟"

" اچھا، یہ بتاؤ، تمھیں اپنا آپ کھو دینا نصیب ہو جائے تو کھوئے کھوئے کہاں جاؤ گے ؟"

تم تو وہی بات کر رہے ہو جو اسکول میں استاد کیا کرتے ہیں، اگر تمھیں اچانک ایک لاکھ مل جائے تو کیا کرو گے ؟ ـــــ ارے بھئی، پہلے ملنے تو دو، مجے آنے دو پہلے، کھوئے کھوئے پاؤں جدھر لے گئے، ادھر ہی نکل جائیں گے ۔"

" تو کیا تمھارا خیال ہے، لالہ ہمارے بھی مزے سے ادھر ہی کہیں نکل گئے ہیں ؟"

" نہیں، لالہ کوئی فکر ہی نہیں تو وہ کیوں اپنے آپ سے بھاگ کر مارے مارے پھریں گے ؟ وہ تو اپنے اندر ہی اندر کہیں آنکھ بند کر کے پڑ گئے ہوں گے ۔"

" مگر ان کی دونوں آنکھیں تو چوپٹ کھلی تھیں ۔"

" اس سے کیا فرق پڑتا ہے ؟ سکھوں نے اتنا کڑا پہرہ لگا رکھا ہو تو کسی شے کی کیا جرأت، جو نظر آ جائے ۔ سبھی ڈاکٹر تھک ہار کر بیٹھ گئے ۔"

" اگر وہ ان کے سکھوں کا پہرہ توڑنے میں کامیاب ہو جاتے تو لالہ یقیناً ٹھیک ہو جاتے ۔"

" سنو، اسی راجہ کی میں تمھیں ایک اور کہانی سناتا ہوں ۔"

" میں تم سے لالہ کی باتیں کرنا چاہتا ہوں مگر تم مجھے کہانیاں سناتے جا رہے ہو ۔"

" باتیں کہانیاں نہ بن پائیں تو ان پر یقین نہیں آتا ـــــ سنو ! ـــــ اس راجہ پر بھی بے حساب سکھوں نے پہرہ لگا رکھا تھا ۔ ایک ننھے سے دکھ کو راجہ پر بڑا ترس آیا اور وہ زمین کے اندر ہی اندر سے اس کے محل میں جا پہنچا اور اسے گلے لگاتے ہی راجہ کی جان میں جان آ گئی ۔

" مگر ایسے کیسے ہو سکتا ہے ؟ "

" ہو گیا ہو تو ہو ہی سکتا ہو گا ـــــ ہو جائے تو جھوٹ موٹ سے بڑھ کے کونسی سچائی ہو گی ؟ "

" یہ تو ٹھیک ہے مگر راجاؤں کی کہانیوں پر یقین نہیں آتا ۔"

" تو لو ، تمھیں آج کی ایک سچی کہانی سناتا ہوں ۔ ہمارے ہی شہر کی ایک بڑی اجلے پوش کالونی ہے جہاں صرف امیر لوگ بسے ہوئے ہیں۔ ایک فقیر ہر روز وہاں پھیری پر جایا کرتا تھا اور بھیک مانگنے کے لئے یہ صدا بلند کیا کرتا تھا ، تم مجھے روٹی دو ، میرا خدا تمھیں دکھ دے گا ۔

" ہہ ہا ـــ ہہ ! عجیب بھیک منگا تھا ۔"

" تمھاری ہی طرح کے کسی شخص نے فقیر کو روک کر پوچھا ' بابا ! روٹی چاہتے ہو تو اپنے خدا سے لوگوں کے لئے سُکھ مانگو ۔ فقیر نے جواب دیا ، تم اس کالونی کے رہنے والے معلوم نہیں ہوتے بابا ، تمھارے محلے میں بھیک مانگنے آؤں گا تو تمھارے لئے سُکھ ہی مانگوں گا ، مگر یہ لوگ اپنے سکھوں سے ہی دکھی ہیں ، اس لئے ان کے سکھ کے لئے دکھ مانگ رہا ہوں ۔"

" ہہ ـ ہہ ہہ ! ـــ بالکل درست ہے ۔ ہمارے لالہ کو ہی لے لو ۔ باقاعدہ سانس لے رہا تھا مگر سکھ ہی سکھ سے مرا پڑا تھا ۔"

" ہاں ، میں نے بھی دیکھا کہ مسکان اس کے چہرے میں عین وہیں رُکی ہوئی تھی اور ہاتھ بستر پر وجود کی دونوں طرف ساکت پڑے تھے ۔ اور ناک ہی کے راستے خوراک لیتے ہوئے وہ آنکھیں بے جھپک کھولے ہوئے تھا اور اپنے آس پاس سے قطعاً بے خبر تھا ۔"

" بے ہوشی میں بھی خوراک جوں کی توں اندر پہنچتی رہے تو باخبر نہ ہونے میں نقصان ہی کیا ہے ؟ "

" ان فکرمندیوں کا ، جن کے باعث ہماری رگوں میں خون کا دورہ رکنے میں نہیں آتا ۔"

" ہاں ، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ میری فکرمندیاں نہ رہیں تو زندہ رہ کر کروں گا کیا ؟ "

" ہاں ، موٹی سی بات ہے مگر اسے جاننے کے لئے للائن نے اپنے فیملی ڈاکٹر کی سفارش پر بمبئی سے میڈیکل سائیکالوجی کا ایک بہت بڑا ایکسپرٹ بلوایا ۔ پہلے تو اس نے لالہ کا انگ انگ چیک کیا ، پھر ابھی تک کے علاج کی تفصیلات پر نگاہ دوڑائی اور پھر ہنس کر کہنے لگا ، گھبرانے کی کوئی بات نہیں ۔ کوئی نہایت بری خبر گھڑیئے اور اسے لالہ کے کانوں میں پھونک دیجئے ، دیکھئے کیونکر بستر سے اچھل کر کھڑے ہو جاتے ہیں ۔"

" پوری بات سناؤ ۔"

" کئی بار تو بتا چکا ہوں ۔"

" ایک بار پھر بتاؤ ۔"

" پہلے تو للائن ڈاکٹر کی طرف خفگی سے دیکھنے لگیں لیکن جب ڈاکٹر نے مسکرا کر بڑے پُرسکون لہجے میں اپنی بات دہرائی تو وہ پوچھنے لگیں ، کس طرح کی بُری خبر ۔ ڈاکٹر نے اسی پیشہ ورانہ پُرسکون لہجے میں کہا ، بُری سے بُری خبر ـــ آپ کے بیٹے کا کیا نام ہے ـــ دیال ـــ کہئے ، دیال کا موٹر ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور ـــ اور وہ چل بسا ہے ـــ چل بسا ہے ؟ ـــ ہاں ، رو رو کر اسی بات کو دہراتے چلے جائیے ـــ للائن نے اسے بتایا کہ اسے رونا نہیں آتا ـــ ڈاکٹر ہنسنے لگا ، رونا نہیں آتا تو کم سے کم گھبرا تو سکتی ہیں ـــ نہیں ؟ ـــ کوئی بات نہیں ۔ کسی ملازم سے کہئے کہ آپ کے لئے رونا شروع کر دے ـــ نہیں ، ٹھہریئے ـــ انھیں بتائیے کہ انکم ٹیکس والوں نے آپ کے یہاں چھاپہ مارا ہے ۔"

" ہہ ہا ہہ ـــ ہہ ! تم بتا چکے ہو کہ لالہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے ۔"

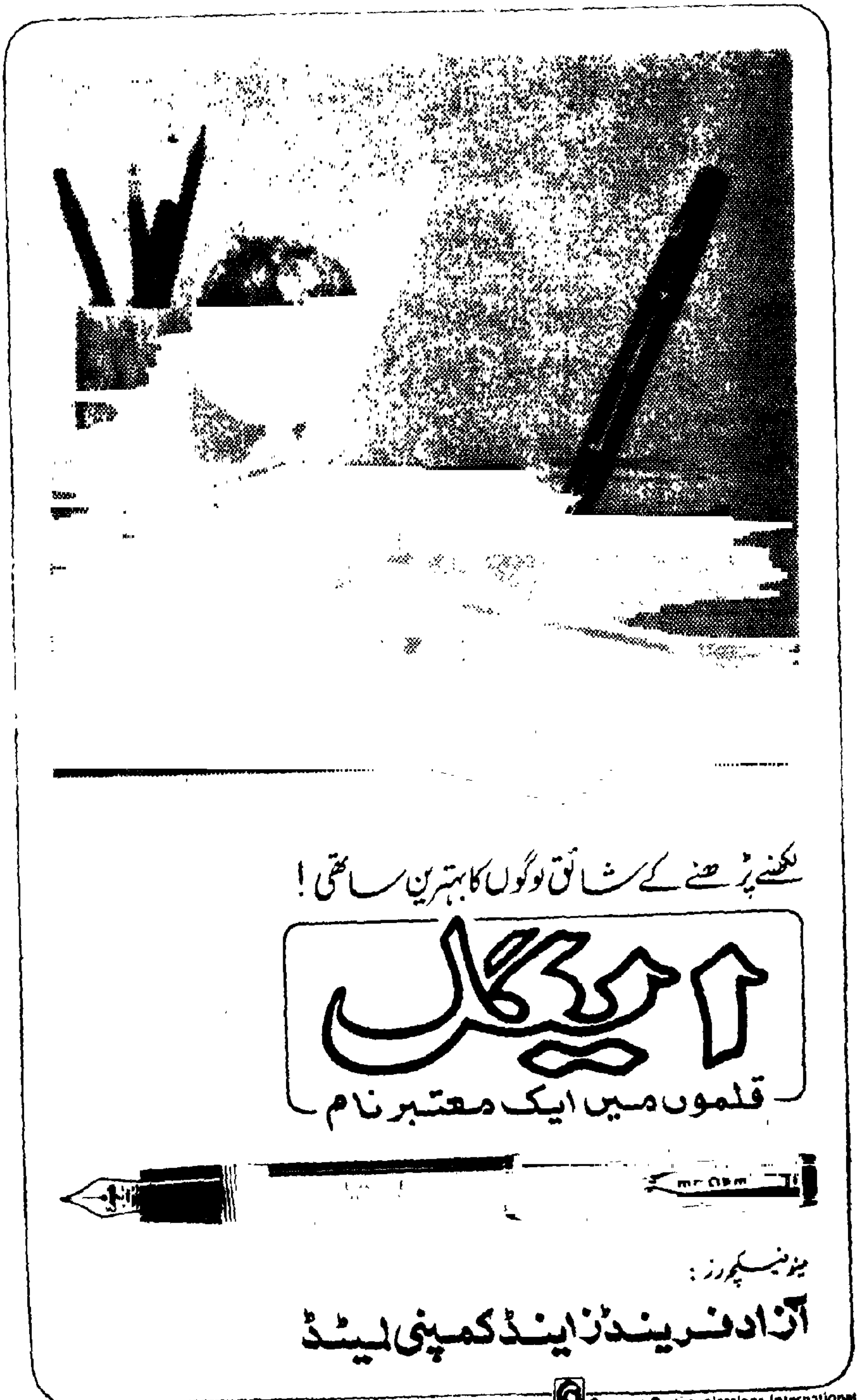
" ہاں ، کئی بار تو بتا چکا ہوں ۔"

" ایک بار پھر بتاؤ ۔"

"لالہ پر کچھ اثر نہ ہوا تو ڈاکٹر پہلے تو سٹپٹا سا گیا لیکن تھوڑی دیر سوچ کر ویسے ہی سکون سے مسکرانے لگا اور بولا، انھیں ہوش میں لانے کا اب یہی ایک طریقہ ہے کہ انجکشن لگا کر انھیں سچ مچ بے ہوش کر دوں۔"

"ہنہ ہاہ ـــــ! اور پانچ گھنٹوں کی اس بے ہوشی کا اثر ٹوٹتے ہی لالہ ہوش میں آ گئے۔"

"ہاں، یہی تو بات ہے۔ کوئی چکر ہی نہ ہو تو آدمی اس چکر سے باہر کیسے نکلے؟"


لکھنے پڑھنے کے شائق لوگوں کا بہترین ساتھی!
ایگل
قلموں میں ایک معتبر نام
مینوفیکچررز :
آزاد فرینڈز اینڈ کمپنی لمیٹڈ



۷۸۶

مظہر الاسلام

شام اترنے میں ابھی کچھ وقت باقی ہے تھکاہارا سورج سامنے بڑی عمارت کے اوپر والے فلیٹوں میں دن بھر کی بچی کھچی روشنی سمیٹ رہا ہے ہواؤں میں جاتی گرمیوں کی ٹھنڈی شام کا ذائقہ رچا ہوا ہے بوڑھا ڈاکیا تیز تیز قدم اٹھاتا گھر لوٹ رہا ہے اس کی پگڑی کے بل ڈھیلے ہو گئے ہیں اور چپل کی گھسی ہوئی ایڑیوں کے کیل زمین سے لگ کر گھر گھر کی آوازیں چھوڑتے ہیں ڈاکیئے کا ایک کندھا کچھ جھکا ہوا ہے اس لئے کہ اس کے سہارے چمڑے کا بیگ لٹک رہا ہے ایک ہاتھ میں دو تین خط ہیں جو اس کے ہاتھ کا حصہ معلوم ہوتے ہیں اور یوں احساس ہوتا ہے جیسے وہ پیدا ہوا تو اس وقت بھی یہ خط اس کے ہاتھ میں تھے۔ ڈاکیئے کے قدموں کی گھر گھر اب خاصی دور چلی گئی ہے۔ اب لوگ کم اور آوازیں زیادہ ہیں شریر اور معصوم آوازوں کے جتھے کانوں کے گرد چہل قدمی کر رہے ہیں ایک لمبی چیخ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر گزری ہے سائیکل کی گھنٹی نے ٹیلیفون کی گھنٹی کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ بچے کی آواز نے ادھیڑ عمر مرد کی آواز کا کوا چک لیا ہے۔ کار کی آواز ریڑھے کے نیچے آ گئی ہے کنڈکٹر کی وسل ڈبل ڈیکر کے پہیوں کے نیچے آ گئی ہے اور اس کی آواز مر گئی ہے۔ شہر کو ہچکی لگی ہوئی ہے اور کالے سیاہ گدھ سونگ کے سر پر ٹھونگیں مار رہے ہیں۔

سامنے بڑی عمارت کے نیچے والے فلیٹ کی بالکونی میں ایک عورت لمبے بال جھٹک جھٹک کر سکھا رہی ہے اسے صبح ہی نہا لینا چاہیئے تھا لیکن وہ اب نہائی ہے اور ابھی تھوڑی دیر بعد پھر نہانے والی ہو جائے گی وہ بالوں میں انگلیاں ڈال کر انہیں جھٹکتی ہے اس کا ابھرا ابھرا جسم بری طرح تھر تھرایا ہے جیسے دودھ سے بھرے ہوئے ڈولے جھٹکا لگا ہو۔ قطرے میرے چہرے پر گرے ہیں میں نے رومال سے منہ صاف کر لیا ہے اب وہ بالوں کی الجھنیں کھول رہی ہے اس کا چہرہ پوری طرح نظر نہیں آ رہا لیکن اس کے تیز تیز چلتے ہاتھوں کی بے چینی سے انتظار ٹپکتا ہے۔ پیچھے اندھیرے کمرے کی دیوار پہ کلاک کی چمکتی سوئیاں تیز تیز حرکت کر رہی ہیں نیچے مینٹل پیس پر کچھ اور چیزیں بھی چمک رہی ہیں جنہیں پہچاننا مشکل ہے۔

ساتھ والے فلیٹ کے دونوں کمروں میں بتی جل رہی ہے۔ ایک بچہ بری طرح رو رہا ہے اور اس کی ماں بلب کے گرد منڈلاتے ہوئے پتنگے دکھا کر اسے بہلانا چاہ رہی ہے۔ ایک لڑکی جو رونے والے بچے کی بہن ہے باورچی خانے میں پکتی ہنڈیا کی دھیا چکھ رہی ہے۔ مینٹل پیس پر کپڑے کے دو خرگوش ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے ہیں۔ بچہ ابھی تک رو رہا ہے۔ اس کے رونے کی آواز نے بالکونی سے چھلانگ لگا دی ہے۔ اور کچھ دوسری آوازیں اس کے گرد جمع ہو گئی ہیں۔

اس عمارت میں کئی فلیٹ ہیں۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، دس، بیس، اکیس، بائیس، تیس اور ایک آدھ اوپر۔ دوسری منزل کے کونے والے فلیٹ میں ایک لڑکی سامنے کمرے میں تخت پوش پر بیٹھی فریم گھٹنوں پر رکھے پھول کاڑھ رہی ہے۔ اس کی ماں ذرا پرے ہٹ کر بیٹھی کچھ چھیل رہی ہے۔ غور سے دیکھو تو پتہ چلتا ہے۔ آلو ہیں۔ پلنگ پہ ایک ادھیڑ عمر آدمی انگریزی اخبار پڑھ رہا ہے اوپر کے فلیٹ سے ایک عورت رسی سے بندھی ٹوکری نیچے لٹکاتی ہے۔ بالکونی میں لہراتی ہوئی ٹوکری دیکھ کر آلو چھیلنے والی عورت آلو چھوڑ کر بالکونی میں آتی ہے۔ تھوڑا سا باہر کی طرف جھکتی ہے اور منہ اوپر اٹھا کر ٹوکری لٹکانے والی عورت کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ پیاز مانگ رہی ہے۔ آلو چھیلنے والی عورت اندر جا کر دو پیاز لائی ہے اور اب ٹوکری میں رکھ رہی ہے۔ ٹوکری آہستہ آہستہ اوپر اٹھنا شروع ہو گئی ہے۔

ساتھ والے فلیٹ میں الماریاں کتابوں سے بھری پڑی ہیں۔ اور بے شمار اخبار ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔ پنکھا تیز سپیڈ پر ہے۔ اور ٹیوب لائٹ گرد آلود فضا میں لرز رہی ہے۔ کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا۔ سامنے دیوار پر لگی تصویر کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ کسی نے چھپکلی کو فریم کروالیا ہے یوں بھی اس فلیٹ میں چھپکلیاں بہت ہیں جو لفظوں کو کیڑے سمجھ کر ان کے گرد منڈلا رہی ہیں۔ اس وقت ایک چھپکلی ٹیوب لائٹ کے نیچے کیلنڈر کی کسی تاریخ کے ہندسے کو اچکنے کے لئے داؤ لگا بیٹھی ہے۔ ایک الماری پر پھر رہی ہے۔ اور دوسری الماری سے ذرا پرے اپنے جسم کا پچھلا حصہ دیوار کے ساتھ اور اگلا حصہ اوپر اٹھائے کسی تاک میں ہے۔

ساتھ والے فلیٹ میں بھی ایک بچہ رو رہا ہے۔ اوپر والے فلیٹ کی بالکونی سے ایک لڑکی خطرناک جسم خطرناک حد تک نیچے لٹکا کر پوچھتی ہے "کیا ہوا منے کو؟" منے کی ماں اپنی بالکونی میں آکر اوپر والی بالکونی پر جھکی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر کہتی ہے "کچھ نہیں چھری سے کھیلتا تھا۔ میں نے سوچا ہاتھ کاٹ لے گا۔ واپس لی۔ تو بگڑ گیا۔" لڑکی بالکونی سے پرے ہٹ گئی ہے۔ بڑا سجا ہوا فلیٹ ہے کوئی بھی گھر کا سامان دیکھ لے تو اسے اندازہ ہو جائے کہ اللہ کا فضل ہے۔ گھر کی بڑی عورت فرج سے کچھ نکال رہی ہے۔ بڑی محتاط اور کنجوس عورت ہے۔ ابھی دن بھر کا حساب کرے گی اور سونے سے پہلے سب دروازے اور تالے اپنے ہاتھوں سے بند کرے گی۔

درمیان والے فلیٹ میں کافی چہل پہل ہے۔ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ گھر ہر سائز کے مردوں، عورتوں اور بچوں سے بھرا پڑا ہے۔ ایک مہمان عورت زیورات سے لدی ہوئی ہے۔ دوسری عورتیں کبھی کبھی چور نگاہوں سے اس کے گلوبند دیکھتی ہیں۔ وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر باتیں کرتی ہے۔ تو سونے کے کنگن آپس میں بجتے ہیں۔ خاصے بے پروا لوگ ہیں۔ اس گھر کی عورت تو اکثر رات کو دروازہ بند کرنا بھی بھول جاتی ہے۔ چوروں کے لئے یہ گھر بڑا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ پر جانے کیوں کسی چور کی آج تک اس گھر پر نظر نہیں پڑی۔ بچوں نے آفت مچا رکھی ہے۔ ایک نے دوسرے کی قمیص پھاڑ دی ہے۔ اور اب دونوں ایک دوسرے کو نیچے گرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک لڑکا اٹھ کر انہیں چھڑانے لگا ہے۔ لیکن وہ تو جیسے ایک دوسرے سے چپک کر رہ گئے ہیں۔

اوپر فلیٹ کی بالکونی میں ایک اونچے قد کی بکری تھوتھنی اٹھائے میری طرف دیکھے جا رہی ہے کمرے میں ایک ٹیوب اور زیادہ طاقت کا بلب بھی روشن ہے چھتی پر چپاتے ہوئے برتن سجے ہیں عورت چارپائی پر کھڑی ہوئی چھتی پر رکھے پیالے میں اپنے کانٹے رکھ رہی ہے۔ "وہ ..... ارے اس کا ہاتھ مولی کنڈے (کدو کش) سے ٹکرایا ہے۔ مولی کنڈا پرات سے

لگا ہے ۔ اور دھن ۔ دھڑ ۔ دھڑ پرات چارپائی کے پائے پر لگ کر فرش پر دور تک لڑھکتی چلی گئی ہے ۔ اور کرسی کے نیچے دو تین ہیرے نیکر زمین سے چپک گئی ہے ۔ مرد جلدی سے پرات پکڑنے کے لئے اٹھا ہے ۔ اب اس نے پرات اٹھالی ہے اور چارپائی پر چپ کھڑی عورت کی طرف دیکھ رہا ہے اس کی گردن اذان دیتے ہوئے مرغ کی طرح اکڑی ہوئی ہے ۔

ساتھ والے فلیٹ کی بالکونی میں تین پنجرے لٹکے ہوئے ہیں ایک میں طوطا ۔ دوسرے میں رنگین چڑیاں اور تیسرے میں خرگوش ہیں ۔ طوطا چپ ہے مگر چڑیوں کی چوں چوں سارے گھر میں پھدکتی پھر رہی ہے ۔ عورت لیٹی ہے اور مرد اس کے کان میں دوائی ڈال رہا ہے ۔ اب وہ پیچھے ہٹ گیا ہے عورت نے اٹھ کر دوائی اس کے ہاتھ سے لی ہے ۔ اس کی آنکھیں حیرت سے تن گئی ہیں اور اب وہ کان میں انگلی ڈال کر مرد سے جھگڑ رہی ہے ۔ مرد نے اس کے کان میں کف سیرپ (COUGH SYRUP) ڈال دیا ہے ۔

اسی فلیٹ سے آگے کونے والے فلیٹ کی بالکونی میں چڑیوں اور جنگلی کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں ۔ یہاں سے ابابیلوں کا گھونسلا بھی نظر آ رہا ہے "لو وہ ایک ابابیل گھونسلے سے نکل کر فضا میں بلند ہو گئی" کسی نے کمرے کا پردہ کھینچ دیا ہے ۔ لیکن کھڑکی میں سے ایک تصویر صاف نظر آ رہی ہے ۔ چلیئے ۔ بتی بھی بجھ گئی لیکن پردے کے پیچھے حرکت کرتے سائے واضح دکھائی دے رہے ہیں ۔

اس فلیٹ اور اس سے اوپر والے فلیٹ کے درمیان دیوار میں ایک پیپل اگا ہوا ہے پیپل کے ساتھ سوراخ ہے جس میں جنگلی کبوتروں کا گھونسلہ ہے ۔ اس وقت کبوتری گھونسلے میں اور کبوتر پیپل پر بیٹھا چونچ سے پروں میں خارش کر رہا ہے ۔

اوپر والے فلیٹ میں گھر کے سب لوگ مل کر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں ۔ لیکن سالن تھڑ گیا ہے اور سب سے چھوٹا بچہ پلیٹ ہاتھ میں پکڑے مزید سالن کے لئے بار بار ماں کے گھٹنے سے ٹکرا رہا ہے باپ آخری برکی سے پلیٹ صاف کر رہا ہے ۔ ماں نے بچے کو گود میں اٹھا لیا ہے ۔ اور چینی کا ڈبہ لینے باورچی خانے میں گئی ہے ۔

ساتھ والے فلیٹ میں مینٹل پیس پر ایک تصویر پڑی ہے جس کے قریب ریڈیو رکھا ہے ۔ کلی پر بستہ ٹنگا ہے ۔ آدھا پردہ نیچے لٹک رہا ہے ۔ بوڑھی اماں اپنا بٹوہ تھیلی میں ڈال رہی ہے ۔ بوڑھی اماں نے صندوقوں میں بھی بہت کچھ چھپا کر رکھا ہے جن کی چابیاں وہ اپنے ازاربند کے ساتھ باندھ کر رکھتی ہے ۔ اب وہ نماز پڑھنے کے لئے جا نماز ڈھونڈ رہی ہے ۔

یہ رونے کی آواز اس سے اوپر والے فلیٹ سے آ رہی ہے ۔ رونے والی عورت یہاں سے صاف دکھائی نہیں دیتی ۔ اس نے اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپا رکھا ہے ۔ گھر میں دوسرا کوئی نظر نہیں آتا ۔ گلدان میں بڑے بڑے سرخ پھول سجے ہیں ۔ جن کی سرخی پورے گھر میں پھیلی ہوئی ہے ۔ یہاں بھی وہی تصویر دیوار پر لگی ہوئی ہے ۔ جو دوسرے فلیٹوں میں بھی تھی ۔

ساتھ والے فلیٹ میں کمرے کے سامنے دیوار پر چیونٹیوں کی قطار چھت کو جا رہی ہے ۔ نئی نئی سفیدی ہوئی ہے اس لئے چیونٹیوں کی قطار گہرے رنگ کی لکیر لگ رہی ہے ۔ بچہ ایک ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا اور دوسرے ہاتھ میں امرود اٹھائے بڑے غور سے چیونٹیوں کی قطار کو تک رہا ہے اب اس کی ماں بھی آ گئی ہے اور وہ اسے جانگیہ پہنانے کے لئے جھکی ۔ باپ ادھر بالکونی میں آ گیا ہے اور سگریٹ سلگا رہا ہے ۔ مینٹل پیس پر دھلا ٹیبل لیمپ چمک رہا ہے جو صرف خوبصورتی کے لئے ہوتا ہے اور جس میں مچھلیاں تیرتی ہیں ۔ دیوار پر لگے کلاک کی ٹک ٹک میرے دل کی دھڑکنوں میں گھونسلا بنا رہی ہے ۔

ساتھ والے فلیٹ میں کتا بالکونی پر اگلی ٹانگیں رکھے تیز تیز بھونک رہا ہے ۔ اندر ایک نوجوان ٹیبل لیمپ کے قریب جھکا کچھ پڑھ رہا ہے ۔ اس کی بہن دودھ کی پیالی میں چمچ ہلاتی اس کی طرف آ رہی ہے دیوار پر اخبار سے کاٹی ہوئی چھوٹی

بڑی تصویریں بے ترتیب چپکی ہوئی ہیں۔ اور بڑی خوبصورت لگ رہی ہیں۔ ان میں پہلے فلیٹوں والی تصویر بھی ہے۔ کتے کی غراہٹ میری زبان تلے آگئی ہے۔

اوپر والا فلیٹ خاصا سجا ہوا ہے انگیٹھی پر پھول بنا رکھے ہیں جس پر ہاتھی گھوڑے، شیر ببر شیر، ہرن، اژدھر۔ گینڈے اور جانے کیا کیا سجا ہوا ہے۔ مجھے اپنا آپ ان جانوروں میں گھرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ میں مینٹل پیس پر ادھر ادھر بھاگتا ہوں شیر سے جان چھڑاتا ہوں تو سامنے ہاتھی آجاتا ہے۔ ہاتھی سے بھاگتا ہوں تو چیتا راہ روک لیتا ہے۔ میری سانس پھول گئی ہے اور ٹانگیں کھڑے کھڑے کانپنے لگی ہیں۔

ساتھ والے فلیٹ میں شیر کی کھال اور بوڑھے مرد کی بندوق لٹک رہی ہے جواب صرف ڈیکوریشن پیس بن کر رہ گئی ہے ایک نوجوان آرام کرسی پر نیم دراز کچھ سوچ رہا ہے ابھی ایک ادھیڑ عمر مرد ساتھ والے کمرے سے نکلا ہے اور باتھ روم میں گیا ہے بیڈ روم کی کھڑکی ادھ کھلی ہے۔ اور اندر ایک عورت بستر کی چادر تبدیل کر رہی ہے۔

اوپر والے فلیٹ کے سارے کمروں کی بتیاں بجھی ہیں۔ اندھیرا اندھیرے کی کلائی پکڑے طاقت آزمائی کر رہا ہے سونے کے کمرے میں ہلکی بتی جل رہی ہے اور وہ دونوں — بتانے کی بات نہیں — بس وہ دونوں — پرندوں کی لڑائی دیکھ رہے ہیں۔

ساتھ والے فلیٹ والے سو چکے ہیں۔ ہلکی ہلکی روشنی میں بلی چھکے میں رکھا دودھ پی رہی ہے ننھی کی گڑیا اوندھے منہ میز پر پڑی ہے۔ ایک سایہ سونے والے کمرے سے نکل کر بیٹھنے والے کمرے کی طرف گیا ہے۔

اسی ترتیب کے کونے والے فلیٹ میں دادی اماں بچوں کو کہانی سنا رہی ہے دادی اماں کا ہاتھ سب سے چھوٹے بچے کو تھپک رہا ہے۔ پاس بیٹھے نوجوان نے سر اٹھا کر "گھوڑوں کے شہر میں اکیلے آدمی" والی کہانی کے کسی حصے کی وضاحت طلب کی ہے اور دادی کا جواب سن کر پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا ہے۔ بڑا بچہ کان دادی کی طرف لگائے سرہانے پر کڑھے ہوئے طوطے اور شیر کے دھاگوں سے کھیل رہا ہے۔

اوپر والے فلیٹ میں گھپ اندھیرا ہے۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ کیونکہ یہ سب سے اوپر والی ترتیب کا درمیان والا فلیٹ ہے اس لیئے اس کی پیشانی پر بلب کے نیچے "۸۶" لکھا ہوا صاف نظر آرہا ہے۔

ساتھ والے فلیٹ کا کونہ کچھ شکستہ سا نظر آرہا ہے۔ اور اس کی اینٹیں آگے آگے سے بھر گئی ہیں۔

کونے والے فلیٹ میں مکمل اندھیرا ہے۔ اور ایک طرف سے اس کی کچھ اینٹیں نکلی ہوئی ہیں۔ اور کچھ بھر گئی ہیں کچھ اور جگہوں پر بھی ایسے ہی نشانات ہیں۔ شاید اس عمارت کو بھی سٹون کینسر (STONE CANCER) ہو گیا ہے۔ اب ساری عمارت اندھیرے میں ڈوب گئی ہے۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ کلاک کی ٹک ٹک میرے دل کی دھڑکنوں میں گھونسلہ بنا رہی ہے۔ میری نظریں ایک اندھیری بالکونی سے دوسری اندھیری بالکونی میں پاؤں رکھتی نیچے اترتی ہیں۔ اندھیرا ——— کالا سیاہ اندھیرا — کلاک کی آواز ایک بجاتی ہے۔ عمارت کے عقب سے میرے ساتھی نمودار ہوتے ہیں۔ وہ سامان سے لدے ہوتے ہیں۔ چوری کی واردات بڑی کامیاب رہی ہے۔ لیجئے ہم چلے۔ اب عمارت جانے یا عمارت والے۔

●
●



زیتون کی ایک شاخ

زاہدہ حنا

بوندیں چمپا کی خوشبو پر، کامنی کی رنگت پر اور مٹی کی پیاس پر برس رہی ہیں۔ کمرے کے اندر بھولے بسرے گیتوں کے بول بکھرے ہوئے ہیں۔ مینہ کی بوندیں اور گیتوں کے بول کھرنڈ جمے ہوئے زخموں پر برستے ہیں تو زخم جیسے کھل اٹھتے ہیں۔

بوندیں برس رہی ہیں اور زخموں کے گلاب کھلے ہیں، ان گلابوں کی شاخوں پر ابھرے ہوئے نوکیلے کانٹے یاد کی انگلیوں میں چبھتے ہیں تو نہ کچھ سوچنے کو جی چاہتا ہے اور نہ کرنے کو۔ میں الجھ کر میز پر رکھا ہوا "پاکستانی ادب" اٹھاتی ہوں، یہ اس کا "امریکی ادب نمبر" ہے۔ میں اس کی ورق گردانی کرنے لگتی ہوں، میں صفحوں پر صفحے پلٹتی ہوں، پھر میری نگاہیں ایک صفحے پر رک جاتی ہیں۔

اور تب یاد کی انگلیاں وقت کی بند مٹھی میں پھڑپھڑاتے ہوئے لمحوں کے ان پرندوں کو محسوس کرنا چاہتی ہیں جو موجود کی شاخ سے اڑے اور ناموجود کی طرف پرواز کر گئے۔ لمحوں کے یہ پرندے وقت کی بند مٹھی میں تڑپتے ہیں اور اب یہ کبھی مائل بہ پرواز نہ ہوں گے۔ لیکن یاد کی انگلیاں ان کے وجود کی گرمی اور خوشبو اور ان کے بدن کی کپکپاہٹ کو محسوس کرنا چاہتی ہیں۔ یاد کے ہونٹ ان ناموجود پرندوں کے بدن پر اپنے ہونٹ رکھنا چاہتے ہیں۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ میں نے لکھتے لکھتے نگاہیں اٹھا کر دیکھا تھا۔ شیشے کی بلند و بالا دیوار کے ادھر مینہ کا جھالا برس رہا تھا اور بارش کے بہت سے قطرے اس شفاف دیوار پر اس طرح رکے ہوئے تھے جیسے وہ شیشے کی دیوار نہ ہو دیوار گریہ ہو۔

سامنے ذرا فاصلے پر بنے ہوئے گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس کا سرسبز لان، پھولوں کے بوجھ سے جھکتے ہوئے پودے اور آتشیں رنگ کلیوں سے ڈھکے ہوئے درخت مجھے صاف نظر آرہے تھے۔ یہ سب کچھ تھا لیکن پیاسی زمین اور مینہ کے وصال کی آنچ اور خوشبو کہیں نہیں تھی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں اپنے گھر کے آنگن میں نہیں، امریکن کونسلیٹ کے اسنیک بار میں بیٹھی ہوئی تھی اور کونسلیٹ از فرش تا عرش ایئرکنڈیشنڈ تھا۔ شیشے کی ان دیواروں کے پیچھے سے میں اڑتے ہوئے بادل، مینہ کے جھالے اور سڑک پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پانی کو دیکھ تو سکتی تھی لیکن محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ پیاسی مٹی کی سوندھی خوشبو کے اور میرے درمیان یہ شفاف دیواریں حائل تھیں۔

اس لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں شیشے کے ایک بلند و بالا محل میں مقید ہوں جہاں قدم قدم پر نیلی آنکھوں والے سفید دیو پہرا دیتے ہیں۔ اس احساس کے ساتھ ہی میں بے چین سی ہو گئی۔

ٹھنڈی کافی کا ایک گھونٹ لے کر میں نے ایک بار پھر لکھنے میں مصروف ہونا چاہا لیکن چند لمحوں میں مجھے احساس ہو گیا کہ خیال کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے اور ذہن میں پگھلتے ہوئے، نت نئے سانچوں میں ڈھلتے ہوئے الفاظ اچانک میری گرفت سے نکل گئے ہیں۔ میں نے بے بسی کے عالم میں اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں پر نظر ڈالی، کتنے خوش و خرم چہرے اور کیسے تمتماتے بدن یہاں آباد تھے۔

برابر کی میز پر بیٹھے ہوئے لڑکوں نے کسی بات پر زور کا قہقہہ مارا اور ان ہی پر کیا منحصر تھا، اسنیک بار میں تو ہر طرف قہقہوں کی دھنک نکلی ہوئی تھی۔ کل رات ویتنام جانے والا امریکی بحری جہاز کراچی کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا تھا اور آج صبح سے ہی کونسلیٹ کی راہداریوں میں بھانت بھانت کے امریکی لڑکے نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ میرین یونیفارم میں تھے اور بعض امریکن آرمی کی وردی پہنے ہوئے تھے، بعض ایسے بھی تھے جو شوخ رنگ کی قمیصوں اور نیکروں میں تھے۔ یہ سب لڑکے جن کی ابھی کھانے کمانے کی عمریں تھیں اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ایک ایسی جنگ لڑنے جا رہے تھے جو ان کی اپنی جنگ نہ تھی۔

میں نے ان لڑکوں کے چہروں پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ یہ ہنستے کھلکھلاتے چہرے نجانے کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتاریں گے اور ان میں سے نہ جانے کتنے خود بھی خاک و خون میں لپٹے ہوئے موت کی نیند سو جائیں گے۔ ایک لمحے کے لئے دکھ کا سایہ میرے ذہن کے افق پر لہرایا اور پھر گم ہو گیا۔

لیکن یہ سب کچھ خود ان کا انتخاب تھا، پھر اس انجام پر دکھ کیسا؟ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ انھیں انسانوں کے کسی گروہ کو کچلنے کا بھلا کیا حق پہنچتا ہے؟ میں نے سوچا اور میری نگاہوں میں وہ تمام تصویریں گھوم گئیں جو ہر دوسرے تیسرے اخباروں اور رسالوں میں چھپتی تھیں۔ شمالی ویت نامیوں کی لاشوں پر قہقہہ لگاتے ہوئے امریکی فوجیوں، ماؤں سے بچھڑے ہوئے ننھے بچوں اور نیپام بموں سے جھلسے ہوئے چہروں کی تصویریں ــــ اُنہی دنوں برٹرینڈ رسل کی مشہور کتاب ویت نام میں جنگی جرائم کا اردو ترجمہ چھپا تھا۔ میں نے اس کتاب کو کئی مرتبہ پڑھا تھا اور ہر مرتبہ میری آنکھیں اشکبار ہوئی تھیں اور ہر مرتبہ میرے دل میں اس بوڑھے فلسفی کے لئے محبت کے اور عقیدت کے سوتے اُبلے تھے۔ یہ شخص مجھ جیسے کمزور انسانوں کے لئے منارۂ نور کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ شخص جو مذہب، رنگ، نسل اور زبان کی تفریق سے بلند ہو کر سوچتا تھا۔ رسل کا خیال آتے ہی میری نظروں کے سامنے اس بدھ بھکشو کی تصویر گھوم گئی جس نے امریکی جارحیت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنے آپ نذر آتش کر دیا تھا۔ زندگی دنیا کے تمام انسانوں کو کس قدر محبوب تھی لیکن مہاتما بدھ کے اس ماننے والے نے دوسروں کے لئے جینے کا حق طلب کرتے ہوئے اپنی زندگی بھینٹ کر دی تھی۔ یہ مشہور اور یہ گمنام لوگ کتنے بڑے تھے، کیسے بلند و بالا تھے۔

اور یہ سب کچھ سوچتے ہوئے مجھے اپنے حال پر ہنسی آ گئی۔

کتنی عجیب سی بات ہے کہ امریکی کونسلیٹ میں ملازم ہوں، وائس آف امریکہ کی اردو سروس میں پروگرام پروڈیوسر اور اسکرپٹ رائٹر ہوں، دن رات پاکستان کو ملنے والی امریکی امداد کے بارے میں فیچر لکھتی ہوں اور ان سب باتوں کے باوجود امریکیوں کی ہر بات سے اختلاف کرتی ہوں، ان کے ہنستے ہوئے چہروں کو دیکھ کر میرے وجود میں جیسے زہر گھل جاتا ہے۔

میں نے پچھلے ایک برس میں امریکی امداد، امریکی عظمت اور امریکی نقطۂ نظر کے بارے میں نہ جانے کتنے اسکرپٹ لکھے تھے اور کیسے نہ لکھتی۔ حکومت امریکہ ان بے معنی اور بے روح باتوں کو دلنشیں انداز میں لکھنے کی منہ مانگی قیمت ادا کرتی تھی۔ میں اکثر سوچتی کہ آئیڈیل، آدرش، خواب ــــ یہ سب کتنے خوبصورت اور دلآویز الفاظ ہیں لیکن روپیہ جو کہ محض مایا ہے اور ہر عہد

میں لعنت قرار دیا گیا ہے، وہی دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ خواب پیسے کے بغیر نہیں خریدے جا سکتے، آدرش کی باتیں بھوکے پیٹ اور ننگے تن زیادہ دنوں تک نہیں چلتیں۔

کبھی کبھی میرا جی چاہتا کہ اپنے تمام اسکرپٹ کسی امریکی افسر کے منہ پہ مار کر بھاگ جاؤں اور پھر کبھی پلٹ کر اس شیش محل کا رخ نہ کروں لیکن پھر مجھے خیال آتا کہ اپنے نقطۂ نظر کی خاطر مجھے ان لوگوں کو سزا دینے کا بھلا کیا حق پہنچتا ہے جن کا انحصار صرف میری ذات پر ہے اور جو بہت بے بس، بہت مجبور ہیں۔ مجبوری اور بے بسی کا یہ کتنا عجیب دائرہ تھا جس کے گرد ہم سب بے تکان چکر کاٹ رہے تھے لیکن جس سے باہر نکل جانا، جس سے فرار حاصل کرنا ہم میں سے کسی کے بس کی بات نہ تھی ـــ لیکن شاید بات صرف اتنی سی تھی کہ میں نے اپنی کمینگیوں کو چھپانے کے لئے دوسروں کا بہانہ ڈھونڈھ لیا تھا۔ میں کس قدر کمزور، کتنی بے بضاعت اور کیسی حقیر تھی۔ میری آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔

میں نے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات کو دیکھا جن میں سے کچھ سادہ تھے اور کچھ میری تحریر سے بھر کر ہوئے تھے۔ یہ دراصل SAUL BELLOW ساؤل بیلو کی کہانی THE GONZAGA MANUSCRIPT کی ریڈیائی تشکیل تھی جسے مجھے دوپہر تک مکمل کرنا تھا۔ اور اسی لئے میں صبح ہی صبح اسنیک بار میں چلی آئی تھی کہ یہاں بیٹھ کر کافی پیوں گی اور اسکرپٹ پہ کام کروں گی لیکن اب خیال کی رَو بہک کر نہ جانے کہاں نکل گئی تھی اور میں بالکل خالی الذہن ہو گئی تھی۔

امریکی لڑکے اپنی عادت کے مطابق زور زور سے باتیں کر رہے تھے اور شور مچا رہے تھے، ابھی تو یہ آفت چار دن تک مسلط رہے گی۔ میں نے بیزاری سے سوچا۔ صبح میں جیسے ہی اسنیک بار میں داخل ہوئی تو مسز شیرازی نے باہر نکلتے ہوئے مجھے یہ مژدۂ جانفزا سنایا تھا۔ وہ بہت خوش تھیں کیونکہ اس طرح جہاز پر موجود کچھ نئی اور غیر سنسر شدہ فلمیں کونسلیٹ میں کام کرنے والے دیکھ سکیں گے۔

میں نے آگے کی طرف جھک کر نیچے دیکھا۔ سفید ٹائلوں والے تالاب کے کنارے چھلکے پڑتے تھے اور اس پر برستے ہوئے مینہ کے قطروں سے جابجا حباب بن رہے تھے اور ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ موسم بہت دنوں بعد اتنا خوبصورت اور اس قدر ظالم ہو گیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں شہر کی سڑکوں پہ بارش میں بھیگتی ہوئی چلتی رہوں یہاں تک کہ سمندر کے کنارے جا پہنچوں اور وہاں اُس بے چین و بے قرار پانی کو دیکھوں جو نہ جانے کن شہروں اور ویرانوں کو چھوتا ہوا یہاں تک آتا ہے۔

"اکسکیوز می" کسی نے مجھے مخاطب کیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا ایک لمبا تڑنگا امریکی لڑکا ایک ہاتھ میں بیر کا ٹن اور دوسرے ہاتھ میں برف کی ڈلیوں سے بھرا گلاس تھامے کھڑا تھا۔

"دراصل یہاں اس نشست کے سوا کوئی اور جگہ خالی نہیں ہے" اس نے ذرا شرمندہ سے لہجے میں میز کے گرد پڑی ہوئی دوسری خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے کوفت سی ہوئی لیکن پھر خیال آیا کہ میں تو اب یہاں سے اٹھنے ہی والی ہوں پھر یہاں کوئی بھی بیٹھے مجھے کیا۔ میں نے میز پہ بکھرے ہوئے کاغذات اور ساؤل بیلو کی کہانیوں کا مجموعہ سمیٹ کر ایک طرف کر دیا اور وہ لڑکا شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"تم کونسلیٹ میں کام کرتی ہو؟" اس نے سنہرے رنگ کی بیر شفاف گلاس میں انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"میں وائس آف امریکہ کی اردو سروس میں پروگرام پروڈیوسر ہوں"۔

"اچھا!" اُس نے کچھ اس طرح کہا جیسے اسے یہ سنکر قدرے حیرت ہوئی ہو۔ میں نے اُسے تیز نظروں سے دیکھا وہ سمجھ گیا کہ میں نے اس کے لہجے کی حیرت کو پسند نہیں کیا۔ "دراصل مجھے پاکستانی لڑکیوں کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں" اُس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"ایشیا کے بارے میں امریکیوں کو واقعی کچھ زیادہ معلوم نہیں" میری زبان سے بے اختیار ایک طنزیہ جملہ پھسل گیا جسے سنکر وہ خوش دلی سے مسکرایا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر چھائی سنجیدگی چند لمحوں کے لئے مسکراہٹ میں چھپ گئی ہے۔

میں نے کاغذات اور کتاب سمیٹ کر اٹھنا چاہا تو اس نے اپنا ہاتھ میرے کاغذات پر رکھدیا "میرا مقصد تمہارے کام میں خلل اندازی نہیں تھا۔ تم اپنا کام مکمل کرلو۔"

"تمہارے یہاں بیٹھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اپنا اسکرپٹ اپنے کمرے میں بیٹھ کر مکمل کرلوں گی۔" میں نے کہا۔

"اگر تم یوں اٹھ کر چلی جاؤ گی تو مجھے شرمندگی ہوگی، اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ میں تنہا ہوں اس لئے تمہارے دس پندرہ منٹ کے ساتھ کو غنیمت سمجھوں گا۔" اس نے متانت سے کہا۔

"لیکن یہاں تمہارے اتنے بہت سے ساتھی موجود ہیں پھر تنہائی کا بھلا کیا سوال ہے۔" میں نے ان لڑکوں کی طرف اشارہ کیا جو چند لمحوں پہلے اندر داخل ہوئے تھے اور نشستیں خالی نہ ہونے کی وجہ سے کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے کوک یا بیئر پی رہے تھے۔

"ان لڑکوں میں میرا جی نہیں لگتا۔" اس نے آہستہ سے کہا اور بیئر کا گلاس اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ نہ جانے کس قسم کا انسان تھا میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کے سنہرے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ آنکھیں جھکائے بڑی سنجیدگی سے بیئر کے جھاگ کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ اور تب میں اپنی خواہش کے برخلاف وہاں سے نہ اٹھ سکی کیونکہ میرے اندر ایک نامعلوم سا جذبۂ تجسّس سر اٹھا رہا تھا۔۔۔ یہ لڑکا نوجوان تھا اور دنیا کی دولت مند ترین قوم کا ایک فرد تھا، اسکے سامنے شاندار مستقبل پھیلا ہوا تھا لیکن وہ محض اپنے ملک کے سیاستدانوں اور صنعتکاروں کی ہوس اقتدار کی تسکین کے لئے ایک ایسی سرزمین کی طرف جارہا تھا جہاں خون کا سمندر بہہ رہا تھا اور شاید اس کا گرم اور جوان خون بھی اس سمندر میں شامل ہونے والا تھا۔ تو کیا یہ لڑکا واقعی اداس تھا۔

"میرا نام ایڈگر کوپن ہے۔" اس نے بہت غیر متعلق سے انداز میں مجھے اپنا نام بتایا، پھر جب میں نے اسے اپنا نام بتایا تو اس نے خاص امریکی لہجے میں میرا نام زیرِ لب دہرایا۔ "خاصا مشکل نام ہے۔" وہ آہستہ سے ہنسا، پھر اسکی نظر میری خالی پیالی کی طرف گئی۔ "تمہاری کافی تو ختم ہوچکی ہے۔۔۔ اب تم کیا پیوگی؟" اس نے پوچھا اور پھر وہ میرے انکار کے باوجود کاؤنٹر سے کوکاکولا کا ڈبہ اور برف کی ڈلیوں سے بھرا ہوا گلاس لے آیا۔

پھر یوں ہوا کہ اُس صبح مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اس بات کا ادراک ہوا کہ امریکی بھی انسان ہوسکتے ہیں اور وہ بھی ہماری طرح جنگ، محبت، بے وفائی اور موت کے دکھ اٹھاتے ہیں۔

ایڈگر نے مجھے بتایا کہ وہ کلفورنیا کا رہنے والا ہے۔ اس نے کلفورنیا یونیورسٹی برکلے سے ساؤتھ ایشین اسٹڈیز میں ایم اے کیا تھا اور اب DRAFTING یعنی جبری بھرتی کے قانون کے تحت ویتنام جارہا تھا۔ وہ بیئر کا گھونٹ بھرتا رہا اور مجھے اپنے بارے میں بتاتا رہا۔ اُس نے باتیں کرتے کرتے جیب سے والٹ نکالا، چمڑے کے اس پرس میں اسکی ماں کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا

تھا۔ میں نے اس چھوٹی سی رنگین تصویر کو دیکھا۔ کھپریل کی چھت والے چھوٹے سے گھر کے سبزہ زار پر ایک بوڑھی امریکی عورت کھڑی تھی! اسکے بیشتر بال چاندی کے رنگ کے تھے اور چہرے پر دکھ اور تنہائی کے سائے پھیلے ہوئے تھے، یہ ایک شفیق اور محبت کرنے والی ماں کا چہرہ تھا جسکے اکلوتے بیٹے کو محاذ پر بھیج دیا گیا تھا۔ اس چہرے کی کوئی قومیت نہ تھی۔

"میرے ڈیڈی امریکن ایئر فورس میں تھے۔ جب کوریا کی جنگ شروع ہوئی انھیں محاذ پر بھیج دیا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے مما ہر شام چرچ جا کر ان کے لئے جیزز کرائسٹ اور ہولی مدر سے دعائیں کرتی تھیں اور شمعیں جلاتی تھیں۔ لیکن ان کی دعائیں کسی کام نہ آئیں۔ ہاں ایک دن ڈیڈ کے ختم ہونے کی خبر ضرور آ گئی۔ ان کے طیارے کو فضائی حملے کے دوران شمالی کوریا کے کسی گنر نے مار گرایا تھا۔ مما کا سوگوار چہرہ مجھے آج تک نہیں بھولتا۔ پھر مما بوڑھی ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ ان کے سر کے بال سفید ہوتے گئے۔ وہ مجھ سے چھپ کر راتوں کو روتی تھیں۔ انھیں ڈیڈ سے بہت محبت تھی اور ان کی شادی کو اس وقت صرف چھ سال ہوئے تھے جب ڈیڈ کوریا بھیج دیئے گئے۔ ہم نے انھیں ڈیڑھ سال سے نہیں دیکھا تھا۔ اور ہم نے تو ان کا آخری دیدار بھی نہیں کیا۔ ہم انھیں مہاگنی کے تابوت میں نہ لٹا سکے اور ان کا شادی کا سوٹ جوان کا کفن بنتا، وہ بھی رکھا رہ گیا۔ ڈیڈ کا تابوت کسی بمبار طیارے کا ڈھانچہ بنا اور ان کی یونیفارم ان کا کفن۔ پھر جب میں بڑا ہوا تو مما نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں کبھی فوج میں نہیں جاؤں گا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ مجھے جنگ سے اور خون سے نفرت تھی، جنگ میرے ڈیڈ کو اور ہماری مسرتوں کو نگل گئی تھی۔" اس کی آواز جیسے کانپ گئی۔

"مجھے تاریخ سے بہت دلچسپی ہے، تاریخ کی کتابیں مجھے بالکل کہانیوں کی طرح لگتی ہیں۔ تاریخ میں مجھے ہمیشہ 'A' گریڈ ملا، پھر جب میں نے ایم ایس کیا تو میں کسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہونے کا خواب دیکھتا تھا لیکن وہ خواب ہی کیا جو پورے ہو جائیں۔ اور اب مجھے خوابوں کی تعبیر یہ ملی ہے کہ میں کسی کالج میں طالب علموں کو تاریخ پڑھانے کی بجائے ویتنام جا رہا ہوں۔ وہاں لوگوں کو گولیوں کی زبان سکھاؤں گا۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی انگلیاں کاٹ کر پھینک دوں تاکہ میں کسی رائفل کی لبلبی دبانے کے قابل نہ رہوں، کبھی خودکشی کو جی چاہتا ہے پھر مجھے مما کا خیال آتا ہے۔ میں نہیں رہا تو وہ مر جائیں گی یا پھر شائد روتے روتے اندھی ہو جائیں گی۔ میں جہاز کے عرشے پر کھڑا ابھرتی سمندر کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا کہ سمندر میں کود جاؤں، لیکن پھر مجھے مما یاد آئیں، وہ میرے آنے سے پہلے بہت روئیں تھیں، میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کتنا روئی تھیں، اب معلوم نہیں ان کا کیا حال ہوگا۔" وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ اس کا گلاس خالی ہو گیا تھا اور پیر کا ٹن بھی۔

وہ مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے اپنے دکھوں کا مداوا پوچھ رہا ہو، جیسے اپنے زخموں کے لئے مرہم کا طلب گار ہو میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اس سے کیا کہوں، اُسے کس طرح دلاسہ دوں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ مجھے یہاں بیٹھے ہوئے بہت دیر ہو گئی ہے میں نے اسنیک بار کی کیشیئر مسز خان کی طرف دیکھا۔ وہ کیش رجسٹر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھیں اور میری طرف دیکھ رہی تھیں لیکن مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر انھوں نے فوراً نظریں چرالیں۔ میں کچھ بے آرام سی ہو گئی۔

"میں نے اپنی Morbid باتوں میں تمہارا بہت وقت ضائع کیا۔ حالانکہ تم کام کر رہی تھیں" ایڈگر کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

"تم نے قطعاً میرا وقت ضائع نہیں کیا اور نہ تمہاری باتیں Morbid تھیں۔ تمہارا احساس اور تمہاری تلخی بہت سچی ہے اس وقت جب تم باتیں کر رہے تھے تو مجھے ڈیوڈ مچل بہت یاد آیا۔ تم نے اس کا نام ضرور سنا ہوگا۔ اس نے ویت نام جانے اور فوجی خدمات انجام دینے سے انکار کر دیا تھا اور اب اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ ڈیوڈ زیادہ باہمت اور زیادہ بہادر تھا۔ اس نے نہ جانے کا فیصلہ کیا اور اب نہایت فخر سے اس کی سزا بھگت رہا ہے۔ تم کھل کر انکار نہ کر سکے، شائد سماجی دباؤ کی وجہ سے، لیکن کم سے کم یہ تو ہے کہ تم جنگ کو قابل نفرت جانتے ہو اور اس احساس کا عذاب سہہ رہے ہو۔ ورنہ بیشتر امریکی تو ابھی تک اپنی حکومت کے موقف کو درست سمجھتے ہیں۔ تم ڈیوڈ مچل نہیں ہو پھر

بھی بہت قابلِ قدر ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اس نے نگاہیں جھکالیں شاید وہ ڈیوڈ مچل کا نام سنکر شرمندہ ہوگیا تھا۔

"تم صحیح کہہ رہی ہو۔ میں جنگ سے نفرت کرتا تھا اس کے باوجود مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ویت نام جانے سے انکار کردوں اور دوسروں کے استہزا اور تمسخر کا نشانہ بنوں اور سرکاری دباؤ برداشت کروں میں بہت بزدل ہوں محض خواب دیکھنے والا ایک بےسُود وجود انسان اور کچھ بھی نہیں ہے" اس نے بہت دل گرفتہ لہجے میں کہا اور ایک لمحے کے لئے مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اس کے سامنے ڈیوڈ مچل کا نام کیوں لیا، اس کا ڈیوڈ سے موازنہ کیوں کیا؟

"میں نچلی منزل پر ۲۹ ایف میں بیٹھتی ہوں۔ تم اگر چاہو گھنٹے بھر بعد وہاں آجانا میں اتنی دیر میں اپنا کام نمٹالوں گی۔" میں نے کہا اور اپنی چیزیں سنبھالتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔

اور پھر جب میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی ساؤل بیلو کی کہانی کا اسکرپٹ مکمل کر رہی تھی مجھے بار بار ایڈگر کا خیال آیا۔ میں ایڈگر جیسے ان بہت سے دوسرے نوجوانوں کے بارے میں سوچ رہی تھی جنھیں جنگ سے نفرت تھی لیکن چونکہ وہ بزدل تھے اس لئے خاموشی سے سر جھکا کر میدانِ جنگ کی طرف چل دیتے تھے۔ جنگ پر جانا کس قدر ہولناک بات تھی، میری نگاہوں میں ایڈگر کا شاندار سراپا گھوم گیا۔ ہوسکتا ہے وہ کسی حریت پسند کی گولی کا شکار ہوجائے، یا کسی بارودی سرنگ پر پیر پڑتے ہی اسکے بدن کے چیتھڑے اڑ جائیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اس طرح زخمی ہو کہ اس کا ہاتھ یا اس کی ٹانگ کاٹ دی جائے۔ مجھے ایڈگر کی ماں کا خیال آیا۔ وہ کس قدر بدنصیب عورت تھی، اس کا شوہر جنگ کی بھینٹ چڑھا تھا اور اب اس کا بیٹا جنگ کے جہنم زار میں اترنے والا تھا۔ میں لرز کر رہ گئی۔ اس وقت وہ نہ جانے کیا کر رہی ہوگی۔ شاید ایڈگر کو خط لکھ رہی ہو یا اس کے لئے پل اوور بُن رہی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت جو کام کر رہی ہوگی وہ ایڈگر ہی سے متعلق ہوگا۔ میری اماں بھی تو اپنے اس بیٹے کے لئے ہی جیتی تھیں جو ہزاروں میل دور جاکر بیٹھ رہا تھا اور سات سال سے پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ دنیا کی تمام ماؤں کے دل شاید ایک ہی خمیر سے اٹھائے جاتے ہیں۔

وہ جب آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو میں اسکی طرف پشت کئے ایک ڈرامہ ایڈیٹ کر رہی تھی۔ یہ ڈرامہ اسٹیفن کرین کی مشہور کہانی THE RED BADGECOURAGE کی ریڈیائی تشکیل تھا۔ میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"تم اپنا کام مکمل کرلو، پھر باتیں کریں گے۔" ایڈگر نے کہا اور میری ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا۔ میز کے ساتھ لکڑی کی کیبنٹ پر میری چند ذاتی کتابیں بھی ہوئی تھیں۔ وہ ان کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا اور میں پھر ایڈیٹنگ مشین کی طرف متوجہ ہوگئی۔ پروگرام ایڈیٹنگ کی وجہ سے کمرے میں خاصا شور مچ رہا تھا۔ میں ٹیپ کو REWIND کرتی تو ناقابلِ فہم الٹی آوازیں کمرے کا سکون درہم برہم کردیتیں میں تیزی سے بیکار جملے اور مختلف "بلینک" کاٹ کاٹ کر ڈسٹ بن میں پھینکتی چلی گئی۔ دس منٹ بعد تمام مکالمے تسلسل میں تھے اور اب صرف صوتی اثرات کو شامل کرنے کا رہ گیا تھا اور یہ کام آفریدی صاحب اور ریکارڈنگ روم کے شیڈول پر منحصر تھا۔ میں نے ٹیپ لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور ایڈیٹنگ مشین کا سوئچ بند کرکے اٹھ کھڑی ہوئی —— میری نظر اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر بھٹکی۔ کونسلیٹ کے عقبی حصے کے سرسبز و شاداب لان پر ابھی تک ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور غضب کا سماں تھا۔

اس نے مجھے اٹھتے دیکھا تو میری ریوالونگ چیئر سے اٹھ کر مقابل کی ایک کرسی میں دھنس گیا۔

"ایڈگر تم کچھ پیو گے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، اب مزید پینے کی ہمت نہیں۔ تمہارے آنے کے بعد سے اب تک میں بس پیتا ہی رہا ہوں۔ یوں بھی بیئر کے نشے میں ہم

ڈبوئے نہیں جاسکتے۔ اس لئے مزید پینا فضول ہے۔ تم میرے لئے کھانے کو کچھ منگالو، مجھے بھوک لگ رہی ہے"۔

"کیا کھاؤ گے؟" میں نے ریسیور اٹھا کر ڈائننگ بار کا نمبر ڈائل کرنا چاہا۔

"اپنی پسند کی کوئی بھی پاکستانی ڈش منگالو"

"لیکن یہاں تو کوئی پاکستانی ڈش ملے گی نہیں"

"اچھا ـــ لیکن میں تو کوئی پاکستانی چیز کھانا چاہ رہا تھا" ایڈگر نے قدرے مایوسی سے کہا۔ میں اسے دیکھتی رہی پھر میں نے آہستہ سے ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ اس لمحے میرا جی چاہا کہ میں ایڈگر کے ساتھ کہیں باہر کھانا کھاؤں۔ موسم اس قدر خوبصورت تھا اور محاذ جنگ پر جانے والا یہ لڑکا کس قدر تنہا، اداس اور مضمحل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں کونسلیٹ کی عمارت سے نکل کر پورٹیکو میں کھڑے تھے۔ ایئرکنڈیشنڈ عمارت سے باہر نکلتے ہی سوندھی مٹی کی خوشبو سے معطر ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی، میں اس خوشبو کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتی تھی۔

"تم یہیں پورٹیکو میں کھڑی رہو، میں آگے بڑھ کر ٹیکسی پکڑتا ہوں"۔ ایڈگر نے کہا

"نہیں ـــ مجھے بارش میں بھیگنا بہت اچھا لگتا ہے ہم آگے بڑھ کر ٹیکسی پکڑ لیں گے" میں نے کہا مجھے بارش میں بھیگنا بہت پسند تھا لیکن اس وقت پورٹیکو میں نہ رکنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہاں کھڑا دربان اور اس سے باتیں کرتا ہوا موٹر پول کا ڈرائیور اور شیشے کے دروازوں کے پیچھے سے جھانکتا ہوا کرسچین ریسپشنسٹ مجھے ایڈگر کے ساتھ کسی ٹیکسی میں بیٹھتے دیکھے ـــ میں جانتی تھی کہ اس وقت بھی وہ لوگ ایک دوسرے کو بڑے معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرا رہے ہوں گے۔

میں ایڈگر کے پہلو بہ پہلو چلتی ہوئی بادلوں سے ڈھکے آسمان تلے آگئی۔ سڑک پر ہر جانب پانی جمع ہوگیا تھا اور ہم دونوں گندے پانی سے بچ کر فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ ہمارا رخ ہوٹل میٹروپول کی طرف تھا۔ پھر ایک کار بڑی تیزی سے آئی اور قبل اس کے کہ میں سنبھلتی میری سفید شلوار پر گل بوٹے بن چکے تھے۔ میں نے بے چارگی سے ایڈگر کی طرف دیکھا جس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا تھا۔

پھر سامنے سے ایک خالی ٹیکسی گزری تو ایڈگر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔ میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی "کولمبس" کا نام لیا۔ "کولمبس" دور افتادہ تھا اور بہت کم لوگ وہاں جاتے تھے۔

ہم جب "کولمبس" کے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے تو میری توقع کے عین مطابق ہال تقریباً خالی پڑا تھا۔ ایک دور افتادہ گوشے میں چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور ہم نے کونے کی ایک میز منتخب کی جہاں سے ہم شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیوں سے باہر کا منظر دیکھ سکتے تھے۔

کھانے کا آرڈر دینے کے بعد میں ایڈگر کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ مجھے ایک چھوٹا سا بچہ لگا جس کی کوئی خواہش پوری نہ ہوئی ہو اور وہ اداس بیٹھا ہو۔

"ایڈگر" میں نے آہستگی سے اس کا نام لیا، وہ چونک گیا! "مجھے اپنے بارے میں بتاؤ اپنی مما کے بارے میں بتاؤ" میں نے کہا۔

"میں تمہیں کیا بتاؤں۔ اتنی بہت سی باتیں بتانے کے لئے ہیں۔ ویسے تم بہت اچھی سامع ہو بولتی کم ہو اور سنتی زیادہ ہو۔ تم جیسے لوگ بڑے اچھے دوست ہوتے ہیں" اس نے کہا۔ "میں دیر سے سوچ رہا ہوں کہ کاش تم مجھے کلفورنیا میں ملی ہوتیں۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح ساتھ رہتے۔ پھر میں ایک ویک اینڈ پر تمہیں مما کے پاس لے جاتا، وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوتیں"۔ وہ خوابناک سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

وہ محاذ پر جانے والوں کی مخصوص نفسی کیفیت سے دوچار تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ چند لمحوں کی شناسائی کو دوستی

محبت اور نہ جانے کیا کیا فرض کرنا چاہتا تھا۔ مجھے جنگ عظیم پر لکھے جانے والے کئی ناول اور ان کے کردار یاد آئے۔ شاید موت کا سامنا کرنے والوں کو ایسے سہارے بھی بہت ہوتے ہیں۔

"بچوں کی طرح جاگتے میں خواب نہ دیکھو۔۔ اگر محاذ پر بھی اسی طرح خواب دیکھتے رہوگے تو یہ خواب تمہاری جان لے کر ٹلیں گے۔" میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

"میں خواب نہیں دیکھ رہا صرف خواہش کر رہا ہوں ۔۔ محاذ پر جانے والا کم از کم آرزو کا حق تو رکھتے ہیں۔" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا، میں خاموشی سے اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کے اس جملے کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

وہ چند لمحوں تک خاموش رہا پھر اس نے گفتگو شروع کر دی۔ "تم مجھے پھر یہی الزام دوگی کہ میں جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہوں لیکن یقین کرو اگر تم مجھے وہاں مل جاتیں تو میں تمہیں اپنے گھر لے جاتا اور اپنی لائبریری دکھاتا۔ تمہیں یقیناً کتابوں سے خاص دلچسپی ہے۔ میں نے ابھی تمہارے کمرے میں کئی بہت اچھی کتابیں دیکھیں ہیں میری ذاتی لائبریری میں تاریخ کے علاوہ لٹریچر کی بھی بہت سی کتابیں ہیں۔ دراصل میں تاریخ اور ادب کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کر سکتا۔ یونان کی تاریخ کی بہت سی الجھنیں یونانی ادب پڑھے بغیر سمجھ میں نہیں آتیں، اُسی طرح اگر ہمیں لوئی چہاردہم کا عہد سمجھنا ہے تو اس کے لئے ادب کی عینک لگانی پڑتی ہے۔ اگر ہم انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے اسباب تلاش کریں تو مادام ژفرین اور ان کے 'سالون' اور وہاں جمع ہونے والے چند ادیبوں اور فنکاروں کے ذکر سے فرار ممکن نہیں۔ چھوڑو ہٹاؤ ان باتوں کو۔۔ میں بھی بھلا کیا باتیں لے بیٹھا۔" اس نے نیپکن سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"تم قطعاً بیکار باتیں نہیں کر رہے۔ مجھے تمہارے نقطۂ نظر سے اتفاق ہے۔ تم نے جنوبی ایشیا کی تاریخ میں ایم ایس کیا ہے۔ اس لئے تم نے ہماری تاریخ تو یقیناً پڑھی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"تمہاری تاریخ؟ یعنی پاکستان کی تاریخ؟"

"میرا مطلب ہے کہ برصغیر کی تاریخ۔" میں نے کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا اگلا جملہ کیا ہوگا۔ ہر امریکی اس موضوع پر بات کرتے ہوئے یہی کہتا تھا اور امریکیوں پر ہی کیا منحصر تھا، اس بارے میں غیر ملکی ایک طرح سوچتے تھے۔

"ہاں، ہندوستان کی تاریخ ہمارے نصاب میں تھی۔ لیکن واقعی تم لوگوں کا جواب نہیں ہے پاکستان میں رہتے ہو اور پورے برصغیر کی تاریخ کو اپنی تاریخ کہتے ہو۔ لاکھوں انسانوں کے خون سے تم نے اپنے ملک کی سرحدیں کھینچی ہیں۔ تمہارا سرحد پار کی تاریخ سے بھلا کیا تعلق؟" وہ خوش دلی سے ہنسا۔

"مجھے معلوم ہے ۔۔ تم سب ہمارا مذاق اڑاتے ہو اور تم بھی اپنی جگہ صحیح کہتے ہو۔ ہم نے ایک ملک کو تقسیم تو کر دیا لیکن اپنا ماضی کاٹ کر نہ پھینک سکے۔ کتنی ہی ہماری چیزیں وہیں رہ گئیں کیونکہ وہ دھرتی کا حصہ تھیں اور ہماری طرح ہجرت کے شوق میں مبتلا نہ تھیں ۔۔ تاج محل، جس پر تم امریکی جان دیتے ہو وہ ہم نے بنایا، غالب جس کی شاعرانہ عظمت کے ڈنکے ان دنوں انگلستان میں پٹتے ہیں وہ ہمارا تھا، ہم میں سے تھا۔ اشوک کے کتبے اور نالندہ کے کھنڈرات جتنے ان کے تھے، اتنے ہی ہمارے بھی تھے۔ سب کچھ ہمارا اور ان کا مشترک سرمایہ تھا۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی، تم نے ہماری صرف تاریخ پڑھی ہے ہمارا ادب نہیں پڑھا۔ تم کچھ نہیں جانتے۔ ہمیں سمجھنا چاہتے ہو تو ہمارا ادب پڑھو۔ میں اب تک جتنے غیر ملکیوں سے ملی ہوں وہ سب اسی طرح باتیں کرتے ہیں۔ اس میں تم لوگوں کا قصور نہیں، بات صرف اتنی سی ہے کہ تم ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیتے ہو اور ہم تڑپ اٹھتے ہیں۔ تمہارے نام کے ساتھ کوہن لگا ہے تم یہودی ہو اور تم نے سینکڑوں برس ہجرت کا عذاب سہا لیکن کیسی دلچسپ بات ہے کہ تم ان فلسطینیوں کا دکھ

نہیں سمجھتے جنھیں اپنے گھروں سے نکلنا پڑا اور تم ہمارے عذاب بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ہم کہ پہلے برٹش انڈیا کی قومیت رکھتے تھے اور اب پاکستان میں مہاجر ہیں۔ ہم بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑیں ہیں۔ تمہیں یہ میاں جیسا نوحہ گر ملا تھا لیکن ہمیں تو کوئی یرمیاں بھی میسر نہیں آیا۔ میں نے الجھ کر باہر کی طرف دیکھا، میری طبیعت گھبرانے لگی تھی۔ موسم کا حسن نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔

"تاریخ دراصل بہت الجھا ہوا معاملہ ہے، اس کی بات کرنے بیٹھو تو گفتگو ہمیشہ غلط رُخ اختیار کر لیتی ہے۔" ایڈگر نے نیپکن سے اپنے ہونٹ صاف کرتے ہوئے کہا

"تم یہاں سے کہاں جاؤ گی؟" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد ایڈگر نے پوچھا۔

"میں اب گھر جاؤں گی۔"

"کل تم سے ملاقات ہو سکے گی یا نہیں؟" ایڈگر نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں تمہیں ایک بجے کے بعد اپنے کمرے میں ملوں گی۔ کل صبح مجھے ایک ڈرامہ ریکارڈ کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

"گویا تمہاری دوپہر امریکن کونسلیٹ کی پابند نہ ہوگی۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا؟" ایڈگر نے ہنستے ہوئے پوچھا اور میں بھی اپنی بے کیفی بھول کر اس کے ساتھ بیاختہ ہنس دی۔ "ہاں تم ٹھیک سمجھے ہو۔"

"بس تو پھر طے ہو گیا۔ ہم دونوں کل دوپہر کا کھانا اکٹھے کھائیں گے اور اس کے بعد بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" ایڈگر نے خوش ہو کر کہا۔

عجیب لڑکا تھا، چند گھنٹوں کی ملاقات میں اس طرح کھل گیا تھا جیسے برسوں کا شناسا ہو اور اب کتنے آرام سے کل دوپہر کا پروگرام بنا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا جی چاہا کہ کوئی بہانہ کر دوں لیکن یہ لڑکا جو گھر سے اتنی دور تھا اور شدید تنہائی کا شکار تھا، اسے مایوس کرنا مجھے اپنے بس کی بات نہ معلوم ہوئی۔

"ایڈگر اب چلنا چاہیئے، بہت دیر ہو گئی ہے۔" میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ باہر بارش تھم گئی تھی اور بادل چھٹتے جا رہے تھے۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ چلو میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آؤں۔"

"نہیں — میں ٹیکسی لے کر خود ہی چلی جاؤں گی۔"

"کیوں، میرا تمہارے ساتھ جانا مناسب نہیں ہے کیا؟"

"ہاں میرے گھر والے اسے پسند نہیں کریں گے۔"

"اچھا پھر ٹھیک ہے۔"

ہم دونوں "کولمبس" سے نکل کر باہر آ گئے — تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد ہمیں ٹیکسی مل گئی۔ "میں تمہیں کونسلیٹ کے قریب اتار دوں گی۔" میں نے کہا اور وہ سر ہلا کر میرے برابر بیٹھ گیا۔ میں نے کونسلیٹ سے ذرا پہلے ٹیکسی رکوائی تو وہ کل ملیں گے کہہ کر اتر گیا۔ ٹیکسی آگے بڑھی تو میں نے پلٹ کر دیکھا، اس نے مجھے پلٹتے دیکھا تو ہاتھ ہلانے لگا، میں نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا، ٹیکسی مڑی اور پھر وہ میری نگاہ سے غائب ہو گیا۔

اس رات میں نے عجیب خواب دیکھے۔

دھان کے کھیتوں میں بچے بھاگ رہے تھے، یہ کھیت سُرخ پانی میں ڈوبے ہوئے تھے اور بھاگتے ہوئے بچوں کی آنکھیں بے نور تھیں اور ان کے ہاتھ نہ تھے، پھر بھی وہ بچے تھے اور کھیتوں میں اپنی کھوئی ہوئی چیزیں ڈھونڈ رہے تھے — اپنے ہاتھ، اپنی آنکھیں اور تب بچوں کے اس ہجوم کے درمیان ایک فاختہ آسمان سے زمین کی طرف گری، اسکی چونچ میں زیتون کی ایک شاخ تھی اور اس

شاخ پر پتے کی جگہ امریکی پرچم تھا، پرچم پر کیچڑ کے دھبے تھے اور اس پر نیلے ستارے چمک رہے تھے۔ دست بریدہ اور بے نور آنکھوں والے بچے ان نیلے ستاروں کی طرف لپکے، ان میں سے ہر بچہ دوسرے بچے سے پوچھتا تھا۔ "تمہاری ماں کہاں ہے — ہر جگہ بس آگ اور دھواں ہے"۔ پھر بہت سی آوازوں نے بچوں کی آوازوں کے ساتھ آواز ملائی۔ دھواں ہے — دھواں ہر طرف ان الفاظ کی بازگشت تھی۔ چوک میں الاؤ کی طرح جلتے بھکشوں کے بدن سے دھواں بل کھاتا اٹھ رہا تھا اور آسمان کی طرف بلند ہو رہا تھا۔ دھوئیں کے اس منارے پر ایڈگر کھڑا تھا، اپنی ہتھیلی پر اپنا سر اٹھائے۔ پھر وہ بھاگنے لگا، جلتے ہوئے تیر اس کے تعاقب میں تھے اس نے ٹھوکر کھائی اور اس کا سر لڑھکتا ہوا دھان کے ایک کھیت میں جا گرا۔ اس کا سنہرے بالوں والا سر دھان کے کھیت میں کھڑے سرخ پانی پر تیر رہا تھا، کھلی آنکھوں میں خوبصورت دنوں کے خواب تھے اور ان خوابوں پر سوگ کی سیاہ چادر تھی۔

پھر مجھے پوسیڈون کا جواں سال بیٹا ایلی روتھیس نظر آیا — وہ ہاتھوں میں ایک طلائی کلہاڑی لئے زیتون کے اس سرسبز درخت کی طرف بڑھ رہا تھا جو اس کے باپ کی شکست کا نشان بن کر زمین سے پھوٹا تھا۔ ایلی روتھیس نے کلہاڑی اٹھائی اور زیتون کے اس درخت پر وار کیا لیکن اس کا وار خالی گیا اور اسکی دھار دار کلہاڑی خود اس کے اپنے پیروں پر آ کر لگی، وہ قد آور نوجوان پا بریدہ ہو کر زمین پر گرا اور آن کی آن میں ختم ہو گیا۔ تب اچانک اس نوجوان کا چہرہ لہریں لینے لگا یوں جیسے ساکن پانی میں کنکر پھینکا جائے تو پانی دائرے بنانے لگتا ہے۔ چند لمحوں بعد جب ایلی روتھیس کا چہرہ ساکت ہوا تو میرے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

"وہ ایڈگر کا چہرہ تھا۔ وہ ایڈگر کا پا بریدہ اور خون آلود بدن تھا۔ خون زیتون کے درخت کو سیراب کر رہا تھا اور طلائی کلہاڑی پر لہو کے دھبے تھے۔

جب میری آنکھ کھلی تو میرا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور میرے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے ہے۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا آسمان پر پو پھٹ رہی تھی

دوسرے دن ڈیڑھ بجے کے قریب جب میں ریکارڈنگ روم سے اپنے کمرے میں آئی تو ایڈگر میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں صبح سے کام میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ مجھے اس کا خیال بھی نہیں آیا تھا لیکن اب ایڈگر کو دیکھ کر مجھے نامعلوم سی خوشی ہوئی، اور اس کے ساتھ ہی مجھے رات کے ڈراؤنے خواب یاد آگئے۔

"جانتی ہو آج کی سب سے اچھی خبر کیا ہے؟" ایڈگر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بھئی — مجھے تو آج صبح سے اپنا ہوش ہی نہیں تھا"۔ میں نے کہا۔

"کل شام جب میں یہاں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ انفارمیشن کا ایک ٹرینی کلفورینا میں میرا کلاس فیلو رہ چکا ہے۔ میں نے آج کے لئے اس کی گاڑی لے لی ہے۔ دوسری اچھی خبر یہ ہے کہ بلیس میں A FAREWELL TO ARMS چل رہی ہے، میں نے اس کی بکنگ کرا لی ہے۔ کھانے سے نمٹ کر گھومیں گے پھر فرسٹ شو دیکھیں گے۔

غرض یہ کہ اس لڑکے سے نجات کی کوئی صورت نہیں ہے۔ میں نے سوچا۔ "تم نے بلا وجہ فلم کی بکنگ کرا لی، اب مجھے اپنے گھر فون کرنا پڑے گا"۔ میں نے کہا۔

"ہاں فوراً فون کر دو اور اپنے گھر والوں سے لمبی چھٹی لے لو"۔ اس نے کہا۔

"تمہارا شاید دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ پاکستان ہے امریکہ نہیں کہ میں آدھی رات تک تمہارے ساتھ گھومتی رہوں"۔

میں نے خود جھنجھلا کر کہا۔

"میں تو بس اب دو دن کا مہمان ہوں۔ میرے لئے تم اپنے اصول نہیں توڑ سکتیں؟"

"بھئی یہ اصول کی بات نہیں" میں نے کہا۔ وہ اپنے آپ کو مہمان ایسے کہہ رہا تھا جیسے میں نے اُسے تار اور خط بھیج کر بلوایا تھا۔ پھر اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے اس پر رحم سا آگیا، وہ منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ میں نے ٹیلیفون اپنی طرف گھسیٹا اور گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک بار پھر "کولمبس" میں بیٹھے تھے۔

"تم نے "اے فیر ویل ٹو آرمز" اس سے پہلے دیکھی ہے یا نہیں؟" کھانے کے بعد ایڈ گر نے کوکا کولا کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"میں اس فلم کو کئی برس پہلے دیکھ چکی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میں آخر میں بہت روئی تھی۔ کیتھرین کی موت کے بعد فریڈرک جب بارش میں بھیگتا ہوا واپس ہوتا ہے تو اسکی بے بسی اور اس کا بے پایاں الم دل کے ٹکڑے کر دیتا ہے" میں نے یادوں کو کریدتے ہوئے کہا۔

"یہ میری بہت پسندیدہ فلموں میں سے ایک ہے۔ محض اتفاق ہے کہ آجکل یہاں یہ فلم چل رہی ہے۔ میں نے "بیلس" کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا نام دیکھا تو میں نے سوچا کہ محاذ پر جلنے والا ایک انسان تمہیں اس کے علاوہ بھلا اور کون سی فلم دکھا سکتا ہے۔ شاید اسی طرح تمہیں میری تنہائی اور اذیت کا احساس ہو سکے"۔

"اس کی ضرورت نہ تھی، مجھے تمہاری کیفیات کا اچھی طرح اندازہ ہے، ورنہ میں یہاں تمہارے ساتھ بیٹھی ہوئی نہ ہوتی"۔ میں نے کہا۔

ہم "کولمبس" میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ایڈ گر بہت اچھی باتیں کرتا تھا۔ دھیمے لہجے میں بہت مدلل باتیں۔ تاریخ سے اسے عشق تھا، انقلاب فرانس سے وہ بہت متاثر تھا، برصغیر کی تاریخ کے بڑے ناموں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اکبر اعظم کا نام بہت عزت سے لیتا تھا

"اگر میں ویت نام سے گھر واپس پہنچ گیا تو ہندوستان کا سفر ضرور کروں گا اور فتح پور سیکری جاؤں گا اور سکندرہ بھی — مجھے اکبر اعظم کا مدفن دیکھنے کی حسرت ہے۔ تصویروں سے تو مجھے کچھ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کا مدفن اسکے شایانِ شان نہیں" اس نے باتوں کے دوران کہا۔

اس شام ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ پھر ہم نے فلم دیکھی۔ ہم فلم دیکھ کر نکلے تو اس کا حزن ہم دونوں پر مسلط تھا۔ ایڈ گر مجھے کافی پلانا چاہتا تھا لیکن میں نے اس سے اجازت چاہی۔ وہ مجھے گھر تک چھوڑنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی اور ٹیکسی میں گھر چلی گئی

وہ کراچی میں ایڈ گر کا تیسرا دن تھا، اس دن میں کونسلیٹ نہ گئی۔ وہ تمام دن میں نے سوتے جاگتے گزارا۔ سوتے میں خواب اور جاگتے میں حقیقتیں۔ دن میں کئی مرتبہ ایڈ گر کا فون آیا لیکن میں نے گھر میں سب سے کہہ دیا تھا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لئے دفتر سے کسی کا بھی فون آئے تو یہ نہ بتایا جائے کہ میں گھر پر موجود ہوں۔

وہ شام میں نے کلاسیکی موسیقی سنتے اور "سدھارت" پڑھتے گزاری۔

چوتھا دن رخصت کا دن تھا۔

ایڈگر دس بجے کے قریب میرے کمرے میں آیا۔ اس وقت وہ یونیفارم میں تھا، اسے یونیفارم میں دیکھ کر مجھے عجیب سی تکلیف ہوئی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آیا اور کرسی کھینچ کر میرے مقابل بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کل میرے دفتر نہ آنے کی شکایت کرے گا لیکن اس نے کچھ نہ کہا بس خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا "میرے جانے کا وقت آپہنچا، میں تم سے رخصت ہونے آیا ہوں۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کیا کہوں، وہ 'امام ضامن' کی اصطلاح سے ناواقف تھا ورنہ میں اس سے کہتی کہ جاؤ میں نے تمہیں امام کی ضمانت میں دیا۔ اسی لمحے میری نگاہوں کے سامنے جھلسی ہوئی لاشوں اور روتے ہوئے بچوں اور نابینا عورتوں کی تصویریں گھوم گئیں۔ اور اب ایڈگر ایسی ہی تصویروں کی تعداد میں اضافے کے لئے جارہا تھا۔ پھر میں اسے امام کی ضمانت میں بھلا کس طرح دے سکتی تھی۔ لیکن میں اسے دعا کے بغیر کس طرح رخصت کرتی، جنھیں آپ دوست جانیں ان کی زندگی کے لئے دعا تو دل سے بے ساختہ نکلتی ہے۔ اور تب اس لمحے میں نے جانا کہ انسان کیسے عذاب میں ہے اور ناکردہ گناہوں کی سزا پاتا ہے اور اس سزا کا اور اس عذاب کا خاتمہ نہیں ہے۔

میں اس کے ساتھ پورٹیکو تک آئی۔ "میں تمہارا کرم زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ اس نے پہلی اور آخری مرتبہ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ تیزی سے مڑا اور ایک گہرے سیاہ رنگ کی اس وین میں جا بیٹھا جس میں اس کے کئی ساتھی اس کا انتظار کر رہے تھے کار روانہ ہوئی تو اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور پھر فوراً ہی منہ پھیر لیا۔

بوندیں چمپا کی خوشبو پر، کامنی کی رنگت پر اور مٹی کی پیاس پر برس رہی ہیں۔ کمرے کے اندر بھولے بسرے گیتوں کے بول بکھرے ہوئے ہیں۔ مینہ کی بوندیں اور گیتوں کے بول کھرنڈ جیسے زخموں پر برستے ہیں تو تخم جیسے کھل اٹھتے ہیں۔

بوندیں برس رہی ہیں اور زخموں کے گلاب کھلے ہیں، ان نگاہوں کی شاخوں پر ابھرے ہوئے نوکیلے کانٹے یاد کی انگلیوں میں چبھتے ہیں تو نہ کچھ سوچنے کو جی چاہتا ہے اور نہ کرنے کو۔ میں اٹھ کر میز پر رکھا ہوا "پاکستانی ادب" اٹھاتی ہوں، یہ اس کا "امریکی ادب نمبر" ہے۔ میں اس کی ورق گردانی کرنے لگتی ہوں۔ میں صفحوں پر صفحے پلٹتی ہوں، پھر میری نگاہیں ایک صفحے پر رک جاتی ہیں۔ یہ ایک بارہ سالہ امریکی بچی باربرا ہائیڈلر کی نظم کا ترجمہ ہے۔

وہ، وہ ایک لشکارا
روپہلا اور سنہری
روپہلا اور سنہری
روپہلے پرندے اڑتے ہیں
سنہرا پانی برستا ہے
دھان لہر کی تال
ننھے پانی کے ساتھ بھڑک کر جھلس جاتے ہیں۔

میری نگاہیں اس نظم کی ایک ایک سطر کو میکانکی انداز میں پڑھتی چلی جاتی ہیں، پھر میں آخری سطر دن تک پہنچتی ہوں۔

سن امریکہ، سن دھیان سے
ہائی پھونگ سے اٹھتی بچوں کی چیخیں
لمبی اور صاف سنائی دیتی یہ چیخیں

اور میری آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ ابھرتا ہے' میری آنکھوں کے گوشے بھیگ جاتے ہیں۔ ایڈگر اس نظم کو پڑھتا تو پھڑک اٹھتا لیکن اس نے یہ نظم نہیں پڑھی۔ یہ نظم جو ۶۹ء میں امریکہ کے ایک گمنام اور نہایت مختصر تعداد میں شائع ہونے والے رسالے میں چھپی تھی اور پھر وہ پرچا بحقِ سرکار ضبط ہوگیا تھا۔

"ایڈگر کاش تم نے یہ نظم پڑھی ہوتی"! میں خواہش کرتی ہوں۔

میری میز کی نچلی دراز میں دوسرے بہت سے خطوط کے ساتھ چند وہ ایئر لیٹر بھی ہیں جو ایڈگر نے مجھے جنوبی ویتنام سے بھیجے تھے انہی خطوط کے ساتھ ایک امریکی ایئر لیٹر ہے جو آج سے سات برس پہلے میرے نام آیا تھا۔ میں نے اس خط کو بارہا پڑھا ہے اور ایک بار پھر اسے پڑھنے کی خواہش میرا سینہ کھرچنے لگتی ہے۔ میں اٹھ کر اپنی میز کی دراز کھولتی ہوں اور امریکہ سے آنے والا ایئر لیٹر نکال کر پڑھتی ہوں۔

"میری بچی!

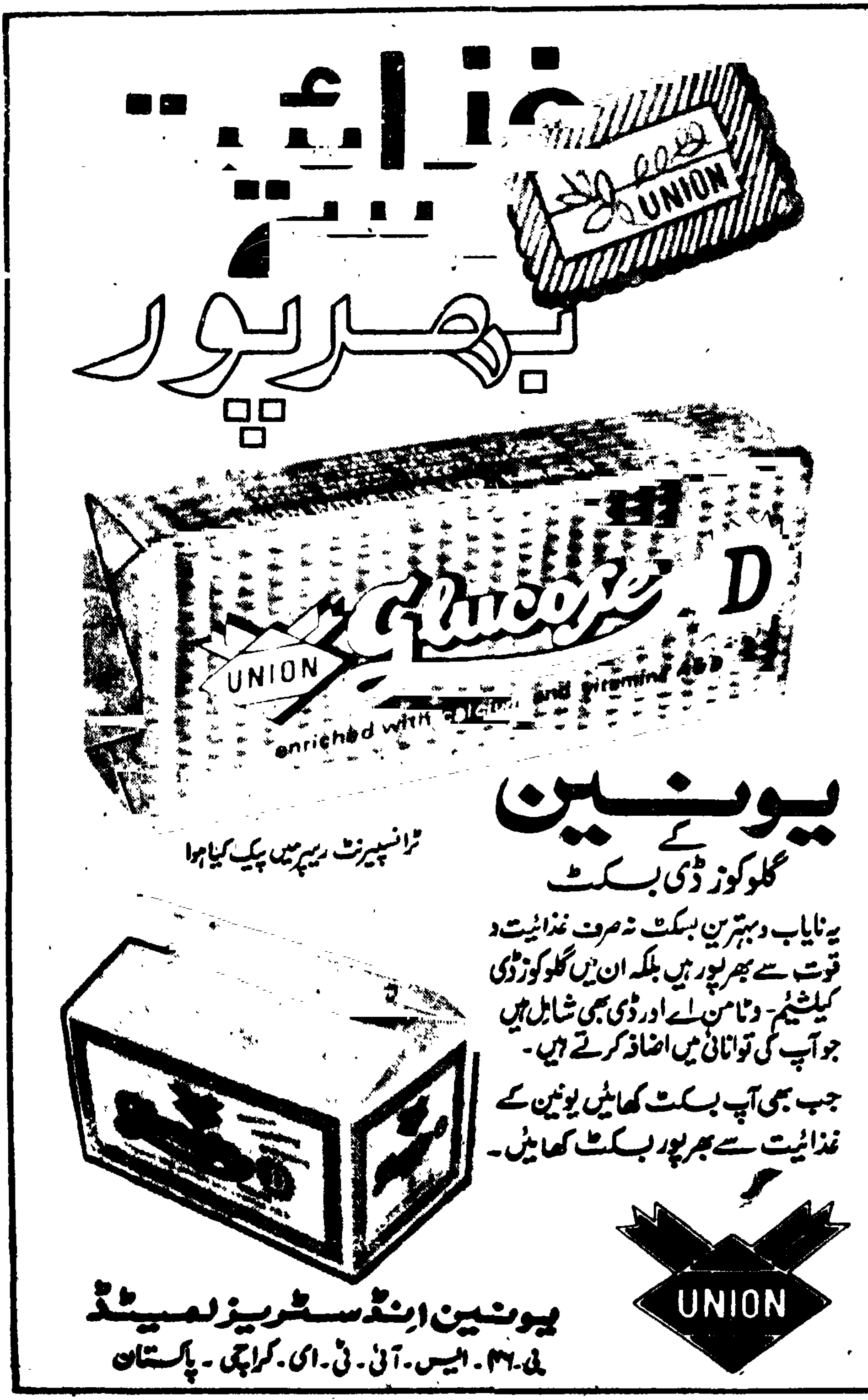
تم مجھے نہیں جانتیں لیکن میں اپنے بیٹے کے خطوط میں تمہارا ذکر بار بار پڑھ چکی ہوں۔ تم نے تنہائی کے چند عذاب ناک دنوں میں اس کا دکھ بٹایا تھا اور تمہارے خطوں سے اسے بہت تسکین ہوتی تھی۔ وہ اپنے ہر خط میں تمہیں نہایت محبت اور احترام کے ساتھ یاد کرتا رہا۔

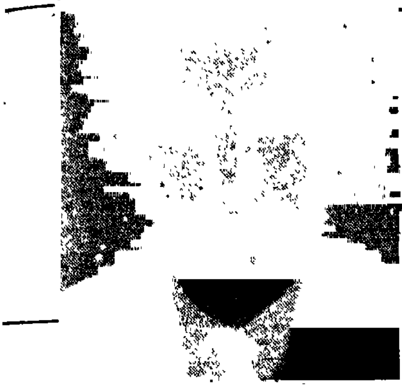
میں تمہیں یہ خط اس لئے لکھ رہی ہوں کہ میرا بیٹا اور تمہارا دوست آج سے ڈیڑھ ماہ پہلے ہائی پھونگ میں ختم ہوا۔ ایڈگر کی خواہش تھی کہ اگر وہ محاذ پر کام آجائے تو تمہیں اس کے انجام کی اطلاع دیدی جائے۔

والدہ
ایڈگر

میں اس خط کو جسے گزشتہ سات برس میں نہ جانے کتنی مرتبہ پڑھ چکی ہوں، بار بار ہائیڈلرا کی نظم کے درمیان رکھ دیتی ہوں۔

●
●


غذائیت
بھرپور
UNION
Glucose D
UNION
enriched with
یونین
کے
گلوکوز ڈی بسکٹ
ٹرانسپیرنٹ ریپر میں پیک کیا ہوا
یہ نایاب و بہترین بسکٹ نہ صرف غذائیت و قوت سے بھرپور ہیں بلکہ ان میں گلوکوز ڈی کیلشیم - وٹامن اے اور ڈی بھی شامل ہیں جو آپ کی توانائی میں اضافہ کرتے ہیں۔
جب بھی آپ بسکٹ کھائیں یونین کے غذائیت سے بھرپور بسکٹ کھائیں۔
UNION
یونین انڈسٹریز لمیٹڈ
بی ۳۶۔ ایس۔ آئی۔ ٹی۔ ای۔ کراچی۔ پاکستان



اُجلے تھل کی مچھلی

علی حیدر ملک

سارا شہر کرفیو کا کفن اوڑھے سو رہا تھا۔

رات بہت ڈراؤنی اور پراسرار ہوگئی تھی۔ ہر چیز سانس روکے 'دم بخود تھی۔ اس بھید بھری خاموشی میں صرف بوٹوں کی آواز وقفے وقفے سے ڈنکے کی چوٹ کی مانند بلند ہوتی اور پھر رفتہ رفتہ کہیں تحلیل ہوجاتی۔ اچانک ایک انسانی چیخ ابھری اور خوف واحتیاط کے سارے پردے چیر کر گلی گلی بین کرنے لگی۔

میں نے تکیئے سے سر اٹھا کر پہلے آواز کی سمت متعین کی اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس سمت میں چلنے لگا جدھر سے چیخ کی آواز آئی تھی۔ چند ہی قدم چلنے کے بعد وسوسے کی سنگینوں نے مجھے چاروں طرف سے آگھیرا ___ اگر کسی نے اس گھور اندھیرے کے باوجود میرا اٹھا ہوا سر دیکھ لیا۔ یا میرے وجود کی آہٹ محسوس کرلی تو؟ ___ انجام کا تصوّر زیادہ مشکل نہیں تھا۔

انجام کا خیال آتے ہی میں نے اپنا سر نیہوڑا لیا اور زمین پر جھک کر کسی زخمی جانور کی طرح گڑگڑ کرنے لگا۔ خوف کی چیونٹیاں اب بھی میرے اندر رینگ رہی تھی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے زمین پر رکھ کر پاؤں پیچھے کی طرف پھیلا دیئے اور زمین کے سینے سے سینہ ملا کر آگے بڑھنے لگا۔

گدلے تالاب کے اس پار بانس کی جھاڑیوں کے درمیان گھری جھونپڑی سے چیخیں اب بھی رہ رہ کر ابھر رہی تھیں۔

جھونپڑی کے دروازے پر پہنچکر میں اُٹھ کھڑا ہوا ___ دروازہ کھلا تھا۔ اور عین دروازے کے سامنے ایک دبلا پتلا سا آدمی کھڑا تھا جس کے چہرے پر خوف اور دہشت کی دھول اڑ رہی تھی۔ اس کی پشت پر دو لڑکیاں تھیں۔ خوف زدہ ہرنیوں کی طرح سہمی اور دبکی ہوئی اور ان کے پیچھے سراسیمگی کی تصویر بنی ایک ادھیڑ عمر کی عورت ان سے ذرا ہٹ کر دو نوجوان پستول تانے کھڑے تھے۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی دبلے آدمی کی آنکھوں میں امید کا سورج طلوع ہوا مگر دونوں نوجوانوں کے چہرے پر ناگواری کے سائے لہرانے لگے۔

"تم یہاں کیسے آمرے؟" ایک نوجوان نے ہار دھری آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"یہی سوال میں تم سے کرنے آیا ہوں۔" میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہم؟" دوسرا نوجوان مکروہ سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "ہم ان لڑکیوں کو لینے آئے ہیں" ہرنیوں کی مانند سہمی ہو

یاں تیز ہوا کی زد پر آئے ہوئے درخت کی کمزور کچی شاخوں کی مانند تھرتھرانے لگیں۔

"لیکن میں تمہیں ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گا" میں نے اپنے اندر کی ساری قوت اور سارا اعتماد سمیٹ کر کہا۔

"یہ غدار کی لڑکیاں ہیں اور ہمارے لئے مالِ غنیمت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تمہیں ان سے کیا واسطہ؟"۔ ایک نوجوان نے اپنی ستول کو انگلیوں سے سہلاتے ہوئے کہا۔ "تم شاہی قبیلے کے فرد ہو اور یہ غدار ساہی قبیلے کا آدمی ہے۔۔۔۔" دوسرے نے مجھے ...انے کی کوشش کی۔

"میں شاہی قبیلے کا فرد نہیں ہوں"۔ میں نے سختی سے اس کی تردید کی۔

"تم شاہی قبیلے کے نہیں ہو پھر بھی تمہارا تعلق اسی قبیلے سے بنتا ہے۔ ساہی قبیلہ تمہارے اور شاہی قبیلے کے خلاف ہے ...طرح۔۔۔۔"

"میں کسی قبیلے کا نہیں ہوں۔ کوئی قبیلا میرا نہیں ہے"۔ میں نے بلند آواز میں کہا۔ "یا میں ہر قبیلے کا ہوں۔ ہر قبیلہ میرا ہے ...مگر کان کھول کر سن لو۔ میں تمہیں وہ ہرگز نہیں کرنے دوں گا جو تم قبیلے کے نام پر کرنا چاہتے ہو"

"غدار!"۔ اُن میں سے ایک نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں ابھی اس غداری کا مزا چکھا...ں"۔ دوسرا نوجوان پستول لہراتا ہوا آگے بڑھا مگر قبل اس کے کہ وہ مجھے گولیوں کا ...انہ بنائے میں نے اُسے بازوؤں میں جکڑ لیا ...نے دیکھا دُبلے پتلے آدمی نے بھی دوسرے نوجوان کو دبوچ لیا تھا۔ دونوں لڑکیوں ...نے بلّی کی طرح جھپٹ کر نوجوان کے ہاتھوں پر جن میں انھوں نے پستول پکڑی ہوئی تھی اپنے دانت گاڑ دیئے۔ وہ دونوں اچانک ...پڑے اور ان کے ہاتھوں سے پستولیں تقریباً ایک ساتھ ہی زمین پر گر پڑیں۔ پستول ہاتھ سے چھوٹ جانے کے بعد ان کا سارا دم خم ...ہو گیا اور وہ غصے اور نفرت سے مجھے گھورنے لگا۔

"فوراً یہاں سے دفعان ہو جاؤ اور پھر کبھی بھولے سے بھی ادھر کا رُخ نہ کرنا"۔ میں نے کہا وہ دونوں اپنے زخمی ہاتھ کو دوسرے ...سے سہلاتے، دانتوں کو پیستے، دروازے سے نکل کر باہر اندھیرے میں کہیں ڈوب گئے۔

دُبلا پتلا آدمی آگے بڑھ کر مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

"میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا"۔ اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور گردن جیسے کسی بوجھ سے دبی جا رہی تھی

"یہ میری بہن ہے"۔ اس نے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ میری بیٹی"۔ اس نے دوسری لڑکی کی جانب اُنگلی دکھائی۔

...دونوں لڑکیوں نے ایک لمحے کو میری طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

اچانک موسم تبدیل ہو گیا۔ طوفان کا رخ اب دوسری سمت میں تھا۔ ہر طرف آہ و بکا اور نالہ و شیون کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ ...بارود اور انسانی خون کی بو پھیل رہی تھی۔ میں نے کئی دن تک سورج کی روشنی اور آسمان کی نیلاہٹ نہیں دیکھی۔ اور پھر ایک دن ...طوفان میرے دروازے پر دستک دینے لگا۔

"تم غدار ہو۔ تم نے ہمارے قبیلے کے خلاف سازش کی ہے"

"تم دلال ہو۔ تمہیں دلالی کی سزا بھگتنی ہوگی"

میں گم سم کھڑا رہا۔ میں نے کسی کے خلاف سازش اور کس کی دلالی کی تھی مجھے معلوم نہ تھا۔

"چپ کیوں کھڑے ہو؟"

"چلو۔ اسے غداروں کی آخری آرام گاہ میں لے چلو"

"نہیں۔ تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ اس نے کوئی دلالی کوئی سازش نہیں کی" تالاب کے اُس پار رہنے والے دُبلے پتلے شخص نے پھولی سانسوں کے ساتھ کہا جیسے کہیں دور سے دوڑ کر آرہا ہو۔

"اس نے ہمارے دشمنوں کا ساتھ دیکر ہم سے غداری نہیں کی؟"

"نہیں۔ اگر یہ ایسا کرتا تو آج میں تمہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا"

جب طوفان ٹل گیا تو میں نے اُس آدمی سے کہا۔ "وہ تم مجھے کب تک اس طوفان سے بچا سکو گے اس نے میرا گھر دیکھ لیا ہے۔ آج نہیں تو کل مجھے پھر آلے گا۔ بہتر یہی ہے کہ میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جاؤں"

اس نے اپنی زبان بند رکھی اور قدموں کو حرکت دی۔ میں نے بھی اس کے ساتھ قدم اٹھائے اور ہم دونوں بانسوں کے جھنڈ کے درمیان تالاب کے کنارے آکر کھڑے ہو گئے۔ رنگ برنگی مچھلیاں تالاب میں اِدھر سے اُدھر دوڑ لگا رہی تھیں۔ اُس نے مچھلیوں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یوں تو ایک سے ایک مچھلیاں ہوتی ہیں لیکن مجھے سب سے زیادہ سلیمانی مچھلیاں پسند ہیں" وہ چلا گیا۔ اور جب دوبارہ آیا تو اس کا سارا وجود رسوائیوں کے داغ سے لہولہان تھا۔

"کیا ہوا؟ تمہیں کس سانپ نے ڈس لیا؟"

"آستین کے سانپ نے"

"آستین کے سانپ نے؟"

"ہاں! طوفان اب بگولا بن گیا ہے۔ کوئی گھر اس سے محفوظ نہیں رہا۔ اس اندھے طوفان نے مجھے میری ماں جائی اور میرے خون کے پیکر سے جدا کر دیا ہے.... وہ لوگ میری بہن اور بیٹی کو...."

"لیکن وہ تو تمہارے اپنے قبیلے کے...."

"پاگل کسی کو کب پہچانتے ہیں...." اُسے چپ سی لگ گئی۔

"کیا تم نے شاہی قبیلے میں جانے کا واقعی فیصلہ کر لیا ہے؟" اس نے ذرا ٹھہر کر سوال کیا۔

"ہاں! یہاں تو اب اپنا سایہ بھی خون کا پیاسا ہو گیا ہے"

"میں بھی اس قبیلے کو خیر باد کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے؟" تالاب کے کنارے آکر مچھلیوں کو گھورتے ہوئے اس نے بڑی حسرت کے ساتھ پوچھا۔ میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"تمہیں تو سلیمانی مچھلیاں پسند تھیں...." میں اس سے کہنا چاہتا تھا۔ "میں بھی ان مچھلیوں کا پرستار ہوں لیکن...." لیکن میں خاموش رہا اور نظریں پانی پر جما دیں۔ مبادا اس کے ہاتھ سے موہوم سا وہ آخری تنکا بھی چھوٹ جائے جسے حرزِ جاں بنائے ہوئے میں اب تک زندہ تھا۔

برف کا دھواں

شکیلہ رفیق

اعجاز سے اس کی ملاقات ابھی چند ہی روز قبل جیم خانہ میں ہوئی تھی وہ اپنے کولیگ ارشد کے ساتھ بیٹھی گپیں لڑا رہی تھی کہ ایپل سڈرا کا گھونٹ لیتے ہوئے اس کی نظر اعجاز پر پڑی۔ یہ نیا چہرہ اسے اچھا لگا تھا ورنہ اس سے قبل وہ جنسِ مخالف کے سلسلے میں سرد ہی رہی تھی۔ اس کی مثال ارشد ہی تھا جو اب تک نہ جانے کتنی بار اس سے شادی کی درخواست کر چکا تھا اور اس نے ہر بار حقارت سے اسے رد کر دیا تھا۔ اس کے باوجود ارشد اس سے ناراض نہ ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ رینا کے خیالات میں تبدیلی لانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

لیکن رینا تو ایسا پہاڑ تھی جو نہ ٹوٹتے ہیں نہ لاوا اگلتے ہیں بس اپنی جگہ جمے رہتے ہیں۔ ارشد کے علاوہ بھی کئی لوگ اس سے شادی کے لئے کہہ چکے تھے۔ جن میں سے کچھ تو اسی کلب کے دوست تھے اور کچھ باہر اور آفس کے۔ لیکن جب وہ درخواست گزاروں کو اپنی شرط سے آگاہ کرتی تو وہ سب اچھوت کی مانند اس سے الگ ہو کر کسی 'عورت' کی تلاش شروع کر دیتے۔

اعجاز میں کوئی بات تھی ضرور جو رینا کے خیالات میں تبدیلی لا رہی تھی ورنہ اسے شادی کے نام سے چڑ تھی اور مردوں سے وہ سخت الرجک رہتی تھی۔

بعض اوقات بچپن کے واقعات بچوں کے ذہن میں کچھ اس طرح رچ بس جاتے ہیں کہ پھر بقیہ تمام زندگی ان کے زیر اثر رہتی ہے۔ رینا بھی کچھ ایسے ہی واقعات کا شکار تھی۔ یہ بات اسے آج بھی اچھی طرح یاد تھی کہ رات کے دس بھی نہ بجتے تھے کہ پپا اسے سونے کا حکم صادر فرما دیتے تھے۔ وہ کوئی جواب دینا ہی چاہتی کہ وہ اپنے بیڈروم کی چٹخنی اندر سے لگا لیتے۔ وہ چونکتی تو اسی وقت جب 'کٹ' کی ہلکی سی آواز اس کے کانوں میں کڑکڑاتی بجلی کی طرح کوندتی۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ اس 'کٹ' سے اسے نفرت تھی۔ ہر روز رات کو یہ معمولی سی چٹخنی اس کے کانوں میں دھماکے کرتی، جو اس کو ماں کی رفاقت سے محروم کر دیتی۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ اس کے ننھے سے ذہن نے اس چٹخنی کو توڑ دینے کی ترکیبیں سوچیں مگر ان دنوں اس کا قد آدھے دروازے تک بھی نہ پہنچ پاتا۔ اور وہ تلملا کر رہ جاتی۔ روز یونہی ہوتا، نو بجے کے بعد ہی پپا سونے کی رٹ لگا دیتے۔ یوں بھی وہ پپا کی نسبت ممی سے کچھ قریب تھی۔ اسے ممی پپا سے قدرے بہتر لگتی تھیں جو اسے تھوڑا بہت وقت تو دیتی تھیں مگر نہ جانے کیا بات تھی جونہی پپا گھر میں آتے یہ تھوڑا سا وقت بھی اس سے چھن جاتا، وہ تنہا رہ جاتی۔ پپا بہت کم بولتے تھے اور ممی بھی بے انتہا کم سخن تھیں۔ اس کا جی چاہتا تھا وہ دونوں اس کی دوست فرینہ کے والدین کی طرح اس سے ڈھیر ساری باتیں کریں مگر ایسا کبھی نہ ہو سکا۔ اس کے پپا انتہائی خشک اور لطیف احساسات و جذبات سے قطعی عاری انسان تھے۔ عورت کا وہ جانے کیا مصرف سمجھتے تھے؟ ممی

سے بہت کم بات کرتے اور کبھی کرتے تو یوں جیسے بوجھ اتار رہے ہوں۔ وہ تو مسکرانے کو بھی گناہ سمجھتے تھے۔ ممی کی ہنسی بھی اس نے خال خال ہی سنی تھی۔ البتہ جب رات کو وہ دونوں بیڈ روم میں بند ہو جاتے تب ان کی ہنسی اور دبے دبے قہقہے اکثر سنائی دیتے۔ وہ سوچتی، یہ قہقہے باہر آکر کہاں گم ہو جاتے ہیں؟ پپا نے ایک جملے کے سوا کبھی اس سے کوئی بات نہ کی تھی روز رات وہ اس سے صرف اتنا ہی کہا کرتے "رینا، سونے کے لئے اپنے کمرے میں جاؤ۔" اس کے بعد وہ خود بھی ممی کے ساتھ بیڈ روم میں بند ہو جاتے۔ اسے اس بیڈ روم سے کراہت آتی تھی۔ ذہن آہستہ آہستہ پپا سے بیزار ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگتا جیسے پپا ممی کو اس سے چھین رہے ہوں۔ فرینہ روز ہی اسے بتایا کرتی کہ اس کی ممی سونے سے پہلے روز اسے ایک اچھی سی کہانی سناتی ہیں۔ رینا کی ممی نے اسے آج تک کوئی کہانی نہیں سنائی تھی۔ وہ روز ہی ارادہ کرتی کہ آج وہ بھی اپنی ممی سے کہانی کی فرمائش کرے گی مگر ابھی وہ ارادے ہی باندھ رہی ہوتی کہ پپا ممی کو بیڈ روم میں بند کر لیتے۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔ ممی اسے آیا کے سپرد کر کے خود پپا کے ساتھ کمرے میں بند ہو جاتیں۔ آیا اسے لاکھ چمکارتی، پیار کرتی مگر جوابًا اسے رینا کے مکّے اور لاتیں ہی نصیب ہوتیں۔ نتیجتاً وہ بڑی ضدی اور چڑچڑی ہو کر رہ گئی تھی۔

بچپن اسی ذہنی انتشار کے حصار میں شعور کو چھونے لگا۔ عمومًا اس عمر میں لڑکیوں میں جو تبدیلیاں آتی ہیں رینا ان سے قطعاً عاری تھی۔ اس کے جذبات میں کوئی رنگ، کوئی ہلچل نہ تھی۔ بچپن کی وہ ذہنی دوری کھل کر رنگ لائی تھی۔ اس کے خیالات عجیب رنگ اختیار کر گئے تھے۔ بچپن میں پپا ممی کو اس سے دور کیوں کر دیتے تھے؟ اس بات کو وہ اب سمجھنے لگی تھی، یہی وجہ تھی کہ اس کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ مردوں کی محبت صرف بیڈ روم کی محبت ہوتی ہے۔ کیونکہ بیڈ روم سے باہر ہونے پر رینا نے انھیں ہمیشہ ہی مصروف پایا۔

جوں جوں وہ باشعور ہوتی گئی اس کے ذہن کے دریچوں میں یہ خیال اچھی طرح گھس کر بیٹھ گیا کہ مرد صرف جسمانی محبت کا قائل ہے۔ روح سے وابستگی اس کے نزدیک بے معنی سوچ ہے۔ ردعمل یہ ہوا کہ وہ روحانی عشق کو اہم جاننے لگی۔ یہی وجوہات تھیں جن کے سبب اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اگر اسے شادی کے لئے مجبور کیا گیا تو وہ صرف اس شرط پر رضامند ہوگی کہ یہ شادی محض روحانی تعلق کا سبب ہوگی۔ اس کا شوہر اس کے جسم کو ہرگز ہرگز ہاتھ نہ لگائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کنواری رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کیونکہ وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھتی تھی کہ اس کی اس بے تکی شرط کے بعد کوئی مرد اس سے شادی پر رضامند نہ ہوگا۔ ادھر ممی بھی اس سے مایوس ہو چکی تھیں۔ اس کے بہت سے پیغام آتے مگر اس نے صاف صاف ممی سے کہہ دیا تھا کہ وہ ہرگز شادی نہیں کرے گی۔ اس کے لئے اسے پپا کی ڈانٹ بھی سننی پڑتی تھی۔ مگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ جب وہ لوگ وجہ دریافت کرتے تو اسے سانپ سونگھ جاتا۔ وہ کیسے بتاتی کہ وجہ تو خود آپ لوگ ہیں۔ تھک کر انھوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ پپا کا کہنا تھا کہ ایک روز خود ہی کہے گی میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔

اس نے تعلیم مکمل کر لی تو ایک بینک میں سروس کر لی۔ وہیں ارشد اس کا دوست بنا، جو پہلی ہی ملاقات میں اس پر فدا ہو گیا۔ مگر وہ ایسے لوگوں سے بہت چڑتی تھی جو اس پر فدا ہو کر اس سے شادی کی درخواست بھی کرتے تھے۔ لہٰذا اس نے ارشد کے ساتھ سرد رویہ اختیار کیا۔ ارشد چند روز تو اس کی اچانک تبدیلی کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ آخر ایک روز اس نے رینا کو گھیر لیا، اور قریبی پارک میں لے گیا۔

"میں تم سے فلرٹ تو نہیں کر رہا۔ بڑے شریفانہ طریقے سے تمھیں اپنانا چاہتا ہوں۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ دنیا کو گواہ بنا کے۔" ارشد نے کہا تو وہ بھنویں اچکا کر بولی۔

"شادی ؟ کیسی شادی ؟"
"بہت خوب ! بھئی جیسی شادی ہوا کرتی ہے، اور کیسی ؟" وہ طنزیہ ہنسا۔
"میں شادی نہیں کروں گی" اس نے صاف کہہ دیا۔
"کیوں ؟ کسی اور کو پسند کرتی ہو ؟" ارشد نے پوچھا۔
"فی الحال تو نہیں" وہ لاپرواہی سے سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
"میری بات سنو ریتا !" ارشد نے ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ گھاس پر بٹھالیا۔ وہ بیزاری سے بیٹھ گئی تب بولا "تم مجھے پسند کرتی ہو ؟"

ریتا نے اسے دیکھا، پھر سمجھانے والے انداز میں بولی "تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی بلکہ میرا سرے سے شادی کا کوئی ارادہ ہی نہیں"
وہ بھونچکا ہو کر بولا "مگر کیوں ؟" ریتا نے پہلے تو وجہ بتانی چاہی پھر انگلی اٹھا کر بولی۔
"پہلے وعدہ کرو تم ہنسو گے نہیں" ارشد نے وعدہ کرلیا تو وہ بولی "اس لئے کہ میں روحانی عشق کی قائل ہوں"
"ہاہاہا ــــــ !" وعدہ کے باوجود ارشد منہ پھاڑ کر ہنسا۔
"دیکھو تم نے وعدہ کیا تھا" وہ کچھ خجل سی ہو کر بولی۔ وہ پھر ہنسا اور بولا۔
"اتنی احمقانہ بات سن کر کوئی بھی عقلمند اپنی ہنسی نہیں روک سکتا۔ یہ روحانی محبت فلموں وغیرہ میں تو چل جاتی ہے ریتا بیگم حقیقی زندگی سے اس کا دور کا تعلق نہیں ہوتا۔"
"مگر میں روحانی محبت کو بطور حقیقت تسلیم کرتی ہوں" وہ بڑے تیقن سے بولی تو پھر ارشد پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔
"یہ محض تمھاری ذہنی اختراع ہے ورنہ یہ ناممکن ہے کہ دو صنف مخالف زندگی بھر صرف روحانی محبت کریں۔ یہ خیال محض بودا ہی نہیں بلکہ احمقانہ بھی ہے۔" ارشد نے استہزائیہ کہا۔ جس پر وہ ارشد سے لڑ پڑی کہ تمھیں میرا مذاق اڑانے کا کوئی حق نہیں۔ اس طرح دونوں میں کھٹ پٹ ہوگئی۔ اس نے کافی عرصہ تک ارشد سے بات نہ کی۔ آخر ارشد نے ہی معافی مانگی اور اس وعدے پر کہ آئندہ وہ شادی کا ذکر کبھی نہ کرے گا، اس سے دوستی کی تجدید کرلی۔ ارشد سے اس کی یہ گفتگو پہلی بار کسی مرد سے نہ تھی بلکہ اس سے قبل بھی وہ ہر درخواست گزار سے یہی الفاظ کہہ کر مذاق کا نشانہ بن چکی تھی۔ مگر اس کے سر میں جانے کیا سودا سمایا ہوا تھا کہ وہ اپنے فیصلہ پر اٹل تھی۔
اعجاز کو جب اس نے پہلی بار دیکھا تو اس کے خیالات نے جانے کیوں دوسرا موڑ اختیار کرلیا۔ وہ اعجاز کو اپنانا چاہتی تھی۔ مگر کہتے ڈرتی تھی کہ جواب وہی ملے گا جو اب تک ہوتا آیا ہے۔ کلب میں اچھے خاصے لوگ اس کے اس خیال سے واقف ہو چکے تھے یہی وجہ تھی کہ آہستہ آہستہ سب اس سے الگ رہنے لگے تھے۔ کیونکہ اس کے وجود میں ساری کشش اس کے خوبصورت جسم ہی کو حاصل تھی، ورنہ عورتیں تو اکثر اس کے سانولے رنگ کو دیکھ کر ناک چڑھا کر کہتیں خدا جانے مردوں کو اس کالی کلوٹی میں کیا نظر آتا ہے۔ صرف ارشد تھا جو اب تک آس لگائے تھا اس نے اس سے قبل ایسا مکمل اور بھرپور جسم نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ریتا ایک نہ ایک روز موم کی طرح پگھل کر اس کی آغوش میں آگرے گی۔ جب اس نے ریتا کو پہلی بار اعجاز میں دلچسپی لیتے دیکھا تو پہلے تو وہ ذرا سا خوفزدہ ہوا مگر پھر اسے اطمینان ہوگیا کہ اعجاز بھی اس کی شرط سن کر جلد ہی اس سے الگ ہو جائے گا ــــ اسی لئے وہ ان دنوں مصلحتاً ریتا سے خود ہی الگ رہنے لگا تھا

جلد ہی وہ دن آپہنچا جب اعجاز نے رینا سے شادی کی بات کی۔ جواباً رینا نے سیکڑوں بار کہے گئے خیالات دہرا دئے۔ اعجاز چند لمحے تو کچھ سمجھ ہی نہ سکا اور جب سمجھا تو حسب دستور رینا نے اس سے بحث شروع کر دی۔ خاصی دیر دونوں میں بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ اعجاز اسے حاصل کرنے پر تلا ہوا تھا اور وہ اپنی شرط پر اڑی ہوئی تھی۔

"ابتدا میں ایسے ہی اوٹ پٹانگ خیالات ہوتے ہیں۔ بعد میں سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔" اعجاز نے اطمینان سے کہا تو وہ اڑیل گھوڑی کی طرح بدک گئی۔

"پھر مجھ سے شادی کا خیال بھی اپنے دل سے نکال دو۔" اعجاز چند ساعت اس کو تکتا رہا پھر بولا۔

"تمھیں احساس ہے تم کتنی بڑی بات کہہ رہی ہو؟"

"ہاں مجھے احساس ہے۔" وہ بے حسی سے بولی تو اعجاز نے کہا۔

"تم میرا کتنا بڑا امتحان لینا چاہتی ہو رینا! ازدواجی زندگی کے سب سے خوبصورت پہلو کو یوں نظر انداز کر دینا بے حد دشوار ہے بلکہ ناممکن۔" اعجاز پژمردگی سے بولا تو وہ بڑے طنطنے سے بولی

"پھر میری اور اپنی شادی کبھی ناممکن سمجھو۔"

دونوں میں خاصی دیر بحث ہوتی رہی۔ آخر اعجاز ہار گیا۔ گو اس کی اور رینا کی ملاقات ابھی زیادہ پرانی نہیں تھی مگر وہ رینا سے شدید لگاؤ محسوس کر رہا تھا۔ وہ رینا کو ارشد کے حوالے ہرگز نہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے ارشد سے رقابت محسوس ہوتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ایک طویل بحث کے بعد وہ رضامند ہو گیا تھا۔ اس نے رینا کی شرط مانتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری تو رینا اپنی جیت پر مسرور ہو کر کھل گئی۔ اعجاز ہار گیا تھا اس کی جیت ہوئی تھی۔ وہ پہلا شخص تھا جو رینا سے اس کی احمقانہ شرط کے باوجود اس سے شادی پر رضامند ہوا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ رینا کو کسی اور کا ہوتا نہ دیکھ سکتا تھا۔

ارشد نے جب یہ خبر سنی تو سر تھام لیا۔ وہ بھی اعجاز کی طرح رینا کی شرط مان کر اسے حاصل کر سکتا تھا۔ پچھتاووں نے اسے گھیر لیا۔ وہ اعجاز کی چال سمجھ گیا تھا۔ ایک عورت کب تک اس لطیف جذبے کی حقیقت کو تسلیم نہ کرے گی۔ پھر مرد کے لئے کیا مشکل ہے جب چاہے عورت پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی گود میں آگرے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اعجاز بازی جیت چکا تھا۔

دوسرے ہی روز رینا ممی کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھی:

"میں اگلے ہفتے اعجاز سے شادی کر رہی ہوں۔" ——— پپا نے مسکرا کر ممی کو دیکھا اور سگار سلگا لیا۔

اگلے ہفتے دونوں کی شادی ہو گئی۔ شادی میں سب سے زیادہ شور اعجاز کے چھوٹے بھائی شیراز نے مچایا ہوا تھا۔ بڑا شوخ اور چلبلا لڑکا تھا۔ رینا سے ایسے کھلے کھلے مذاق کرتا کہ وہ بیر بہوٹی بن کر رہ جاتی پر وہ باز نہ آتا۔ ولیمہ میں شرکت کے فوراً بعد وہ یہ کہہ کر واپس چلا گیا تھا کہ اسے کباب میں ہڈی قطعاً پسند نہیں۔

ادھر رینا نے پہلے ہی اعجاز سے کہہ دیا تھا کہ بستر علیحدہ ہوں گے۔ بیڈ روم کے ساتھ اسے ڈبل بیڈ سے بھی الرجی تھی اعجاز بادل ناخواستہ مان گیا تھا۔

شادی کی خوبصورت رات ان دونوں نے صرف باتیں کر کے گزاری۔ اعجاز نے ضبط کی ہر منزل کو پار کر لیا تھا۔ کسی کسی وقت وہ کھو سا جاتا تو رینا اسے ٹہوکا دے کر چونکا دیتی۔ وہ تو یوں بھی معمول کے مطابق تھی مگر اعجاز در حقیقت امتحان سے گزر رہا تھا۔ رینا کو قطعی احساس نہ تھا کہ وہ انجانے میں اس پر کیسا ظلم ڈھا رہی ہے۔ کچھ دیر بعد اعجاز اپنے بیڈ پر جا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

آخر یہ شب سیاہ بھی گزر گئی۔

کسی کے فیصلوں کا شب روز پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ یونہی گزرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار رینا کو احساس ہوتا کہ اس نے اعجاز کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ رات کو جب وہ اپنے بستر پر بے تابی سے کروٹیں بدل بدل کر ٹھنڈی سوکھی سانسیں بھرتا تو رینا کو اس پر ترس آجاتا مگر وہ یونہی چپ چاپ پڑی رہتی۔ کیوں کہ وہ دوسری ممی بن کر ایک اور رینا کو ماں کی توجہ سے محروم نہ کرنا چاہتی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ اگر اس نے اعجاز کی بات مان لی تو ایک دوسری رینا اس دنیا میں اپنی ممی کی محرومی کا شکار ہو جائے گی۔

" تمھاری شرط مان کر میں نے اپنی زندگی کی عظیم حماقت کی ہے "۔ اعجاز رینا سے بڑی حسرت سے کہتا۔ دونوں میں دھواں دھار بحث ہوتی اور نتیجہ پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔

آہستہ آہستہ اعجاز کے ذہن نے زندگی کے اس ڈھب کو قبول کرلیا۔ اب وہ رینا سے شکوہ نہ کرتا۔ بس چپ چاپ حسرتوں کا مزار بنا پڑا رہتا۔ رینا کو اس بات کی خوشی تھی کہ اس کی اتنی کڑی شرط کے باوجود وہ رینا کو پہلی سی شدت سے چاہتا تھا۔ اس کا ہر طرح خیال رکھتا تھا۔ اس بے پناہ التفات کے باعث اکثر رینا کا ضمیر نادم ہو جاتا مگر فوراً ہی اس کی نظروں کے سامنے اپنا بچپن گھوم جاتا۔ جہاں ننھی حسرت زدہ رینا جھنجھنی توڑنے کی ترکیبیں سوچ رہی ہوتی اور سائدرماں اس کے باپ کے ساتھ بیڈ روم میں بند دبے دبے قہقہے لگا رہی ہوتی۔ وہ فوراً ضمیر کو چولھے میں ڈال دیتی۔

ان کی شادی کا چھٹا مہینہ چل رہا تھا۔ اب تو اعجاز شاید یہ بھی بھول گیا تھا کہ رینا اس کی قانونی بیوی ہے اور خود اس کے بھی بشری تقاضے ہیں۔ وہ بہت کم رینا سے گفتگو میں پہل کرتا۔ اگر رینا کوئی بات کرتی تو گفتگو کی ابتداء ہو جاتی ورنہ خاموشیاں گھر میں گونجا کرتیں۔ اس بحر سکوت میں پہلی بار اس وقت ہلچل پیدا ہوئی جب اچانک ہی شیراز کی شادی کی اطلاع ملی۔ وہ دوسرے شہر میں ملازم تھا۔ ایک لڑکی سے عشق لڑا اور شادی کر بیٹھا۔ اب ہنی مون منانے اعجاز کے گھر آرہا تھا۔ اس خبر سے دونوں ہی خوش تھے۔ کم از کم اس گھر کے قبرستانی سناٹوں میں شیراز کے قہقہے جان تو ڈال سکیں گے۔

رینا صبح سے شیراز کے لئے کمرہ درست کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ وہ آج شام پہنچ رہا تھا۔ اس نے ضروریات کی تمام چیزیں کمرے اور ملحق باتھ روم میں رکھ دی تھیں۔ پھر اس کے بعد اچھے اچھے کھانے بھی تیار کئے تھے۔ مغرب تک شیراز اور افشین پہنچ گئے، گھر میں ایک دم ہی چہل پہل ہو گئی۔ شیراز کی بے باکی شادی کے بعد کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ وہ خوب ہی رینا کو ستا رہا تھا۔ اس کے شرارے جیسے جملوں پر افشین کے کھنکتے قہقہے مزید ستم ڈھا رہے تھے۔

" بیوی کو بھی خراب کر دیا ہے بدتمیز نے "۔ رینا نے مصنوعی خفگی سے کہا، پھر اعجاز کی طرف دیکھ کر بولی " اچھی خاصی ہوگی جب بیاہ کر آئی ہوگی "۔

" شادی کے وقت تو سب ہی اچھی ہوتی ہیں بعد میں ہی تو خراب کرتے ہیں "۔ شیراز ایک شوخ قہقہہ لگا کر بولا۔ رینا جھینپ گئی، افشین مسکرانے لگی تو شیراز نے مزید ستم ڈھایا " آپ لوگوں کی طرح تھوڑی، نہ چٹکیاں نہ گدگدیاں ——— بس ایک چپ ہے جس نے سارے گھر کو گھیر رکھا ہے "۔

" ہم تمھاری طرح بدتمیز نہیں ہیں "۔ رینا نے اعجاز کو دیکھا جو خواہ مخواہ ہی اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا تھا۔

" بھئی ہمیں تو ان دنوں یہی بدتمیزیاں اچھی لگتی ہیں "۔ شیراز نے کہا اور ایک دم ہی افشین کا ہاتھ اٹھا کر چوم لیا۔

" اللہ، بے شرم! " رینا اٹھ کر اندر بھاگ گئی۔ وہ اس کے پیچھے ہی قہقہے بکھیرتا آپہنچا۔

"بس اتنا ہی حوصلہ ہے! ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔ وہ تو بھیّا کا لحاظ آگیا تھا وہاں۔ اب دیکھئے یہاں کیا ہوتا ہے۔ افشین! افشین ڈارلنگ! ___ جان!" وہ افشین کو آوازیں دینے لگا تو رینا ہراساں ہو کر بولی۔

"دیکھو ___ دیکھو یہ بدتمیزی نہ کرنا شیراز! میں ___ تم سے بڑی ہوں ہاں۔"

"دیور بھابی کے رشتہ میں بڑا چھوٹا نہیں ہوتا جناب! میں تو آپ کے سامنے بھی افشین کو بانہوں میں بھی لے سکتا ہوں۔" وہ ڈھٹائی سے بولا تو رینا ساری جان سے کانپ کر رہ گئی۔

"دے ___ دیکھو شیراز۔"

"اچھا یار کچھ نہیں کرتا، ہکلائیے تو مت! میرا کمرہ تو ٹھیک کر دیا ہے نا؟" اس نے موضوع بدل دیا۔ رینا نے ہاں کہا اور جان چھڑا کر بھاگی۔ کیوں کہ افشین اندر داخل ہو رہی تھی۔ پھر جانے کیا ہوتا۔ اس چھوٹے کا کیا بھروسہ؟

رات کو رینا بستر پر لیٹی ہی تھی کہ شیراز نے حلق پھاڑ پھاڑ کر اسے آوازیں دینا شروع کر دیں "بھابی! او ڈیر بھابی!" وہ جلدی سے آگئی۔ مبادا اس کی چیخ پکار سے اعجاز کی آنکھ نہ کھل جائے۔

"آپ تو کہہ رہی تھیں کہ میں نے کمرے میں ضرورت کی سب چیزیں رکھ دی ہیں۔" وہ رینا کی آنکھوں میں جیسے گھور کر بولا۔ رینا نے بغور کمرے کا جائزہ لیا۔ ضرورت کی ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی۔

"ہاں پھر؟" اس نے سوال کیا۔

"جی نہیں جناب! یہاں کچھ چیزوں کی کمی ہے اور چند فالتو ہیں۔" اس کی آنکھوں میں شرارت عود کر آئی اور رینا خواہ مخواہ ہی گھبرانے لگی۔ کیونکہ افشین کے ہونٹ بڑی دلنشین مسکراہٹ بکھیر رہے تھے۔

"مثلاً!" رینا نے پوچھا۔ اس نے آنکھیں گول گھما کر افشین کو دیکھا۔ پھر بولا۔

"یار آپ تو یوں سوالات کرتی ہیں جیسے خود بوڑھی ہوں یا پھر غیر شادی شدہ۔"

"اب بتا بھی چکو۔" وہ جان چھڑانے کو بولی۔ شیراز نے دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھام کر کھینچا اور وہ ٹھنڈی برف ہو گئی۔ شیراز اسے گھسیٹتا ہوا کونے والی خالی میز تک لے گیا "یہ دیکھئے! نہ یہاں دودھ کا گلاس ہے نہ پھل اور مٹھائی۔ بھئی ہمیں ان کی ضرورت پڑتی ہے۔" وہ لب دبا کر مسکرایا تو رینا کے بدن میں گرم رو سی دوڑ گئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے شیراز۔"

"جب سے آیا ہوں، نو بار بدتمیز کہہ چکی ہیں۔ جب کہ یہ بدتمیزی نہیں۔ بڑا تمیزدار قسم کا مطالبہ ہے، کیوں افشین؟" اس نے آنکھ دبائی۔

"لا دیتی ہوں۔" وہ جانے لگی تو شیراز فوراً ہی بولا۔

"ضرور جائیے۔ مگر ساتھ ہی یہ فالتو چیزیں بھی لیتی جائیے ___ یہ جو آپ نے اپنا بڑا سلیقہ دکھایا ہے اور پائنتی دو رضائیاں تہہ کر کے رکھی ہیں، یہ کیوں؟ دوسری کس کے لئے؟ بالکل فالتو ہے ___ لے جائیے یہاں سے ___ افشین ڈیر ایک ہی سے کام چل جائے گا نا۔" افشین زور سے ہنس پڑی اور رینا ایک رضائی اٹھا کر بھاگ گئی۔ "توبہ! کیسا بے ہودہ ہے یہ شیراز کا بچہ ___"

کچھ دیر اسے اپنے دھک دھک کرتے دل کو سنبھالنے میں لگ گئی۔ پھر اس نے ایک ٹرے میں شیراز کی مطلوبہ چیزیں لگائیں

اور سوچا، جلدی سے یہ آخری کام بھی ختم ہو تو اس لڑکے سے نجات ملے۔ شیراز نے بڑے تھامی اور کہا "اگر ہماری ہنسی اور چوڑیوں کی کھنک سے آپ کی نیند ڈسٹرب ہو تو اس کی پیشگی معذرت بھابی ڈیئر۔!"

ریناتے کوئی جواب نہ دیا اور اپنے بیڈ روم میں جاکر دھم سے بستر پر گر پڑی۔ اعجاز کی آنکھ کھل گئی اور اس نے پوچھا "کیا ہوا؟" مگر وہ "کچھ نہیں"، کہہ کر یونہی پڑی رہی۔ اعجاز تو کچھ دیر کے بعد سو گیا لیکن نیند آج رینا کی آنکھوں سے دور تھی، کوسوں دور۔ اس کی آنکھوں میں خار سے چبھ رہے تھے۔ وہ آنکھیں کھولے چھت کو تک رہی تھی۔ اس کے اور شیراز کے کمرے کے درمیان صرف ایک روشندان تھا جسے وہ جلدی میں بند کرنا بھول گئی تھی۔ اس وقت وہاں اعجاز کے سوتے وجود کے سوا کوئی نہ تھا —— مگر رینا اس تنہائی میں بھی شیراز کے جملوں کا لطف لے کر جھینپی جا رہی تھی کہ اچانک ہی افشین و شیراز کی ہنسی، قہقہے، شوخیاں، چوڑیاں سبھی کچھ اس کے کانوں میں گڈمڈ ہو کر رہ گئے اور وہ جیسے انگاروں کے بستر پر لوٹنے لگی۔ اس نے بیقرار ہو کر اعجاز کو دیکھا۔ جس کے خراٹے ان آوازوں تلے دب کر رہ گئے تھے۔ وہ ساری رات نہ سو سکی۔ لگتا تھا بستر پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں جو اس کے جسم میں کاٹ رہی ہیں، اس کی نیند خوار کر رہی ہیں۔ اس نے چاہا کہ اٹھ کر ابھی یہ روشندان بند کر دے۔ مگر بھیگی رات کے سناٹے میں ایسا ممکن نہ تھا۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ مگر آوازیں اور قریب آگئیں۔ ساری رات یونہی جاگتے گزر گئی۔ صبح وہ کچن میں ناشتہ تیار کر رہی تھی کہ شیراز وہیں آگیا۔ اس کی سوجی سوجی آنکھیں دیکھیں تو شرارت سے ہنسا "تو کیا ہمیں دیکھ کر آپ لوگوں کو اپنا ہنی مون یاد آگیا؟" ابھی وہ کچھ کہتی ہی کہ اعجاز کے آجانے سے بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔ ناشتے کے فوراً بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ جاکر درمیانی روشندان بند کر دیا۔

افشین و شیراز کو آئے آج چوتھا روز تھا۔ ہر رات بند روشندان کے باوجود رینا کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیتی۔ نیند اس سے روٹھ گئی تھی۔ اسے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ وہ خود کو ادھورا محسوس کرنے لگی تھی —— نامکمل سی —— جیسے اس میں کوئی کمی ہو —— بے کلی —— بیقراری، بے چینی، ہلچل —— مضطرب ہو ہو کر کروٹیں بدلا کرتی، ہر کروٹ پر اس کی نظر اعجاز پر پڑتی جو اس کے جذبات سے بے خبر اپنے مخصوص خراٹوں میں گم ہوتا۔

کئی روز اسی بے کلی میں گزرے۔ اب تو شیراز بھی واپس جا چکا تھا۔ مگر اپنی بے باکیوں اور شوخیوں سے غیر ارادی طور پر جو آگ وہ رینا کے وجود میں لگا گیا تھا وہ اب تک بھڑک رہی تھی۔ اسے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اس کا فیصلہ غلط تھا قطعی غلط۔ بچے کے بغیر وہ نامکمل اور ادھوری ہے۔

اگلی رات وہ اور اعجاز دونوں باتیں کر رہے تھے۔ کچھ عرصہ سے اعجاز نے باتیں کرنے کے لئے بھی اس کے بستر پر آنا چھوڑ دیا تھا شاید اس طرح ضبط مشکل ہوتا ہوگا۔ اپنے اپنے بستروں سے چند جملوں کے تبادلے ہوتے پھر دونوں سو جاتے —— رینا کا اس وقت کئی بار جی چاہا کہ وہ اعجاز سے اپنے دل کی بات کہہ دے —— مگر کس منہ سے؟ جب کہ اس نے خود ہی یہ بندش لگائی تھی۔ اس نے دعا کی، کاش اعجاز خود ہی کہہ دے تو وہ اب قطعی انکار نہ کرے گی۔ مگر اعجاز تو جیسے اب سب کچھ بھول ہی چکا تھا۔ باتیں ختم ہو چکی تھیں اور وہ حسب عادت کروٹ لے چکا تھا۔ رینا نے چند منٹ انتظار کا کرب سہا اور پھر اٹھ کر اس کے بستر پر چلی گئی۔ شاید اعجاز کی آنکھ لگ گئی تھی۔

"اعجاز ——!" ہار کر وہ خود ہی بولی۔

"آں؟" اس نے موج کی طرح کروٹ بدلی اور حیرانی سے اس انقلاب کو تکنے لگا "یہ ——؟ تم ——؟ اور یہاں؟؟"

وہ طنز سے بولا۔ مگر رینا آج طنز کا ہر تیر سہنے کا ارادہ کر کے آئی تھی

"ایک بات کہوں اعجاز؟"

"ہوں !" وہ اب تک آنکھیں پھاڑے اس خوبصورت جسم کو تک رہا تھا جو آج پہلی بار اس کے اتنا قریب تھا۔

"تمہیں اس گھر میں کچھ کمی نہیں محسوس ہوتی ؟" اس کی آواز جذبات میں بھیگ چکی تھی۔

"کس چیز کی ؟" اعجاز نے بھونڈے پن سے کہا تو وہ دھیمے سے بولی۔

"چیز نہیں اعجاز ! میرا مطلب ہے —— ہمارے بچے کی ——" رینا نے نہ جانے کیسے کہہ ہی دیا اور سرخ ہو گئی۔ اعجاز کی آنکھوں میں ہیجان کے ساتھ مزید حیرت و استعجاب تھا، وہ بولا۔

"یہ —— یہ تم کہہ رہی ہو ؟"

"ہاں اعجاز ! میں —— میں ہار گئی ہوں —— میں اپنی شرط واپس لیتی ہوں۔" اس نے کہا اور اعجاز کی بغل میں منہ چھپا لیا۔

"رینا !" اعجاز نے آواز دی تو وہ اس سے لپٹ گئی۔ اعجاز نے دوبارہ پکار کر اسے اپنے وجود سے الگ کرنا چاہا مگر وہ کئی لمبی لمبی سانسیں لے کر اس سے مزید چمٹ گئی —— "اعجاز" ——

اعجاز نے بڑی آہستگی سے اسے الگ کیا اور اس کا چہرہ اوپر اٹھایا جو انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ جانے رینا کا وہم تھا یا حقیقت کہ اسے اعجاز کے چہرے پر چور کی چھاپ لگی دکھائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"مم —— مگر رینا ! میرا مطلب ہے، میں نے اسی لئے تو تمہاری وہ شرط مان لی تھی۔" وہ ہکلا کر بولا تھا۔ بڑے پھنسے پھنسے لہجے میں مگر رینا کو ایسا صاف سنائی دیا جیسے درمیان میں کوئی دیوار نہ ہو۔ وہ یوں اچھلی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ سارا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ اس نے اپنی خوفزدہ نظریں اٹھا کر اعجاز کو دیکھا جو کھلی کتاب کی طرح بستر پر اس کے سامنے پڑا تھا —— وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ آج وہ معمہ حل ہو گیا تھا کہ اعجاز اس کے خیالات جاننے کے باوجود اس سے شادی پر کیوں رضامند ہو گیا تھا —— پیکنگ خوبصورت ہو تو ضروری نہیں کہ چیز بھی خوبصورت نکلے۔

●
●



پانی کو چلتا رہنے دو

ایوب خاور

میری آنکھیں اب بھی دیکھتی ہیں کہ اُن ہاتھوں کا نور ٹاہلی کے بہت پرانے اور بلند درختوں پر اترتی ہوئی خزاں کا جھولا جھولتی ہوئی ہوا کے ساتھ زمین کو چھوتا ہوا بلند ہوتا ہے اور آفاق میں پھیل جاتا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف دور تک جاتی ہوئی درختوں کی لمبی قطاریں جنکے تنوں میں طوطے بارشوں کا موسم گزارتے ہیں، سردیوں میں ہم ان کے خشک پتے جمع کرتے ہیں اور راتوں کو الاؤ جلاتے اور کالی راتوں کا ہولناک گیت گاتے ہوئے گیدڑوں کی آوازیں جب سڑک کے کنارے سوئے ہوئے گھروں کی بے چراغ منڈیریں سے ٹکراتا تو وہاں تھوہر کے خاک آلود پودوں میں چھپے ہوئے ایک کھولی نما مکان کے دروازے پر کوئی دیا روشن رہتا اور پانی چلنے کی آتی رہتی جیسے کوئی مسلسل جی رہا ہو۔ اور مدھم آنچ جیسی کوئی آواز قرآنی آیات کی تلاوت کرتے ہوئے ہمارے گھروں کے بند دروازوں کی جھریوں سے اندر آتی رہتی اور علی بخش کہانی کہتے کہتے رک سا جاتا، مگر چاروں طرف بچھی ہوئی چارپائیوں پر سے "ہوں ہوں" کی آوازیں تب بھی آتی رہتیں — جیسے کہانی چل رہی۔

"پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بچے کے سامنے لعل و یاقوت اور انگارے رکھ دیئے گئے، سارا دربار چپ تھا صرف سانسوں کے چلنے کی آواز آ رہی تھی جیسے دو ہری چوہری دیواریں اور ستون سانس لے رہے ہوں اس عالم میں بچے نے ایک کلکاری بھری اور انگارے اٹھا کر ہتھیلی میں دبائے اور پھر زبان پر رکھ لئے ......" کہانی چل رہی تھی۔

مگر ان ہاتھوں کا نور بہت عجیب تھا، یہ نور میں نے اس وقت بھی دیکھا جب علی بخش کہانی کہتے کہتے رک گیا اور ماسی نیکو نے میری آنکھوں میں دارو ڈالتے ہوئے میری ماں سے کہا تھا۔

"فاطو...... ترامی کے انگارے بجھ چکے ہونگے اپنے دوپٹے میں ان کی گرم گرم راکھ لپیٹ کر مجھے دو میں اس کی آنکھوں پر باندھ دوں، صبح تک اللہ نے خیر کی تو تمہارے بیٹے کی آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔"

میری آنکھیں نہ صرف درد سے پھٹی جا رہی تھیں بلکہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے ان میں مٹھی بھر ریت انڈیل دی ہو — مگر اب یوں لگ رہا تھا جیسے ٹھنڈی ہوا، اوس شبنم میں نہائی ہوئی روشنی میری آنکھوں سے روح میں اتر رہی ہو۔

میں نے ان ہاتھوں کا نور اس وقت بھی دیکھا جب برسوں سے اجڑے ہوئے ویران کنوئیں کو ماسی نیکو نے تن تنہا پاک کیا تھا۔ بوسکا کی رسی کو کھینچنے کے لئے جب ماسی نیکو کمر کو خم دے کر قلانچ بھرتی تو یوں لگتا جیسے روشنی کی کوئی لکیر کنوئیں کی گہرائی سے نکل کر فضا میں

پھیل رہی ہو۔

یہ دوسرے دن کی سہ پہر تھی کہ جب برسوں بعد پانی میں حرکت ہوئی تو ایک عجیب سا شور ہوا تھا جسے سڑک کی دوسری طرف رہنے والوں نے اپنے اپنے گھروں تک سنا۔ مانو کالی نے تو یہ تک کہا تھا کہ "یہ قلابچ سردار خاں کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی مگر حقیقت یہ بھی کہ یہ قلابچ سردار خاں کی بیوہ ماسی نیکو ہی کی تھی۔

پھر جب وہ کنوئیں کو پاک کر چکی تو بھگواڑے کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بیٹھ کر سہ پہر کی روٹی کھائی اور اپنے کنوئیں کا ٹھنڈا پانی پیا۔ یہ سب کچھ میں نے بھی دیکھا اور سڑک کی دوسری طرف مانو کالی نے بھی دیکھا اور نورے موچی کی ماں سجانی نے بھی دیکھا اور خشک زبان ـــ ہانپتی ہوئی کیاریوں نے بھی۔

خشک زبان، ہانپتی ہوئی کیاریوں کو دیکھ کر ماسی نیکو نے پل بھر میں رہٹ باندھنے کا فیصلہ کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بیلوں کی جوڑی کو رہٹ سے باندھا، ان کی آنکھوں پر کھوپے چڑھائے، ان کی گردنوں میں گھنٹیاں باندھیں اور رہٹ کا دائرہ چلنے لگا۔ بیلوں کی گردنوں میں جھولتی ہوئی گھنٹیوں کی آواز کنوئیں کے اندھیرے میں دن کا اجالا پھیلانے لگی۔ درختوں نے اس آواز کو بہار کا نغمہ جانا اور کنوئیں کی منڈیر پر جھک جھک کر سرگوشیاں کرنے لگے یہاں تک کہ کنوئیں میں اترتی چڑھتی ٹہل کا شور رقص بن کے خاک آلود پودوں میں بھی ہلچل سی پیدا کر گیا۔

سڑک کی دوسری طرف بڑھتے ہوئے ہجوم میں گھنٹیوں کی یہ آواز عجب عجب طرح سے پہنچ رہی تھی۔

کسی نے دیکھا کہ سردار خان آزادی، محبت اور محنت کا ملا جلا نغمہ گا رہا ہے۔

کسی نے یہ جانا کہ دس سال پہلے کی کسی شام نے یوں انگڑائی لی کہ جس کی زد میں آ کر سحر و شام کے سارے سلسلے اپنے مفاہیم بدل رہے ہیں۔ کسی بوڑھے کا چہرا یہ آواز سن کر نہروں کا جال بن گیا۔

کسی نے دیکھا کہ دائرے میں بھاگتے ہوئے بیلوں کے پیچھے سردار خاں شملہ لہرا رہا ہے ـــ اور پانی بڑھ بڑھ کر مٹی کے خشک ہونٹوں کو تر کر رہا تھا۔

بڑھتے ہوئے ہجوم کی بھنبھناہٹ تیز ہو گئی تھی۔ دس سال جو گزر گئے تھے ایک دم سے الٹے پاؤں کے چکر میں پھر گئے اور تب چاچا فضل دین چند قدم آگے بڑھا۔ "یہ بہت برا ہوا علی بخش...... رہٹ پھر چل رہا ہے۔"

اور کہانی کہنے والے علی بخش نے کندھے پر رکھے ہوئے صافے کو مہندی لگے بالوں پر جماتے ہوئے کہا۔

"فضل دین...... چلتے ہوئے رہٹ تو خدا کی نعمت ہوتے ہیں تم کہہ رہے ہو کہ بہت برا ہوا......؟

اور فضل دین کچھ کہتے کہتے رک گیا...... اس کے سامنے سے دونالی بندوق کا ایک واہمہ سا لہرا کر گزر گیا جیسے ابھی ابھی کی بات ہو فضل دین نے سردار خاں کے دل میں اترتی ہوئی گولی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ چوہدری کی آنکھیں اس وقت خون میں ڈوبی ہوئی دو بوٹیوں کی طرح تھرتھرا رہی تھیں اور جب سردار خاں کنوئیں کی منڈیر کے پاس گرا تھا تو چاچا فضل دین اس کے پاس ہی کھڑا تھا اور لہو کی قطار جو ایک زنجیر کی شکل میں پانی کے اندر تک چلی گئی تھی وہ ساکت پڑی تھی اور پانی چل رہا تھا ـــ

بات کچھ بھی نہ تھی۔ سردار خاں نے اپنے باپ دادا کے کنوئیں پر رہٹ لگوا لیا تھا اور یہی شام کا وقت تھا جب اسی طرح بیلوں کی جوڑی رہٹ کے دائرے میں چل رہی تھی اور ان کی گردنوں میں جھولتی ہوئی گھنٹیوں کی آواز کنوئیں کے اندھیرے میں اجالا پھیلا رہی تھی اور کنوئیں کا پانی کیاریوں کے خشک ہونٹوں کو تر کر رہا تھا اور سڑک کی دوسری جانب ہجوم اسی طرح بڑھ رہا تھا اور پھر ہجوم میں کھلبلی مچ گئی تھی

لوگوں نے سردیوں کی پیلی دھوپ میں ڈلکی چال چلتے ہوئے گھوڑے کی ہنہناہٹ اور لشکارا بیک وقت دیکھی اور سنی تھی۔

«ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ ...... چوہدری اسی طرف آرہا ہے"..... ہجوم میں ایک بھنبھناہٹ سی ہوئی مگر رہٹ چل رہا تھا اور سردار خان دھنیئے اور مرچوں کی کیاریوں میں گوڈی کر رہا تھا۔

«کہاں ہے سردارا"——؟

چوہدری کی آواز ہجوم کو چیرتی ہوئی سڑک کے کنارے بنے ہوئے گھروں تک پھیل گئی تھی۔ عورتوں نے اپنے دوپٹے سنبھال لئے مگر ان کی گردنیں اب بھی منڈیروں سے باہر ابل رہی تھیں۔ فضا میں سانسوں کا غبار سا جم گیا تھا صرف رہٹ چلنے کی آواز آرہی تھی اور پانی چل رہا تھا جیسے کوئی مسلسل جی رہا ہو۔

چوہدری کی گرجدار آواز کے ساتھ ہی چند گردنیں اُدھر کو مڑ گئیں جدھر سردار خاں گوڈی کر رہا تھا اور چوہدری نے بھی گھوڑے کی باگ اسی طرف موڑ دی۔ تھوہر کے خاک آلود پودوں سے گریزپا ہو کر گھوڑے نے کمر لچکائی اور سردار خاں کے سر پر جا کر ہنہنایا۔

«فضل دین —— اس سے کہو کہ گوڈی کرنا چھوڑ دے اور ہم سے بات کرے۔"

چوہدری نے اپنے لہجے کو تولتے ہوئے کہا مگر سردار خان کھرپی ہاتھ میں لئے پہلے ہی اٹھ چکا تھا اس نے چوہدری کو نظر بھر کے دیکھا اور پھر مسکرا دیا۔

«کیا بات ہے چوہدری"۔؟

«رہٹ کیوں چل رہا ہے"۔؟

«باپ دادا کی وراثت ہے مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو"؟

سردار خاں نے کھرپی سے لگی ہوئی گیلی مٹی صاف کرتے ہوئے کہا۔

«اوجی ..... چھوڑو جی .... چوہدری جی ...... رہٹ نہیں چلے گا ..... آپ چلو".... فضل دین کی آنکھوں میں بھرا ہوا خوف اس کی ہونٹوں میں کپکپایا۔

«تم بیچ میں مت بولو فضلو".....

سردار خاں کی مسکراہٹ اچانک غائب ہو گئی پھر اس نے چوہدری کو مخاطب کیا۔

«چوہدری —— اگر رہٹ بند کرنے کا حکم لے کر آئے ہو تو اچھی طرح سن لو کہ رہٹ بند نہیں ہوگا۔"

چوہدری گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے تن گیا، رکابوں پر اس کے پیروں کا بوجھ بڑھ گیا اور گھوڑے کی کمر پر اس کی رانوں کی گرفت سخت ہو گئی تب اس نے دونالی بندوق اپنے کندھے سے اتارتے ہوئے کہا۔

«تمہارے باپ دادا کی وراثت کو ہمارے باپ دادا نے کبھی نہیں چلنے دیا، بیلوں کو روک دو۔"

چوہدری کی آواز میں سانپ جیسی پھنکار تھی۔

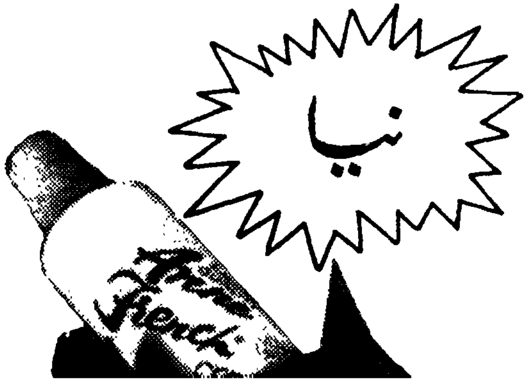
«میں چلتے پانی کو روکتا نہیں اسے چلنے دیتا ہوں، پھیلنے دیتا ہوں تاکہ ہریالی بھی پھیلے۔ تم میں ہمت ہو تو بیلوں کو روک دو"

اور پھر چوہدری نے بیلوں کی جوڑی روکنے سے پہلے سردار خاں کے دل کی دھڑکنیں روک دیں۔ سردار خاں جب پیٹھ کے بل کنوئیں کی منڈیر سے ٹکرایا تو کھرپی اس کے ہاتھ سے نکل کر کنوئیں میں گر چکی تھی۔ بیلوں کی جوڑی رک چکی تھی مگر رہٹ چل رہا تھا۔ پھر جب چوہدری نے گھوڑے کو ایڑ لگا کر تھوہر کے خاک آلود پودوں کو پار کیا اس وقت تک سڑک اور سڑک کی دوسری طرف کے سارے آنگن خالی ہو چکے تھے، خام


sunburst
with
LAW

ض

سیپ کراچی



این فرینچ کا

نیا کفایتی پیک
زیادہ دن تک استعمال کیجئے

۵۶ گرام ٹیوب
قیمت صرف ۱۰ روپے

Anne French
cream
hair remover

این فرینچ کریم یا لوشن لگایئے۔
چند منٹ انتظار کیجئے اور پھر
این فرینچ کا موثر بالصفا عمل
خراش، جلن یا بدنما جڑیں چھوڑے بغیر
بال صاف کر دیتا ہے۔



این فرینچ

غیر ضروری بالوں کو سہولت سے صاف کرتا ہے۔

MNJ

پڑتے پڑتے سناٹا چھا چکا تھا مگر پانی چل رہا تھا — جیسے کوئی مسلسل جی رہا ہو۔

پانی اب بھی چل رہا تھا اور ماسی نیکو دھنیئے اور مرچوں کی کیاریوں میں گوڈی کر رہی تھی۔ اور فضل دین کہہ رہا تھا۔

"بہت برا ہوا علی بخش ...... بہت برا ہوا ....."

میں کہانی کہنے والے علی بخش کے ساتھ ہی کھڑا یہ عجیب و غریب منظر دیکھ رہا تھا۔ اب ہجوم کی بھنبھناہٹ صاف لفظوں میں بدل رہی تھی۔ سب یہی کہہ رہے تھے کہ چوہدری شہر سے واپس آیا تو بہت گڑبڑ ہوگی۔

وہ اپنی سیاسی جماعت کے جلسے میں گیا ہوا ہے۔ کل واپس آجائے گا۔

ماسی نیکو کو رہٹ چلانے سے منع کر دینا چاہیئے......

مگر ان باتوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ماسی نیکو کو رہٹ چلانے سے منع کر دے — پھر ہجوم چھٹنے لگا اور تھوڑی دیر بعد سڑک خالی ہوگئی۔ میں علی بخش کو چھوڑ کر تھوہر کے خاک آلود پودوں کو عبور کرتا ہوا رہٹ کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا، درختوں کی شاخیں چڑیوں سے بھر گئی تھیں۔ رہٹ کی آواز، چڑیوں کی چہچہاہٹ اور پانی کی آواز مل کر ایک عجیب سماں باندھ رہی تھی میرے نزدیک یہ کسی اندیکھی شے کا حسن تھا جو وجود اختیار کر رہا تھا یا جیسے کوئی آواز میرے اندر جاگ رہی ہو۔ آسمان پر پرندوں کی قطاریں نیچی پرواز کرتے ہوئے اب بھی درختوں میں اتر رہی تھیں اور کنوئیں کی گہرائی سے بہل کے لوٹے قطرہ قطرہ ٹپکتے ہوئے اوپر آ رہے تھے جن سے ایک شور سا پیدا ہو رہا تھا۔ میں پانی کے اس شور اور چڑیوں کی چہچہاہٹ کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ میری زندگی کی پہلی شام تھی جس میں کھو جانے کو جی چاہا کہ اس شام کو دیکھ کر مجھے علی بخش کی کہانیاں سچی معلوم ہونے لگیں۔ وہ اپنے لفظوں میں ایسے ہی منظر کھینچتا تھا۔ میں بہت دیر تک اس منظر کا ایک حصہ بنا رہا اور جب ماسی نیکو کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔

"تم کیا کر رہے ہو یہاں — جاؤ اپنے گھر تمہاری ماں پریشان ہوگی۔"

ماسی نیکو میرے قریب آگئی تھی۔ اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں گیلی مٹی کے ساتھ ساتھ دھنیئے کے سبز پتے تھے اور وہ کمر پر بھی بھونی گیلی مٹی صاف کر رہی تھی۔ اندھیرے میں اس کے ہاتھوں کا نور جیسے میری آنکھوں میں اترنے لگا تھا پھر جب میں تھوہر کے خاک آلود پودے کو عبور کر رہا تھا تو اس نے مجھے یاد دلایا۔

"دیکھو — جلدی جاؤ اور سونا نہیں آج رات پھر تمہاری آنکھوں میں دارو ڈالنا ہے — جاؤ ..... شاباش ....."

تب میں اس کے کھولی نما مکان کے پاس سے گزرا جہاں وہ دیا جلا چکی تھی۔ رہٹ کی آواز میرے ساتھ ساتھ میرے گھر تک آئی اور دیر تک آتی رہی۔

رات کو جب ہم کھانا کھا چکے تو میری ماں نے چولہے میں دہکتے ہوئے انگارے تماں میں ڈالے اور ہم سونے والے کمرے میں آگئے۔ کچھ ہی دیر بعد کہانی کہنے والا علی بخش بھی آ پہنچا۔ اس کے آتے ہی ہم سب اپنی اپنی رضائیوں میں گھس گئے اور علی بخش میرے دادا کے پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ تب ہم سب کی "ہوں ہوں" کے درمیان علی بخش نے پچھلی رات والی ادھوری کہانی کو آگے بڑھایا۔

پھر دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں مہینے سالوں میں بدلتے گئے۔ ایک آقا جاتی سنانیں خدا کی عبادت کرتیں اور ایک دن انہوں نے خدا سے دعا کی کہ اے خدائے ذوالجلال مجھے اپنا جلوہ دکھا اور خدا نے انہیں کوہ طور پر بلایا اور انہوں نے خدا سے کلام کیا اور اس کا جلوہ دکھا کر ملک بھسم کر دیتا لیکن یہاں ...

اس الوہی روشنی کے آگے راکھ تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

علی بخش کہانی کہتا رہا اور ہم سب "ہوں ہوں" کرتے رہے اور پھر ایک آواز قرآنی آیات کی تلاوت کرتے ہوئے بند دروازوں کی جھریوں سے اندر آئی ۔ ۔ ۔ ۔ پھر دروازہ کھلا اور ماسی نیکو نے اپنا دیا زمین پر رکھ دیا اور اس نے میری آنکھوں میں دارو ڈالا اور میری ماں سے کہا کہ وہ ترامی کی راکھ اپنے دوپٹے میں باندھ دے۔ میری ماں نے ایسا ہی کیا اور ماسی نیکو نے وہ راکھ میری آنکھوں پر باندھ دی ۔ رات بھر ان ہاتھوں کا نور میری آنکھوں میں اترتا رہا۔ علی بخش کی کہانی کے ساتھ ساتھ میں سوتا جاگتا رہا ، رہٹ چلتا رہا، پانی چلنے کی آواز میرے اندر اترتی رہی اور ماسی نیکو کے کھولی نما مکان میں دیا جلتا رہا۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو میری آنکھیں بالکل ٹھیک تھیں بلکہ ان میں پہلے سے زیادہ چمک تھی اور جب میں تھوڑی دیر کے بعد سڑک پر نکلا تو ہر چھوٹا بڑا سڑک پکڑے شہر کی طرف جا رہا تھا۔ میں ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ نعروں کی آواز ہوا میں تیرتی ہوئی میرے کانوں سے ٹکرائی ۔ میں بھی چوہدری کے گھوڑے کی طرح دُلکی چال چلتے ہوئے اُدھر کو ہو لیا جدھر سے آواز آئی تھی ۔ کمہاروں کی بھٹی والا موڑ مڑتے ہی میں نے دیکھا کہ دور دور تک آدم ہی آدم تھا۔ چاچا فضل دین کے ایک ہاتھ میں حقہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں گھوڑے کی باگیں اور ہجوم نعرے لگا رہا تھا— "چوہدری صاحب زندہ باد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب میں قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ سُرمے کی باریک دھار نے چوہدری کی آنکھوں میں ایک عجیب سانشہ پیدا کیا ہوا ہے، خضاب لگی مونچھوں نے اس کے چہرے پر خود پسندی جیسے کسی احساس کا رنگ گہرا کر دیا تھا، کنپٹیوں کے بال بڑے سلیقے سے جمے ہوئے تھے ، کلف لگے بادامی رنگ کے شلوار قمیض پر میچ کرتی ہوئی واسکٹ کی جیب میں گلاب کا تازہ پھول عجب بہار دے رہا تھا۔ پیروں میں سنہری جوتے تھے جو پیتل کی رکاب کے ہالے میں دمک رہے تھے، انگریزی صابن سے نہلائے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ سفید ساٹن کی طرح چمک رہی تھی ۔ میرے پہنچتے ہی پہنچتے چوہدری نے ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ انگوٹھیوں والا ہاتھ بلند کیا جس کے ساتھ ہی ہجوم بھی خاموش ہو گیا۔

> میرے دوستو، میرے رفیقو، میرے بھائیو! میں آج جو کچھ بھی ہوں آپ کی وجہ سے ہوں، میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ اپنی پارٹی کی میٹنگ میں آپ کے مفادات کی بات کروں ۔ میری کامیابی آپ کی کامیابی ہے آپ کی دعاؤں سے ہماری میٹنگ بہت کامیاب رہی ۔ گزشتہ پندرہ سالوں میں آپ حضرات کی جتنی خدمت میں نے کی ہے آئندہ اس سے زیادہ کروں گا ۔ اس میٹنگ میں بھی اپنے گاؤں کی ترقی اور خوشحالی کے لئے میں نے سفارشات پیش کی ہیں ان کی تفصیلات بتلانے کے لئے بہت جلد میں آپ لوگوں کو دوبارہ زحمت دوں گا۔ موجودہ سیاست میں ہر پارٹی کا نعرہ یہ ہے کہ جو بوئے گا وہی کاٹے گا مگر یہ نعرہ ہمارے لئے صرف نعرہ نہیں بلکہ ہماری زندگی کا پہلا اصول ہے اور ہم اس پر عمل کرتے رہے ہیں اور ان شاء اللہ کرتے رہیں گے۔

ہجوم ایک بار پھر زندہ ہو گیا۔ پندرہ منٹ کی مسافت ایک گھنٹے میں طے کر کے جب یہ قافلہ سرداروں کے محلے میں پہنچا تو سورج سر پر آ چکا تھا۔ لوگوں کے بے تاب اور بھاری قدموں کے نیچے آتے آتے میں کئی بار بچا مگر پھر بھی ہجوم کے ساتھ تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ رہٹ چلنے کی آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور جہاں میں تھا وہاں سے نکلنا میرے لئے مشکل تھا، چوہدری کے سنہری جوتوں کی چمک بار بار میری آنکھوں میں لہرا رہی تھی کہ چاچا فضل دین کے ساتھ رہنے کی کوشش میں اب میں گرتے پڑتے لوگوں کے درمیان آ گیا تھا۔

جب قافلہ حویلی میں اترا تو ہجوم کی سانسیں آہستہ آہستہ واپس لوٹیں۔ جب آوازیں کچھ مدہم ہوئیں تو چوہدری نے تخت پر بیٹھتے

ہوئے ایک رسمی سوال کیا۔؟ "ہماری غیر موجودگی میں یہاں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی"۔۔۔؟

اس سوال کے جواب میں چاچا فضل دین نے چلم بھرتے ہوئے باقی لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھا... سب چپ تھے۔ چوہدری کو یہ خاموشی بڑی معنی خیز لگی۔ اس نے ایک ایک کے چہرے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا کہ سب اس کے اپنے تھے ۔۔ مگر اس خاموشی میں صرف چاچا فضل دین ہی کی آواز کانپی۔ "لو..... جی چوہدری جی .... چلم تیار ہو گئی"

"میں نے گاؤں کے بارے میں پوچھا ہے"۔۔ چوہدری نے چاچا فضل دین کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"او..... جی.... کچھ خاص بات نہیں ہوئی..... وہ بات یہ ہے کہ کل.... سردار خاں.... کا تھا نا وہ ... کیا نام ہے رہٹ تو وہ ذرا کی دیر کو چلا جی بس..... اور تو جی آپ جانتے ہیں.... آپ مائی باپ ہیں"

چاچا فضل دین کے آخری الفاظ شائد چوہدری نے اپنے طور پر عادتاً سنے تھے مگر اس نے چاچا فضل دین کو آگے نہ بولنے دیا۔

"کس نے چلایا تھا"۔۔۔؟

"نیکو بھرجائی نے"

چوہدری کی آنکھوں میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تو ہوئی لیکن پھر اس کی سانس اس کے پھیپھڑوں کے قابو میں آگئی۔

اچھا تم لوگ جاؤ...... شام کو ملاقات ہوگی۔

میں چاچا فضل دین کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا..... میں نے دیکھا کہ لوگوں نے اپنے پتھریلے چہروں کے رخ بڑی مشکل سے اپنے اپنے گھروں کی طرف موڑے تھے۔ ان کے جانے کے بعد چوہدری نے سنہرے جوتوں سے اپنے پیر نکالے اور تخت پر رکھ لئے۔ چاچا فضل دین ذرا سا آگے کو جھکا۔ حقے کی نے چوہدری کے ہاتھ میں دی اور خود اس کے پیر دبانے لگا۔ میں نے یہ دیکھا اور بیٹھک سے نکل آیا۔ باہر نکلتے وقت مجھے ایسا لگا جیسے میں اپنے پیچھے گہرا سناٹا چھوڑ آیا ہوں۔ ابھی سڑک مجھ سے بہت دور تھی مگر رہٹ کی آواز میرے کانوں تک آرہی تھی۔ اور جب میں سڑک پر پہنچا تو کھوبر کے خاک آلود پودوں سے اس طرف دور دور تک کیاریاں پانی سے بھری ہوئی تھیں لیکن آس پاس بہت اداسی پھیلی ہوئی تھی جیسے ماسی نیکو اچانک تنہا ہو گئی ہو۔ اور حقیقت بھی یہی تھی ۔۔۔ مگر اس کے ہاتھوں کا نور تو سب کے لئے ایک جیسا تھا۔

سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے چوہدری کا گھوڑا اپنی پیٹھ کی سفید ساٹن جیسی چمکار گلیوں میں چھوڑتا ہوا اچانک سڑک پر نکل آیا۔ ماسی نیکو اس وقت گھی توری کا باڑہ صاف کر رہی تھی۔ بیلوں کی جوڑی اپنے دائرے میں چل رہی تھی۔ ٹہل کے لوٹے کنوئیں میں غوطے لگا رہے تھے اور پانی نالیوں کے جال میں دندناتا پھر رہا تھا۔ آن کی آن میں چوہدری کی آمد سارے میں پھیل گئی اور سڑک کی دوسری طرف لوگوں کا ہجوم لگ گیا۔ ایک لمحے کے لئے چوہدری نے کچھ سوچا اور پھر رہٹ کا ایک چکر کاٹ کر بیلوں کے سامنے آ گیا۔ گھوڑے کی ہنہناہٹ سن کر بیلوں کی جوڑی ٹھٹھک گئی۔ کھوپوں کے اندر ان کی آنکھیں ایک گھڑ سوار کو دیکھ رہی تھیں۔ رہٹ رکا تو ماسی نیکو نے پلٹ کر دیکھا۔ درختوں پر چڑیاں خاموش ہو چکی تھیں۔ میں نے کنوئیں کی منڈیر سے جھانکتے ہوئے دیکھا کہ ماسی نیکو کا چہرہ ڈوبتے ہوئے سورج کے عین سامنے تھا اس کے ایک ہاتھ میں درانتی تھی اور ایک ہاتھ میں گھی توری کی خشک بیل ۔۔ وہ ان دونوں چیزوں سمیت اٹھی اور بیلوں کی جوڑی کے ساتھ ساتھ چوہدری کے عین سامنے کھڑی ہو گئی۔

"چوہدری ۔۔ کنوئیں میں پانی ہو تو بیلیں زرد ہوتی ہوئی اچھی نہیں لگتیں۔ تم نے بیلوں کو کیوں روک دیا ہے سامنے سے ہٹ جاؤ"۔

میں کنوئیں کی منڈیر سے ہٹ کر پانی کی بڑی نالی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا اور چوہدری

کی سانسیں الٹی چل رہی تھیں۔

چاچا فضل دین نے جو چوہدری کے ساتھ ہی آیا تھا وہ اس گمبھیرتا کو توڑنے کے لئے کچھ بولنا چاہتا تھا مگر ماسی نیکو نے اسے موقع نہ دیا — وہ کہہ رہی تھی۔

"چوہدری — یہ میری کھیتیاں ہیں یہ رہٹ یہ بیل یہ کیاریاں ..... یہ سب کچھ میرا ہے یہ سردار خان کے باپ دادا کی وراثت ہے .... یہ کنواں تم دیکھ رہے ہو — یہ جو تمہارے یہاں ہونے کی وجہ سے چپ ہو گیا ہے میرے باپ دادا نے کھودا ہے۔ اس کے اندھیروں سے اجالے طلوع کرنا میرا فرض ہے — چوہدری — تم سردار خان کی نیک بانو کے علاوہ ہر اس شخص کو بیوقوف بنا سکتے ہو اس پر ظلم ڈھا سکتے ہو جو تمہاری تقریروں، تمہارے دعدوں اور تمہاری آنکھوں پر یقین رکھتا ہو مگر اپنی قوت بازو پر بھروسا نہ رکھتا ہو — چلے جاؤ — تمہاری آنکھوں میں ڈولتے ہوئے ارادوں کو میں نے اور میرے حوصلوں نے پہلے بھی آزمایا ہے۔ اب اگر تم نے بندوق کی نالی سیدھی کی تو گولی الٹے رخ پر چلے گی چوہدری۔"

مجھے یوں لگا جیسے ماسی نیکو کی دھیمی دھیمی آنچ کی طرح سلگتی ہوئی آواز میں درختوں کی سرسراہٹ، چڑیوں کی چہچہاہٹ، دھنیے اور گھی توری کی مہک اور پانی چلنے کی آواز — سبھی کچھ شامل تھا۔

"تم چلتے پانی کو اب نہیں روک سکو گے چوہدری" ماسی نیکو بے پناہ ضبط کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

"اب پانی چلتا رہے گا، پھیلتا رہے گا اور سبز کھیتوں اور خوشبوؤں کی مہک تمہارے گھر تک جائے گی۔ ہم نے جینے کا ڈھنگ نہ تم سے سیکھا ہے نہ تمہاری پارٹی کے دعدوں سے۔ یہ ڈھنگ ہم نے اپنے آپ سے سیکھا ہے، زمین سے سیکھا ہے اور بدلتے ہوئے موسموں سے سیکھا ہے۔ ماسی نیکو بولتی جا رہی تھی اور چوہدری کی سرخ انگی آنکھیں دھک رہی تھیں، ہونٹ حرکت نہیں کر رہے تھے بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے مٹھی بھر ناپاک ریت اس کی آنکھوں میں انڈیل دی ہو۔

سناٹا چاروں طرف سے اپنے گنبد کو سمیٹ رہا تھا۔ اب چوہدری کے چہرے پر آنکھوں کی جگہ گوشت کی دو تازہ بوٹیاں پھڑک رہی تھیں اور دوسری طرف ماسی نیکو کا بے حد پرسکون چہرا تھا اور ان دونوں کے درمیان یا ان کے ذہنوں کے درمیان یا ان کے ماضیوں کے درمیان یا ان کے اعمال کے درمیان دس سال پہلے کا ایک خونی لمحہ سردار خان کی لاش کی طرح جھول رہا تھا۔ وہ دونوں اس لمحے کی قوت کے اسیر تھے پھر جیسے اس لمحے کی قوت نے ماسی نیکو کو آگے بڑھنے کا اذن دے دیا اور وہ ایک عجیب — باوقار چال چلتے ہوئے آگے بڑھی۔ گھی توری کی خشک بیل جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی اس سے بیلوں کو ہنکایا۔ بیل یوں آگے بڑھے جیسے کائنات نے اس سناٹے میں پہلی سانس لی ہو۔ اور چوہدری کا گھوڑا الٹے پاؤں دائرے میں چکر کاٹتا ہوا باہر نکل آیا

گھوڑے کا باہر نکلنا تھا کہ سڑک پر ساکت و جامد ہجوم تتر بتر ہو گیا اور چاچا فضل دین سر جھکائے دوسری جانب چل دیا۔ درختوں میں چڑیوں کا رکا ہوا گیت رہٹ کی آواز کے ساتھ دوبارہ شروع ہو گیا اور میں نے چوہدری کی دھکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر سوچا کہ آج رات قرآنی آیات کی تلاوت کرتی ہوئی ایک آواز اپنے ہاتھوں میں دیا اٹھائے حویلی کا دروازہ کھولے گی اور چوہدری کی آنکھوں میں ضرور دار اوڑھا لے گی۔

جب میں یہ سوچ رہا تھا تو اس وقت چوہدری کا گھوڑا پلٹ کر سڑک پار کر رہا تھا اور اس کے پیچھے رہٹ کی آواز اور چڑیوں کا گیت تھا اور پانی چل رہا تھا جیسے کوئی مسلسل جی رہا ہو۔



روز روز کا قصّہ

علی تنہا

نیم دائرے میں آکر کرسیاں ختم ہوگئیں۔ سامنے ایک بہت بڑا پردہ تھا۔ اس کے دائیں بائیں سرخ اور ہرے رنگ کی بتیاں۔ کھڑکیوں پر اگرچہ کالے رنگ کا کاغذ چڑھا تھا۔ لیکن پتلے کاغذ سے روشنی سسک سسک کر باہر نکل رہی تھی۔ ایک دم سے روشنیاں گل ہوگئیں۔

پچھلی کرسیوں سے آواز کے اژدھام کے اٹھتے ہی پھر بتیاں روشن ہوگئیں۔ پچھلی قطار کے چھٹے ہوئے کے درمیان کوئی لڑ رہا تھا۔ لیکن روشنی کے آتے ہی وہ بھی چپ سادھ گیا۔ اس نے مڑ کر پچھلی قطار کے سب لوگوں کو دیکھنا چاہا۔ سب ایک ہی دور دراز کی شے کی ہیبت میں گردنیں اٹھا اٹھا کر آگے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی عورت کی آنکھوں میں آسمان کی سی بھری بھری شاندار خاموشی تھی۔ آسمان کبھی تو گدلا ہی جاتا ہے اور تمہیں تو اس پہ دن رات تو برا جتے ہی ہیں۔ لیکن یہاں کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ اسی کچھ نہ ہونے سے ایک کائنات جنم لے رہی تھی اس کائنات کے اردگرد پتلی چینٹوں والا لباس مڑھا ہوتا تو کیا ہوتا۔ اس نے انگلیوں کے سروں سے عورت کا مہین کف پکڑ کر ہلایا۔

"کیا بجا ہے جی"

"وقت تو ہوا ہی چاہتا ہے" اس نے کرسی کی ہتھی بجا کر کہا "سنا ہے کھیل زوردوں کا ہے"

"کس سے سنا آپ نے"

"جناب میں نے سنا تھا۔ بھائی کرم داد سے۔ وہ پچھلے سال یہاں آیا تھا۔ بے چارے پہ مقدمہ تھا" اس نے کھانس کر عورت کی طرف غور سے دیکھا۔

"اب بھی ہے۔ سال میں پانچ دس بار تو یہاں آہی جاتا ہے"

"کیوں جی" عورت نے بچے کو شال میں لپیٹ کر پاؤں پھیلانے کو جگہ بنائی۔

کئی سالوں سے چل رہا ہے یہ کھیل؟

"اور تو۔ نہیں" اس پھپلے منہ اور سفاچٹ چہرے والے شخص نے جواب دیا۔

"ہاشم"

"کیا ہے؟"

عورت نے گھٹنوں کے گرد ہاتھ باندھ کر پوچھا "میرا تو جی رونے لگا ہے یہاں"

" اے ہے " مرد بولا۔ پھر عورت پر قدرے جھک کر کچھ بدبدانے لگا۔ کیوں کہ پیچھے سے آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ پھر بیچ والی قطار میں کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوتے۔ جیسے کوئی بہت عجیب بات واقع ہوگئی ہے۔ مرد نے جو اس وقت عورت کے بھرے بھرے شانے پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ کہا " یہ درمیان والی قطار بہت ندیدی ہے۔ ذری کوئی بات دیکھی اور شور مچادیا "

برساتی اوڑھے ان کے برابر جو شخص بیٹھا تھا۔ اس نے برساتی کے لیے سامنے والے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن ہاتھ جیب کے بجائے سیدھا برساتی کے استر کے پار اتر گیا۔ اس نے ننگے سینے پر انگلی بجا کر خود ہی کہا۔

" یہاں تو ایسا ہی ہے "

" ہاں جی " وہ مرد عورت کو داد دینے کے انداز میں کہنے لگا " یہاں تو بڑی زبردست چیہم دھاڑ رہتی ہے اب میں، بھائی گلزار اور بجیا پچھلی جمعرات کو آئے تو وہ اودھم مچا کر رہے نام اللہ کا۔ "

" پھر " دوسرے مرد نے رومال نکال کر منہ پونچھا۔

" پھر خود ہی چپ ہو لئے "

عورت نے ساتھ والے شخص سے پوچھا۔

" یہ اتنی دیر آخر کرتے کیوں ہیں "

" بس جی رواج ہی پڑھ گیا ہے۔ جو بھی کام ہے۔ دیر سے ہو رہا ہے۔ مگر پچھلی دفعہ تو ایسا ہوا نہیں "

" پچھلی دفعہ آپ کب آئے تھے ؟ مرد نے سوال کیا۔

" میں کب آیا تھا جناب " وہ انگلیوں پر حساب کر کے بولا۔

" بس جناب مہینے کی چودہ تاریخ تھی شاید "

روشنی پھر چلی گئی۔ لیکن کوئی شخص نہیں بولا " روشنی جانے پر کون بولتا ہے "۔ عورت اور دوسرے مرد نے سوچا۔ برساتی بر اس کی چھٹی ہوئی کا کلیس اندھیرے میں گم سی ہو گئیں۔ خاصی دیر بعد روشنی آئی برساتی پہنے ہوئے شخص نے دیکھا۔ عورت کا سر اس لمبے منہ والے مرد کے کندھے پر ٹکا ہے۔ روشنی آتے ہی کی چادر سنبھالی۔ اور انگڑائی لے کر پوچھنے لگی۔

" کہانی کیا ہے اس کھیل کی "

" کہانی .... جی ...." وہ شخص جیسے اس سوال کے انتظار میں مرا جاتا تھا۔ بہت جلد میں بولا۔

" کہانی تو خیر آپ سمجھ ہی لیں گی آج کی .... لیکن ...."

" لیکن کیا " مرد عورت دونوں بول اٹھے۔

" کہانی نہیں کہنے کی۔ خیر۔ ایک اور کہانی ہے اس سے ملتی جلتی "

عورت نے نیل گول بلاؤز پر ہاتھ دھر کر پہلے تو اسے ایک نظر دیکھا۔ پھر مدہم آواز میں استفار کیا۔

" کیا کہانی ہے "

کہانی تو ہے۔ اندھوں کی بستی کی۔ آپ جانیں اندھے تو البسواسی غضب کے ہوتے ہیں۔ ایک شام بارش میں کوئی اندھا سنہ بھول کر کنویں میں جا گرتا ہے "

" ہائے اللہ "

مرد نے ہولناک سا جبڑا کھول کر چھینک ماری ''ہاں تو جناب اندھا بے چارا کنوئیں میں جارہتا ہے۔ اب رات آنے تک بستی میں ڈھنڈیا پٹ جاتی ہے کہ فلاں نہ رہا۔''

''اے سگو، اندھوں کو پتہ کیسے چلا۔''

''بس جی'' اس نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ ہو گئی کسی طرح خبر۔ اچھا تو اب جو بھی اندھا باہر نکلتا ہے، ایک کتا ہے یہ بڑا۔ ادھر نے اسے کسی طرح سدھار کھا ہے۔ اسے لے کر کنوئیں کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں سب کے سب۔ بارش اور تیز جھکڑ میں گرتے پڑتے آگے ہی آگے نکلتے جاتے ہیں۔ لیکن۔ آہ...''

عورت نے روتے بچے کو بازوؤں میں اٹھا کر ہلکورا دیا۔ اس پر بچہ ایک لمحے کو خاموش ہو گیا۔

''پھر؟''

''پھر بستی کے باہر جہاں کنواں ہے۔ اس کی منڈیر پر ایک اور کتا بیٹھا ہے۔ بستی کے کتے کو دیکھ کر پہلے تو غراتا ہے۔ پھر لپک کر کتے کی گردن میں دانت کھبو دیتا ہے۔ دونوں آپس میں لڑتے ہیں کہ اللہ کی امان۔''

''تو اندھے والے اپنے کتے کو چھڑاتے نہیں؟''

''نہیں جی۔ وہ کیسے چھڑائیں؟''

''کیوں'' پوپلے منہ والے شخص نے بیچ میں کہا۔

''بھئی کیسے چھڑائیں۔ انہیں دکھلائی تھوڑی پڑتا ہے۔''

''ہاں جی'' برساتی والے شخص نے اثبات میں سر ہلایا۔

''لڑتے لڑتے کتے کنوئیں میں گر پڑتے ہیں۔''

''اوئی اللہ'' عورت نے گھبرا کر بچے کو سینے سے چمٹا لیا'' کنوئیں میں گر پڑتے ہیں''

برساتی والے شخص نے پوچھا'' آپ کے پاس ماچس ہوگی''؟

''نہیں جناب''

''خیر'' اس نے سگریٹ انگلیوں میں ہوئے کہا'' ایک اندھا جس کی تل چاولی رنگت میں غصہ بھرا ہے۔ کہتا ہے اے بستی والو۔ لیکن کوئی نہیں سنتا۔''

عورت نے مرد پر جھک کر حیرانی سے پوچھا۔

''کیوں جی۔ یہ لوگ اتنے چپ کیوں ہیں''

مرد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

''اچھا تو پھر؟ عورت نے گھوم کر برساتی والے شخص سے پوچھنا چاہا۔ مگر اس کی کرسی خالی تھی۔ اور وہ برساتی والا شخص ماچس کی تلاش میں آخری قطار میں گھسا جا رہا تھا۔

عورت نے جس کا بچہ اس کے سینے سے لگ کر سو گیا تھا۔ بچے کو آہستہ سے باہوں میں لے لیا۔ اور چھت کے بڑے بڑے فانوسوں کو جلتے بجھتے دیکھا۔ چھت کے نیچے سانسوں کی آواز بہت ماند پڑ گئی تھی۔ لگتا تھا۔ لوگ کرسیوں پر حنوط ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایک جھاڑ پر چھپکلی رینگتی ہوئی دیوار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ عورت کو ابکائی آتے آتے رہ گئی۔ یک لخت آوازیں بلند ہوئیں۔ اور لوگ اپنی




SEIKO
5
The reason for millions of happy watch owners around the world.
SEIKO
Some day all watches will be made this way.
Exclusive Distributors:
FANCY TIME CORP.
P. O. BOX NO. 8564
SADDAR, KARACHI-3. TEL: 515926
Principal Show Room:
LONDON WATCH CO.
ZEBUNISSA STREET, SADDAR,
KARACHI-3. TEL: 511828
WINGS

For Pakistan's most popular traditional dress an exclusive new Lawrencepur look

for SHALwar kurTA Lawrencepur creates SHALTA



By tradition, Lawrencepur is the pioneer in fabric technology
Now, for Pakistan's most popular traditional dress Lawrencepur presents *an exclusive new look.*

For Shalwar Kurta, Lawrencepur creates Shalta. A new fabric with a smooth texture and a light-weight fall.

Shalta adds formal fashion to casual comfort. There is a choice of shades for a variety of styles.

Give yourself a new collection of formal wear
Ask for Shalta.

For a great tradition – Shalta gives an elegant new look.

Lawrencepur

اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ عورت نے تذبذب کے عالم میں مرد کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا ہے؟"

مرد نے کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے کہا۔

"اٹھئے اب"

"ارے۔ یہ سب آخر ہے کیا۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے؟"

مرد نے مسکرا کر عورت کا بازو پکڑا۔

"بس یہی تو اس روز روز کے کھیل کی کہانی ہے۔"



حبس

شہناز پروین

"تم نے کبھی G 2 GILLETTE بلیڈ استعمال کیا ہے؟" اس نے غیر متوقع طور پر سوال کر دیا۔

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے چہرے پر نظریں جما کر کہنے لگا "ہاں میں بھی G 2 ہی استعمال کرتا ہوں۔"

"تم نے دیکھا ہے نا ایک مقام پر آکر وہ اک دم لاک ہو جاتا ہے۔"

"ہاں تو پھر کیا ہوا۔ ایک کھٹکے کی آواز ہوتی ہے اور وہ مقفل ہو جاتا ہے۔"

"میں تم سے یہی بتانا چاہتا ہوں، بالکل یہی کیفیت آج میرے ساتھ پیش آئی، صبح ساڑھے چار بجے میری آنکھ کھلی بلکہ یوں کہو میں سو رہا تھا، ایک "میں" سو رہا تھا اور دوسرا "میں" میرے سامنے کرب و بلا سے گزر رہا تھا، مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا جسم بستر پر مردہ پڑا ہے اور اندر سے کوئی شے نکل کر باہر آگئی ہے۔ وہ کیا شے تھی، شاید روح یا میرا جسم مثالی، پتہ نہیں کیا تھا، میں پسینے پسینے ہوا جا رہا تھا کہ ایک جھٹکے کے ساتھ آکر وہ چیز میرے جسم میں داخل ہو گئی ــــــ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ موت آئے گی۔ جب بھی اسی طرح سب کچھ ہو گا، ہم بے بس ہوں گے، سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہو گا لیکن ہمارے بس میں کچھ بھی نہ ہو گا ــــــ" اس نے سگریٹ سلگا لیا اور لمبے کش لے کر صبح کی اذیتناک کیفیت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔

"میرے دوست کیا تمہیں موت پر یقین ہے؟"

"پتہ نہیں مجھے کس بات پر یقین ہے، کس پر نہیں ہے، میں یقین اور لایقینی کے درمیان کھڑا ہوں، جو ہو جاتا ہے اس پر یقین کر لیتا ہوں جو نہیں ہوتا۔ اسے غیر یقینی سمجھ بیٹھتا ہوں۔"

وہ دونوں اپنی گفتگو میں محو تھے اور میں دیر سے ان کے درمیان خاموش بیٹھا تھا۔ کیوں کہ میں یقین اور لایقینی کے درمیان نہیں تھا، میرا مثبت نظریۂ فکر تھا۔ انھیں اس بات کی بھی پرواہ نہ تھی کہ میں ان کے درمیان کیوں بیٹھا ہوں، کیوں آیا ہوں۔ دوسرے آدمی نے پھر پہلے آدمی سے سوال کیا۔

"کیا تم مذہب پر یقین رکھتے ہو؟"

"مذہب میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا۔ پھر تم کون سے مذہب کی بات کرتے ہو؟"

"کسی بھی مذہب کی، دنیا کے تمام مذاہب کی، کیا تمہیں مذہب پر یقین ہے؟"

"نہیں ـــــ میں ایسی باتوں کو نشے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔"

اب میں ان کے درمیان خاموش نہ رہ سکا "مذہب اگر نشہ ہے تو یہ نشہ بڑا کیف آور ہے۔ پھر یہ نشہ خمار کا کرب نہیں پیدا ہونے دیتا، جتنا زیادہ چڑھتا ہے، اتنا ہی کیف آگیں ہوتا جاتا ہے، جس پر چڑھتا ہے اس کی شخصیت مستحکم اور مکمل ہو جاتی ہے، وہ قدآور بن جاتا ہے ٹوٹتا نہیں ہے۔"

وہ مسکرانے لگے، شاید میری بیوقوفی پر، انھوں نے میری باتوں کو صفر سے ضرب دے دیا کیوں کہ میں ویسے بھی ان کے درمیان غیر ضروری تھا۔

"خیر میں ان کو برا تو نہیں کہتا جو مذہب پر یقین رکھتے ہیں بلکہ خوش قسمت سمجھتا ہوں لیکن ـــــ"

"بے وقوف سمجھتے ہیں نا آپ ایسے لوگوں کو ـــــ ؟" وہ ہنس پڑے گویا میں نے ان کے دل کی بات جان لی ہو۔ یکایک ان میں سے پہلے آدمی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ـــ وہ چکرا کر گرنے لگا۔

"میری آنکھیں ـــــ مجھے کچھ ہو رہا ہے ـــــ"

"آپ کو کچھ نہیں ہو رہا، آپ یقین کی طرف لوٹ رہے ہیں۔"

"نہیں میں ـــــ" وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ اسے اپنی ہار کسی قیمت پر منظور نہیں تھی ـــــ "بس یونہی سر چکرا سا گیا تھا۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"جناب اگر دو چار بار آپ اپنی کیفیتوں سے گزرے تو یقیناً آپ کو آگہی حاصل ہو جائے گی۔"

"خیر وہ تو اور بات ہے" ـــــ اس نے مجھے گھورا اور پھر اپنے دوست سے مخاطب ہو گیا۔ "مگر مجھے آگہی کیسے حاصل ہو سکتی ہے، میں تو ایک گنہگار انسان ہوں ـــــ"

"گناہ کا کیا تصور ہے تمھارے یہاں ـــــ"

"نیکی اور بدی کا صرف ایک تصور میرے پاس ہے ـــــ نیکی سے مراد یہ ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو اور بدی سے مراد بالکل اس کے برعکس ہے۔ یعنی میں کسی کا دل دکھاؤں۔"

"تو کیا تم نے کسی کو اپنی ذات سے آزار پہنچایا ہے ـــ ؟"

"نہیں ـــــ !"

"تو پھر تم برے کیسے ہو گئے ـــــ" دوسرے نے مسکرا کر پوچھا۔ جیسے کوئی بہت بڑی عالمانہ بات کہہ دی ہو، پھر اس نے عالمانہ انداز میں فتویٰ بھی صادر کر دیا ـــــ "بس سمجھ لو کہ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا" اس کے ساتھ ہی سگریٹ کا لمبا سا کش لے کر وہ اٹھ کھڑا ہوا "اچھا بھئی سلجھاؤ یہ نیکی اور بدی کی گتھیاں، میں تو چلتا ہوں اپنے کام پر۔" وہ اٹھ کر چلا گیا۔ پھر پہلے آدمی نے اپنے کہے ہوئے جملے کی چبھن خود محسوس کی۔

"میں نے آج تک کسی کا دل نہیں دکھایا۔"

"کیا واقعی ایسا ہے ؟" اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور ذہن کے بہت سے بند دریچے ایک دم سے کھل گئے۔ بہت پہلے کی بات تھی، میں نے اپنے والد کے ساتھ باجماعت نماز پڑھنے سے انکار کر دیا تھا، والد کا چہرہ اتر گیا تھا لیکن انھوں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ چپ چاپ اٹھ کر مسجد چلے گئے تھے۔ دن گزرتے رہے۔ میں نے کئی نافرمانیاں کی تھیں اپنی ماں کی۔ لیکن والدین کی

نافرمانیاں تو سبھی کرتے ہیں، بنے بنائے رستوں پر چلنا کون پسند کرتا ہے، میں نے کوئی گناہ نہیں کیا —" اس نے اپنے سر کو جھٹک دیا لیکن خیالات کا ریلا تھا کہ رو کے نہیں رکتا تھا، بند ٹوٹ جائے تو سیلاب کو کون روک سکتا ہے۔ "کتنا کہا تھا میری ماں نے کہ اس کی پسند پر شادی کر لوں لیکن وہ لڑکی تو مجھے بالکل پسند نہیں تھی جو بچپن سے میرے نام سے منسوب کر دی گئی تھی۔ میرے انکار پر میری ماں کا دل تو ٹوٹا ہی تھا مگر ماں نے کہا تھا، اس لڑکی کا دل میری ماں سے بھی زیادہ دکھی ہوا تھا، وہ بہت روئی تھی اور اس نے سب کے سامنے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ اس کی روح کی گہرائیوں میں اترا ہوا تھا، میں ہی اس کی تمام سوچوں کا محور اور مرکز تھا — لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ کیسے اس بونگی لڑکی سے شادی کر لیتا جو کسی طرح میرے ساتھ نہ ذہنی ہم آہنگی رکھتی تھی نہ مجھے پسند تھی۔ اب ظاہر ہے اسے دل دکھانا تو نہیں کہتے۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ اسے جمی یاد آئی، جمی اور میں ذہنی مطابقت رکھتے تھے، ہماری سوچوں کی لہروں کا سفر ایک تھا۔ میں نے اسے اپنا جیون ساتھی بنانا چاہا تھا، اس نے بھی حامی بھر لی تھی مگر اس کی دو شرطیں تھیں۔ پہلی تو یہ کہ میں اپنے گھر والوں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں جس کے لئے میں ہر گھڑی تیار تھا، آخر رکھا ہی کیا تھا اس دقیانوسی سے گھر میں، لیکن اس کی دوسری شرط بہت تکلیف دہ تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اپنا مذہب چھوڑ دو۔ میری نظروں میں مذہب کا کوئی تصور ہی نہیں تھا لیکن پھر بھی اس کی یہ شرط مجھے پسند نہ آئی۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ لاشعوری طور پر میں اسی مذہب سے وابستہ تھا جو میرے اسلاف کا تھا، پھر اس طرح میرا نام بھی بدل دیا جاتا جو مجھے سب سے زیادہ عزیز تھا۔ میں نے جمی سے نہ صرف شادی سے انکار کر دیا تھا بلکہ دوستی کے رشتے بھی منقطع کر دئے تھے۔ کیوں کہ وہ بھی مجھے اپنے گھر والوں کی طرح دقیانوسی نظر آنے لگی تھی بلکہ منافق بھی، کہاں تو ایک طرف بیدار آزاد خیال اور کہاں اتنی سی بات پر مذہب کی آڑ لے بیٹھی — اس نے چاہا اٹھ کر ماضی کی طرف کھلنے والی کھڑکی ہمیشہ کے لئے بند کر دے۔ اس نے زندگی کا مقصد ہنسنا ہنسانا بنایا تھا، چند لمحوں کی خوشی کے لئے جینا، وہ سب کے لئے ہنستا تھا، سب کو خوش رکھنا چاہتا تھا لیکن کتنے لوگ تھے جو اس کی ذات سے خوش تھے، اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے اب بھی میں بیٹھا ہوا تھا، میں جو اس کے دوست کے اٹھ جانے کے بعد سے اسی طرح بیٹھا اسے دیکھے جا رہا تھا اور اس کے ذہن کی سرسراہٹ کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب اسے مجھ پر بڑا غصہ آیا، اس نے مجھے پہلی بار یوں دیکھا گویا میں اس کی تنہائیوں میں مخل ہو رہا تھا۔

"جناب، آپ کو کوئی کام ہے مجھ سے؟" اس نے بمشکل کہا۔

"جی — لیکن پہلے آپ پانی پی لیں، مجھے آپ کی طبیعت خراب معلوم ہوتی ہے۔" میں نے پاس پڑا ہوا پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا، اس نے بھی سارا پانی پی لیا۔

"جی اب فرمائیے —؟" وہ خالص کاروباری انداز میں گویا ہوا۔

"دراصل میں بہت پریشان ہوں — مجھے پیسوں کی سخت ضرورت ہے، میرے ہاتھ ان دنوں بہت تنگ —"

"بس کرو، بس اتنی سی بات کے لئے اتنی دیر سے میرے پاس بیٹھے تھے، پھر تمہیں اس طرح اندر آنے کی اجازت کس نے دی۔" اس نے گھنٹی بجائی۔ میں نے پرامید نظروں سے اسے دیکھا، چپراسی آیا تو اس نے کہا "صاحب کو راستہ دکھاؤ —" میری آنکھوں کے دئے بجھنے لگے۔ لمحے بھر پہلے نیکی کی جو شمع اس کی آنکھوں میں روشن دیکھی تھی اس کی لو بھی مدھم نظر آ رہی تھی، جاتے جاتے میں نے آخری وار کیا "دراصل آپ نے آج تک کسی کا دل نہیں دکھایا —" اس نے غصے سے پلٹ کر میری طرف دیکھا، اس کا جی چاہا گلا گھونٹ دے میرا — اگلے لمحے وہ خود بھی میرے ساتھ ایئرکنڈیشنڈ کمرے کے حبس سے باہر نکل آیا — اس نے چپکے سے میرے ہاتھ پر سو کا نوٹ رکھ دیا۔

"میں جا رہا ہوں ——"

"کہاں ؟"

"پتہ نہیں —— ؟"

"کہیں تم تھک تو نہیں گئے —— ؟"

"نہیں، میں ابھی چلا ہی کہاں ہوں جو تھکن کا احساس ہو ۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم ابھی نہیں چلے ہو، تمھارا چہرہ تو برسوں کی مسافت طے کرنے کی غمازی کر رہا ہے۔"

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میری روح میرے جسم سے نکل چکی ہے اور میں اس روح کی تلاش میں جا رہا ہوں تاکہ وہ آکر میرے جسم میں دوبارہ داخل ہو جائے۔ پھر میں اسے مقفل کر لوں۔ بالکل اسی طرح جس طرح GILLETTE G 2 ایک کھٹکے سے بند ہو جاتا ہے۔

پہلے آدمی کی موت

طارق جامی

بہت دنوں بعد ملا تھا مگر ہر بار کوئی نہ کوئی نئی حد درک تا تھا جسے میں یا تو نظر انداز کرنے پر قادر ہو جاتا، تو ٹھیک۔ ورنہ رات رات بھر جاگ کر سگریٹ پھونکتا۔ اور اگر کبھی آنکھ لگ بھی جاتی تو مجھے ہر طرف کی دیواریں گرتی نظر آتیں۔ ہر کھڑکی کے پٹ اکھڑتے محسوس ہوتے۔ اور پھر پر سیلاب ہفتوں چڑھا رہتا اور میں ڈوب ڈوب جاتا۔ اس کی باتوں پر بظاہر مجھے یقین نہ آتا۔ مگر جونہی تنہائی میں میں اس کے خیال پر ذہن مرکوز کرتا۔ مجھے دور دور کی ساری گلیاں اندھیروں میں محصور دکھائی دیتیں۔ میں اپنی پوری کوشش کر کے ذہن کو جھٹک جھٹک کر ان نقطوں سے دامن چھڑاتا جو وہ وقتاً فوقتاً مرز! ساعت میں انڈیلتا رہتا۔ مگر یہ کسی طور پر بھی ممکن نہ ہو پاتا۔

اب کے ہم حسبِ معمول، طویل عرصے کے بعد ملا میں نے کہا —— "کیوں بھئی، کیسے ہو؟"

"جیسا تھا، ہوں، اچھا نہیں ہوں!" —— "یار چھوڑو بھی ہر وقت، مایوسی کی باتیں اچھی نہیں لگتیں!"

"اس میں مایوسی کی کیا بات ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ میں یہ باتیں تمہیں خاص طور پر سنانے کے لئے گھڑتا ہوں ——" وہ پھر اپنی رو میں بہنے لگا۔

"نہیں میرا مطلب ہے، کبھی کوئی زندگی سے بھرپور بات بھی ہو جائے، تو کیا قباحت ہے؟"

"بھئی میری نظر میں تو زندگی سے بھرپور تر یہی ہے۔ جو میں دیکھتا ہوں، کہہ دیتا ہوں!"

"اچھا چلو چھوڑو ان باتوں کو، سناؤ کہاں رہے؟"

"جہاں پچھلی پوری ایک صدی سے رینگ رہا ہوں .... مگر یار! ...... یہ دن ہیں کہ روز بروز چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں اور سال ہیں کہ اڑتے چلے جا رہے ہیں ...... آہ! زندگی ہے کہ بھاگی ......"

"اوہو! دنوں کا چھوٹا بڑا ہونا تو معمول ہے!" —— "نہیں بھئی! اب کے تو گرمیوں میں بھی دن بہت چھوٹے رہے ہیں" ——

مجھے اس کے اسی اندازِ گفتگو سے چڑ تھی۔ وہ بات کو ہمیشہ گھما پھرا کر کہنے کا عادی تھا وہ چلا گیا تو مجھے جانے کیوں خواہ مخواہ اس پر غصہ آنے لگا۔

"—— بنتا ہے۔ سالا!"

پھر مہینوں بعد اس کی شکل دیکھنے کو ملی تو میں نے گویا اپنے دل کے سارے کنٹرول کے اس کے آگے

رکھ دیجیے۔

"سنتے ہو یار! میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا۔ میں تمہیں بہت کچھ بتانا چاہتا تھا۔ بہت باتیں تھیں سنانے کی، مگر تم ملے ہی نہیں۔ میں بہت دنوں تک نہیں سویا۔ بس ذرا سا اونگھتا تھا مگر لگتا تھا کہ ادھر میں نے سر رکھا اور ادھر سورج ڈوب گیا۔ اور ایسے ہی کئی سورج ڈوب گئے۔ ایک دن چپڑاسی کہنے لگا۔ صاحب! مینجر صاحب بلا رہے ہیں۔ میں مینجر کے کمرے میں گیا تو مینجر کہنے لگا۔

"کیوں میاں تنخواہ کی ضرورت نہیں ہے کیا۔ دیسے تو ۲۸ تاریخ ہی سے چکر لگنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اب کے پانچ تاریخ ہو گئی ——— میں نے گھڑی دیکھی۔ ۵ جون۔ شام کے چھ بجے تھے۔ واقعی یار دن بہت چھوٹے ہو گئے ہیں ——— تمہیں یہ باتیں کون بتاتا ہے؟"

وہ جواب میں مسکرایا اور کہنے لگا ——— "تمہیں ان باتوں پر یقین کیسے آنے لگا؟"

"نہیں یار بات یہ ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو، میں بھی ویسے ہی سوچنے لگتا ہوں خدارا ایسی باتیں نہ کیا کرو!" ——— "اسکا مطلب ہے تم مجھ سے خوفزدہ ہو ———؟"

"نہیں میں اپنے آپ سے ڈرتا ہوں میں اپنی رائے مستحکم نہیں رکھ سکتا۔ کہ کسی بھی دوسرے شخص کے مقابلے میں کوئی اپنی بات کہہ سکوں بس مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں ہے۔"

"ہاں اصل بات یہی ہے کہ پہلا آدمی مر چکا ہے۔ اب دوسرا آدمی زندہ ہے۔ اور ہر جگہ اب اسی دوسرے آدمی کا اقتدار ہے۔ تم جانتے ہو۔ میرے باپ کی تجارت کتنی وسیع تھی۔ میرے بھائیوں کا روزگار ایسا تھا کہ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کہ یوں ملک سے باہر جا کر ٹھوکریں کھاؤں گا پہلے وہ میرے لئے پہلا آدمی بن کر سوچتے تھے۔ مگر اب ان کی سوچ کا انداز دوسرے آدمیوں کا سا ہو گیا ہے اور مجھے خود بھی اپنے لئے دوسرے آدمی کی طرح رہنا پڑتا ہے کبھی کبھی اس پہلے آدمی کے بارے میں سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔"

"دیکھو۔ بس کرو۔ خدا کے لئے میرے حال پر رحم کھاؤ۔ ایسی بات مت کیا کرو مجھے خوف آتا ہے۔"

"آخر خوف کی بات ہی کیا ہے؛ تمہیں یہ احساس کیوں نہیں ہوتا کہ واقعی پہلا آدمی مر چکا ہے۔"

"میں نہیں مانتا تمہارا یہ اوٹ پٹانگ فلسفہ میں بذاتِ خود پہلا آدمی ہوں۔"

"پہلا آدمی ہونے کا ثبوت دے سکو گے۔؟" ——— "کیا ثبوت چاہیئے تمہیں؟"

"یہی کہ تم پہلے آدمی بن کے دکھا دو!" ——— "کمال کے آدمی ہو میں جب خود بقائمی ہوش و حواس کہہ رہا ہوں کہ میں پہلا آدمی ہوں تو اس سے بڑا اور کیا ثبوت چاہیئے تمہیں۔ میں پہلا آدمی ہوں۔ میں پہلا آدمی ہوں، پہلا آدمی۔۔۔۔۔۔" زوردار مکے سے میز گونج اٹھی۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" اس نے اٹھتے ہوئے جواب دیا اور پھر شہر کی دھند میں اس کا سایہ تحلیل ہو کر نکل گیا۔

اس رات، مجھ پر شدید دورے پڑے اور میں نے بڑے بھیانک خواب دیکھے۔ سر کٹے بھچل پیریاں اور جانے کیسے کیسے خوفناک چہروں کے ہجوم رات بھر گھر کے در و دیوار سے چمٹ چمٹ کر، چھت پر سے الٹے لٹکتے رہے اور میں چیخیں مار مار کے روتا رہا، کئی دفعہ اس ہجوم میں مجھے اپنا چہرہ بھی نظر آیا۔ مگر چہرے کے نیچے دھڑ میرا نہیں تھا پھر ایک طویل تلاش کے بعد مجھے اپنا دھڑ بھی مل گیا۔ مگر اس پر رکھے ہوئے چہرے کو میں نے بے نسبت پایا۔

یہ بھیانک خواب اور خوف کے جھکڑ کئی ہفتے چلتے رہے۔ میں نے اسے بہت ڈھونڈا مگر لگتا تھا۔ جیسے وہ کہیں قریب ہی چھپ کر میرا تماشہ دیکھ رہا ہے ایک رات اسی طرح کی سنگین صورتحال میں میں نے اپنے بڑے بھائیوں کے چہرے بھی تلاش کر لئے مگر اسکے نیچے کا باقی سارا جسم ان کی بیویوں کا تھا۔ خوف سے مری تھرتھری چھوٹ گئی۔ میں اپنے بھائیوں کی شفقت، محبت اور پیارے حسین منظر یاد کر کر کے اس خوفناک تصویر کی گرہیں ذہن سے کھولنے کی کوشش کرتا مگر وہ چہرے پھر سے مرے سامنے آ کھڑے ہوتے میں دیوار کی طرف منہ پھیر کر سو جاتا تو وہ چہرے دیوار سے چمٹ کر رینگتے ہوئے مری گردن تک آ پہنچتے۔ میں سیدھا ہو کر لیٹ جاتا تو وہ چہرے چھت سے الٹے لٹک کر مرا منہ چڑاتے۔ کئی ہفتوں کی نیند اسی خوف کے سیلاب نے ہضم کر لی۔ پھر کچھ عرصہ گزرا تو وہی چھوٹے دن مرے تعاقب میں رہنے لگے۔ اور مالک مکان کے تین ماہ کے کرائے کا اکٹھا بل دیکھ کر مرے اوسان ہی جاتے رہے۔ پھر میں تقریباً اسے بھول ہی گیا۔ دن رات اپنے معمول پر آ گئے۔ اور میں اپنی رائے پر زندہ رہنے لگا۔

ایک دن میں کسی کام سے کسی دفتر گیا۔ میں نے درخواست ایک کلرک کو دیتے ہوئے کہا، "جناب راشن کارڈ بنوانا ہے!" اس نے سر کو اسی طرح کھلی فائل کے چہرے پر جھکائے جھکائے کہا، "یہ دوسرے آدمی کا کام ہے۔" ——— "جی یہی تو پوچھنا ہے کہ کہاں جانا ہوگا؟" میں نے منت سے کہا ——— "سب انسپکٹر کے کلرک کے پاس۔" اس نے وہیں سے جواب دیا۔

میں پوچھتا ہوا سب انسپکٹر کے دفتر پہنچا۔ جو آدمی کلرک کی کرسی پر بیٹھا تھا میں نے اس سے لجاجت سے کہا۔ "جناب! یہ درخواست داخل کرانی ہے!" ——— "جی وہ، یہ دوسرے آدمی کا کام ہے اور وہ آج چھٹی پر ہے!"

"مگر جناب آپ انہی کی جگہ کام کر رہے ہیں نا۔" درخواست گزاری کا لہجہ میں نے برقرار رکھا۔

"ہاں ——— مگر درخواست جمع کرنا میرا کام نہیں!" بے نیازی اُدھر سے بھی جاری و ساری رہی۔

"لیکن یہ درخواست تو فقط فائل میں لگانی ہے۔ کام تو نمبر آنے پر ہی ہوگا!"

"واہ صاحب واہ! اتنی بڑی ذمہ داری کا کام میں بھلا کیسے کر سکتا ہوں۔"

"آپ چاہیں تو کر سکتے ہیں۔" میں نے اصرار قائم رکھا۔

"عجیب آدمی ہیں آپ، کھڑے کھڑے سر کھائے جا رہے ہیں ——— اچھا پہلے انسپکٹر صاحب کے دفتر سے نمبر لگوا آیئے۔" ——— میں بھاگم بھاگ انسپکٹر صاحب کے دفتر پہنچا اور چھوٹتے ہی کلرک سے نمبر لگانے کو کہا مگر جواب نے مرے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی۔ "جناب یہ دوسرے آدمی کا کام ہے اور وہ ابھی نہیں آیا۔" مجھے معلوم نہیں، کیا ہوا مرا دایاں ہاتھ غیر ارادی طور پر جیب میں رینگ گیا اور جو نوٹ پہلے ہاتھ آیا آہستگی سے کلرک کی مٹھی میں منتقل ہو گیا اور نمبر لگ گیا۔ عین اسی لمحے اپنے سامنے کی کھڑکی میں ایک شناسا سا چہرہ دکھائی دیا۔

آج وہ سالوں بعد نظر آیا تھا۔ میں لپک کر باہر نکلا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔ میں نے بھاگ بھاگ کر شہر کی ساری گلیاں چھان ڈالیں مگر وہ کہیں نہ ملا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ آج میں نے ایک دوسرے آدمی کو مار کر پہلے آدمی کو زندہ کر لیا ہے میں اسے دکھانا چاہتا تھا کہ ابھی پہلا آدمی موجود ہے ——— مگر بھاگتے بھاگتے یکدم مجھے یوں لگا کہ جیسے مرے اپنے چہرے کے نیچے میں خود نہیں ہوں۔ میں نے غور سے دیکھا تو واقعی مرے چہرے کے نیچے کوئی اور تھا دوسرا آدمی ——— اسکے ساتھ ہی میں وہیں بیٹھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا!!



ترقی شعاری۔
فروغ پذیری۔
معیاری پیشہ ورانہ مہارت
اور — مزید
اعلیٰ تر صلاحیتیں

یو۔بی۔ایل کی تمام تر کوششیں ان ہی اوصاف کے حصول کی خاطر وقف ہیں تاکہ آپ کو بینکاری کی اعلیٰ ترین خدمات مہیا کی جا سکیں۔ ان ہی کاوشوں کی بدولت بینکاری کے جدید ترین طریق کار رائج کرنے میں یو۔بی۔ایل کو ہمیشہ سبقت حاصل رہی ہے۔ پیش بینی، پیشگی منصوبہ بندی، برتری برقرار رکھنے کی مسلسل کاوش -- ان خصوصیات کے باعث یو۔بی۔ایل آپ کے لئے بینکاری کی ایسی خدمات فراہم کرتا ہے جو بروقت بھی ہوتی ہیں، با صلاحیت بھی اور تخلیقی بھی — خواہ آپ کی ضروریات ملکی بینکاری سے تعلق رکھتی ہوں یا بین الاقوامی بینکاری سے۔ یو۔بی۔ایل کی حیثیت ایک عام بینک کی نہیں ہے۔ اس کا مطمع نظر ہے ترقی شعاری، پیشہ ورانہ مہارت کا اعلیٰ معیار اور مزید اعلیٰ تر صلاحیتوں کا حصول

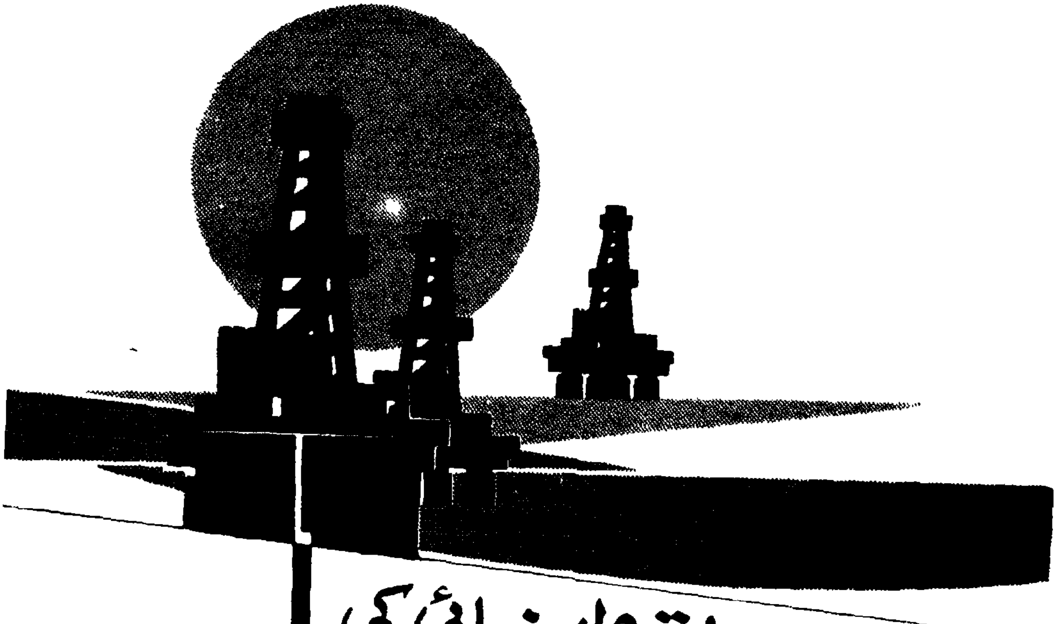
UBL

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ


سدا بہار
تھری اسٹار
3-STARS
SUPERMOST
پاکستان بیٹری مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی


BERGER
BAY OF BENGAL

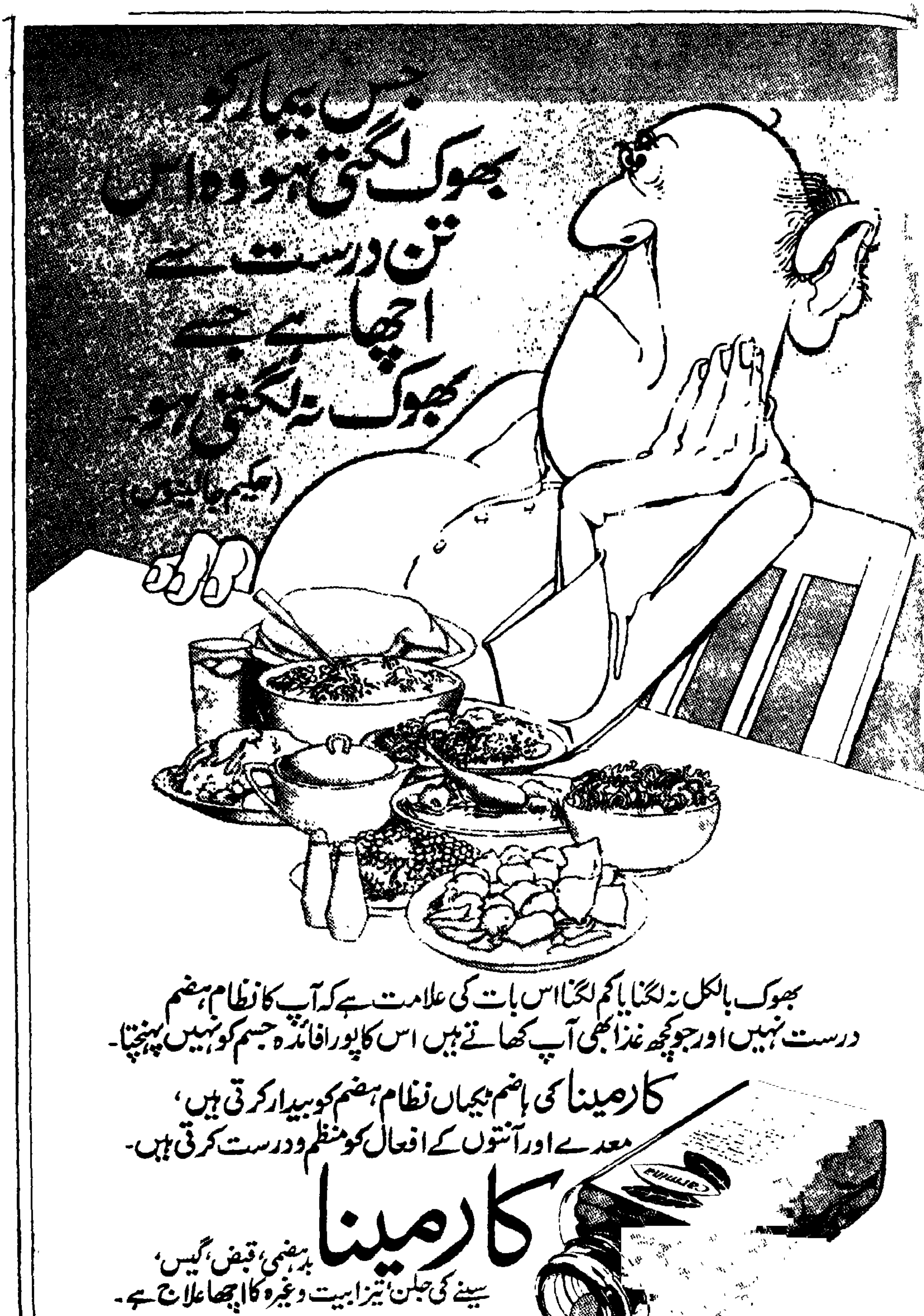
سیپ کراچی








NEW BURQ
نیا برق
لاجواب ڈیٹرجنٹ صاف ترین دھلائی
نئے برق کے جھلملاتے بلبُلوں میں کپڑوں سے میل کچیل باہر نکالنے کی زبردست قوت موجود ہے۔
برق کی صاف و شفاف، اجلی اور چمک دار دھلائی آپ کو برق کی گرویدہ بنادے گی۔
برق کا استعمال گویا: پیسے کی بچت - وقت کی بچت
دادا سوپ فیکٹری لمیٹڈ - کراچی
dsf



جس بیمار کو
بھوک لگتی ہو وہ اس
تن درست سے
اچھا ہے جسے
بھوک نہ لگتی ہو
(حکیم جالینوس)
بھوک بالکل نہ لگنا یا کم لگنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا نظام ہضم
درست نہیں اور جو کچھ غذا بھی آپ کھاتے ہیں اس کا پورا فائدہ جسم کو نہیں پہنچتا۔
کارمینا کی ہاضم ٹکیاں نظام ہضم کو بیدار کرتی ہیں،
معدے اور آنتوں کے افعال کو منظم و درست کرتی ہیں۔
کارمینا
بدہضمی، قبض، گیس،
سینے کی جلن، تیزابیت وغیرہ کا اچھا علاج ہے۔
ہمدرد
کارمینا ہمیشہ گھر میں رکھیے۔



لایعنی صورتِ حال میں ایک کہانی

محمودہ غازیہ

لاری کے انجن کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ لکڑی کے دروازے کی درازوں سے ٹارچ جیسی زرد روشنی کی لکیریں دیوار پر چڑھنے لگیں۔ پھر انتہائی بائیں جانب مڑکر غائب ہوگئی۔ وہ اٹھا اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور کھڑکی کے قریب کھڑے ہوکر سگریٹ کے کش پر کش اس طرح لینے لگا۔ جیسے ملٹری کے سدھائے ہوئے جاندار اپنے جیسے دوسرے جانداروں کو لائٹ سگنل کے ذریعہ پیغام دے رہے ہوں۔ سگریٹ کے ہر کش کی روشنی اندھے شیشوں میں اس کا چہرہ پینٹ کر رہی تھی۔ اور ہر کش کے اختتام پر اس کا پورٹریٹ مر جاتا تھا۔ اور اس کا چہرہ بجھ جاتا تھا اور ہر مرتبہ اپنے پورٹریٹ کے مرنے کی توقع لئے وہ زور سے کش لیتا۔ اور ہر مرتبہ وہی ہوتا پورٹریٹ مر جاتا۔ اور پس منظر میں گہرا اندھیرا انڈیل دیتا۔ اس نے اپنا دھیان پورٹریٹ کی موت سے موسم کی طرف موڑ دیا شاید صبح بارش ہونے لگے اور پھر ہوتی رہے۔ اور شاید پھر ہوتی رہے۔ خدا کی رحمت کی طرح۔

تب وہ واپس بستر پر آیا۔ دردانہ مہذب بیویوں کی طرح نہیں بلکہ پلنگ کی کمی کی شکایت بن کر اس کے ساتھ ہی سوتی تھی۔ اس نے دردانہ پر نظر ڈالے بغیر اس کے جسم سے آدھی چادر کھینچ کر اپنے جسم پر ڈال لی۔ تب اس نے ایک خواب دیکھا۔ کہ وہ وہی لاری چلا رہا ہے جس کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ مگر اس نے لاری کی زرد روشنیاں بجھا دی تھیں۔ وہ اندھیرے میں جا رہا تھا۔ کہ روشنیاں خود بہ خود جل اٹھیں اور اس نے اپنے سامنے ایک گھر دیکھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ سے اچھل کر باہر کود گیا اور لکڑی کی کھڑکی کو کھٹکھٹانے لگا۔

"تمہیں کیا چاہیئے؟" اندر سے ایک بغیر شناخت کی آواز آئی۔

"دردانہ کے لئے دولت۔" اسے لگا کہ جواب اس کے بجائے کسی روبوٹ نے دیا ہے۔

"اسے دولت دے دی گئی اور پھر وہ اندھیرے میں ہجرت کر گیا۔ وہ جب بھی اندھیرے مکان میں کسی مکان کے قریب سے گزرا۔ اس کی لاری ہیڈ لائٹس خود بہ خود جل اٹھیں۔ اس نے کھڑکی کھٹکھٹائی اور دولت اسے دے دی گئی ہر مرتبہ اسے دولت دے دی گئی۔ لیکن ایک مکان کو دیکھ کر لاری کی ہیڈ لائٹس ابھی جلی ہی تھیں کہ دردانہ نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا اور بریک پر اس کے پاؤں کا دباؤ بڑھ گیا۔ اندھیرا اب بھی باقی تھا۔ اور سونے کی خواہش کے باوجود نہ سونے کی خلش کے ساتھ ہی اس کے چھت سے ایک جیٹ ہوائی جہاز کا شور اپنے بعد شدید سناٹا چھوڑ گیا۔ اس نے اندھیرے سناٹے میں اپنی نیند ڈھونڈھنی چاہی۔ اور بستر کے ٹھنڈے کنارے کی طرف کروٹ لی۔ اب وہ نہ سو رہا تھا نہ جاگ رہا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اندھیرا

ختم ہونے تک اسے اپنی آنکھیں کھولنی پڑیں گی۔ پوری طرح جاگ جانے کے لئے۔

اس نے آدھی پلکیں کھولیں۔ رات ابھی باقی تھی اور اس کے ذہن میں لاری کی بتیاں جل بجھ رہی تھیں۔ صبح اس نے پھر کھڑکی سے جھانکا بارش اللہ کی رحمت کی طرح ابھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن امید کی طرح مطلع ابر آلود تھا۔ اور روشنی غیر دوستانہ اور غیر فطری انداز میں خود کو بادلوں میں ٹھونس رہی تھی۔ اور یہ سب بالکل مصنوعی لگ رہا تھا۔ لٹکے ہوئے منہ کے ساتھ ایک کتے نے آسمان کو دیکھا اور منہ لٹکاتے ہوئے گذر گیا۔ شمال سے ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اس کے پیچھے ایک اور اور اس کے پیچھے کا ایک جھونکا اسی کتے کی طرح منہ لٹکاتے اس کی کھڑکی کے آگے سے گذر گیا۔

" چولہے کے پاس کون ہے " اس نے آہٹ پاکر پوچھا۔

" میں تمہاری بیوی دردانہ ہوں " دردانہ نے خوشدلی سے جواب دیا۔

" میں جانتا ہوں " وہ مسکرایا۔ تمہیں دولت چاہیئے یہ بریکٹ میں سوچ تھی۔

" ناشتہ لاؤں ؟ " دردانہ نے پوچھا۔

" ہاں دوپہر کا کھانا بھی باندھ دو، میں جا رہا ہوں " اس نے جواب دیا۔

شاید اسے معلوم نہیں تھا۔ لیکن دردانہ ضرور جانتی تھی کہ اسے کہاں جانا ہے۔

" وہ تمہیں کچھ نہیں دے گا " دردانہ نے دوپٹے سے پلیٹ صاف کرتے ہوئے کہا۔

" تمہیں معلوم ہے کہ وہ لفافہ کہاں ہے جس پر ا [illegible] لکھا ہے " اس نے لاتعلقی سے پوچھا۔

" دوسرے کمرے میں۔ مگر وہ زندہ ہے ؟ " در [illegible] جواب کے ساتھ ہی سوال بھی کر دیا۔ بوڑھی ماں سوئی ہوئی تھی۔

اس نے لفافہ ڈھونڈا اور باہر آ گیا۔

" مل گیا۔ ! " دردانہ نے پوچھا۔

" ہاں "

" وہ تمہیں کچھ نہیں دے گا " دردانہ نے دہرایا۔

وہ بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا اور شاید کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ کہ وہ اسے کچھ دے گا یا نہیں۔

" تم واپس آؤ گے " دردانہ نے ناشتے کی پلیٹ پر دوپٹہ سے پنکھا جھلتے ہوئے پوچھا۔ اس نے اپنے سامنے سے پلیٹ سرکائی اور اس سوال پر غور کرنے لگا۔ سوچتا رہا کہ اسے جانے سے پہلے دردانہ سے کچھ کہنا چاہیئے۔ لیکن وہ بغیر کچھ کہے دروازے سے باہر آ گیا۔

" وہ تمہیں کچھ نہیں دے گا " دردانہ بڑبڑائی۔

دردانہ کی بڑبڑاہٹ کی پرواکئے بغیر مجھے جلدی کرنی چاہیئے۔ بس بہت جلدی نکل جاتی ہے۔ دردانہ کو بڑبڑانے دو اگر بڑبڑانے سے اسے تسلی ہوتی ہے۔

ہوا کا جھونکا بڑی زور سے بس سے ٹکرایا اور کھڑکی کے ٹوٹے شیشوں سے گذرتا اس کے بالوں سے الجھنے لگا۔ یہ ہوا بارش بھی لاتی ہے۔ اور سردی بھی۔

وہ بس کی آخری سیٹ پر کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا۔ آس پاس کچھ نہیں تھا۔ سوائے ہوا کے۔ ہوا درختوں میں، ہوا جنگلوں میں،

ہوا سڑکوں پر اور مرف ایک گونج ... . وہ تمہیں کچھ نہیں دے گا۔

تمام مسافر چپ بیٹھے تھے۔ شاید وہ کچھ سوچ بھی نہیں رہے تھے۔ جب بس ایک پہاڑی ڈھلوان چڑھنے لگی تو ہوا کی گونج اور انجن کی آواز میں تمیز مشکل ہو گئی۔ پہاڑ کی انتہائی بلندی پر جاکر بس رک گئی۔ بس اسٹاپ پر نہ کوئی نیا آدمی بس میں داخل ہوا۔ اور نہ کوئی بس سے اترا۔ بس مڑ کر آگے بڑھ گئی اس نے کھڑکی سے پیچھے دیکھا۔ لمبی خالی سڑک جس سے بانسری میں جاگتی ہوئی سانس کی طرح ہوا گزر رہی تھی۔ درختوں کے پتے تالیاں بجا بجا کر پتہ نہیں خوش آمدید کہہ رہے تھے یا خدا حافظ۔ بس کے نوجوان ڈرائیور نے سگریٹ نکال کر منہ میں دبالی۔ اس نے بیک مرر میں ڈرائیور کے ہونٹوں سے لگی سگریٹ دیکھی اور خوشی کی ایک ہلکی سی لہر محسوس کی۔ وہ سگریٹ پینا تو بھول ہی گیا تھا۔

ایک اور پہاڑی گاؤں' بس تھوڑی دیر کے لئے ٹھہری' وہ تھوڑی دیر کے لئے بس سے اترا۔ ایک طویل انگڑائی لے کر ٹانگیں سیدھی کیں۔ اور دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ایک بچے نے پہاڑی چشمے سے کنستر بھر بھر کر پانی بس کے چاروں ٹائروں پر انڈیل دیا۔ چند چھینٹے کھلی ہوئی کھڑکی سے اس کے چہرے پر پڑے بس دوبارہ اسٹارٹ ہوئی اس نے کھڑکی کا شیشہ کھینچ کر بند کیا۔ انجن کے آہنگ کے ساتھ وہ شیشہ کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ اس طرح بجنے لگا۔ جیسے ریل کی پٹڑی بدلنے کا آہنگ جس آہنگ پر غزل کا کوئی مصرع بھی موزوں کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً دردانہ کے لئے دولت دردانہ کے لئے دولت! دردانہ کے لئے دولت جب بس کوئی پہاڑی موڑ کاٹتی تو درخت ٹیڑھے ہو ہو کر گھومنے لگتے بس ایک اور پہاڑی اسٹیشن پر رکی۔ کنڈیکٹر نے اسے مخاطب کیا۔

" بی بی جی لتی فرنٹ سیٹ تے آجاؤ۔ ایتھے کچھ اور مرد آگئے نیں ۔

" کیا ؟" اس کے ہاتھ سے پرس چھوٹ گیا۔ یہ مجھے دردانہ سمجھ رہا ہے۔ الو کا پٹھا۔ دردانہ کو تو میں گھر چھوڑ آیا ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ صبح میں نے غلطی سے دردانہ کا لباس پہن لیا ہو اچھا۔ اس نے کنڈیکٹر کو جواب دیا۔ اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی ایک عورت اس سے یوں بے تکلف ہوئی جیسے وہ سچ مچ دردانہ ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بس کے تمام لوگ اسے دردانہ کیوں سمجھ رہے ہیں۔ جب کہ وہ دردانہ کو گھر چھوڑ آیا ہے۔ اور خود دردانہ کے لئے دولت کی تلاش میں نکلا ہے۔ دردانہ کے لئے دولت بہت ضروری ہے ۔

دردانہ نے لمبے بالوں کو سلجھاتے ہوئے سوچا۔ وہ مجھے کچھ نہیں دے گا۔ سوائے اس تنخواہ کے' جو ہر پہلی کو چالیس پیسے کے رسیدی ٹکٹ پر دستخط کر کے ملتی ہے۔ ڈرائیور نے بریک لگائی۔ وہ ہڑبڑا کے نیچے اترا۔ اور دردانہ دفتر جانے کے لئے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی سیٹ گرم تھی اور برابر بیٹھی ہوئی عورت کی باتوں کا تسلسل نہیں ٹوٹا تھا۔ (ماخوذ)



کورس

دوھناتھ سنگھ/ اسد محمد خاں

اِدھر کئی برسوں سے وہ ایک طویل پرچھائیں کا پیچھا کر رہے تھے۔ بڑی محنت سے انھوں نے ان برسوں کا شمار کیا تھا اور چوری چھپے اپنی پسلیوں پر سیاہ لکیریں بنا بنا کر ان کا حساب رکھا تھا اور جیسے جیسے یہ تاریک برس بڑھتے جاتے ویسے ویسے ان لکیروں میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ کبھی کبھی غسل سے پہلے بند غسل خانوں میں وہ ان لکیروں کو دیکھتے تھے اور بلا کسی وجہ کے کانپنے لگتے تھے۔ پانی چاہے ٹھنڈا ہوتا یا گرم یہ کپکپاہٹ جاری رہتی۔ پھر چاندنی میں چمکتے ہوئے دریا کے کنارے، یا کسی ریگستانی کیمپ میں یا کسی وادی میں وہ سب ننگے بدن اکٹھا ہوتے اور ایک دوسرے کی پسلیوں پر کھنچی ان سیاہ لکیروں کا شمار کرتے تھے۔ اس سے ہوتا یہ تھا کہ وقتی طور پر انھیں خوف سے نجات مل جاتی تھی۔ پھر اچانک وہ اپنے کپڑے پہن لیتے اور دوبارہ اُس پرچھائیں کا پیچھا شروع کر دیتے۔ ہم دونوں — میں اور میرا دوست — بھی ان کے ساتھ تھے۔

میں نے دوست سے پوچھا، "یہ لوگ کیلنڈر سے کیوں نہیں حساب لگاتے؟"

"کیلنڈر پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔"

"تو کیا اِن لکیروں پر بھروسہ......؟"

"شش!"

"وہ اپنی پیشانیوں پر لکیریں بنا کر حساب کیوں نہیں رکھتے؟"

"ممکن ہے انھیں بوڑھے نظر آنا اچھا نہ لگتا ہو۔"

"میرے خیال میں وہ سب ہی شادی شدہ ہیں۔"

"تم کبھی برہمچاری نہیں ہو؟"

"میں — میں کہتا ہوں — یہ — یہ اسٹیبلشمنٹ — سازش — قتلِ عام — میں — میں ان سب کے لئے......"

"ہمیں ادھورے جملوں میں بات نہیں کرنی چاہیے۔"

"اگر میری آتما نشٹ نہیں ہوئی ہے تو سنو، میں کہتا ہوں، یہی سچ ہے۔"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تمہاری آتما کا کوئی وجود ہے۔"
"میں کہتا ہوں، اس طویل پرچھائیں کا تو قطعی کوئی وجود نہیں ہے۔"
"انھوں نے طویل پرچھائیں کو صرف اپنے لئے زندہ رکھا ہے۔ اور وہ اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔"
"اور تم اُن کے ساتھ ہو؟"
"ہاں — ہم ان کی پیروی کر رہے ہیں۔"
"وہ اپنا کام رات ہی میں کیوں شروع کرتے ہیں؟"
"انھیں کوئی کام نہیں ہے۔"
"اچھا چلو — ہم پھسلتے جا رہے ہیں۔"
"ہمیں خاموش رہنے کی عادت بنا لینی چاہیئے۔"
"میں تو بس کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتا تھا۔"
"انھیں کسی فیصلے پر نہیں پہنچنا۔"
"تم بھی یہی کرنا چاہتے ہو؟"
"ہمیں ان کی پیروی کرنی چاہیئے۔"
"میں جانتا ہوں میں پیچھے رہ جاؤں گا .... میں نہیں جاتا۔"
"تو تم کوئی ثبوت چھوڑے بنا مرجانا چاہتے ہو۔"
"اوہ! آتما کا ثبوت، موت کا ثبوت، زندگی کا ثبوت اور ثبوت کا ثبوت اور ثبوت اس بات کا کہ ...."
"ہمیں جلدی کرنی چاہیئے .... وہ ہمیں وارننگ دے رہے ہیں۔"

پھر اچانک وہ ایک جگہ رک گئے۔ یہ شاید کسی اسکول کے پچھواڑے کا میدان تھا۔ قریب ہی اینٹوں کا ایک بھٹّا تھا۔ اس کے آس پاس کی مٹی کھود لی گئی تھی اس لئے وہاں بہت سے لمبے لمبے گڑھے پڑ گئے تھے۔ ان گڑھوں کے کنارے چھوٹی چھوٹی قطاروں میں مڑی ہوئی ٹانگوں والے بچے اکڑوں بیٹھے حوائج ضروری سے فارغ ہو رہے تھے، اور انھیں بہت سے سُوّر پریشان کر رہے تھے۔ یہ سؤر کریہہ آوازیں نکالتے ہوئے بچوں کے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ بچے ہنستے تھے اور انھیں پتھر مارتے تھے۔ بھٹّے کے قریب ہی ایک کنواں تھا۔ کنوئیں میں نیچے تک لوہے کی سیڑھیاں چلی گئی تھیں۔ کچھ اور بچے سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے تھے اور ڈولچوں میں پانی بھر بھر کر نیچے سے اوپر ایک دوسرے کو دیتے جاتے تھے۔

پرچھائیں کا پیچھا کرنے والوں کے سرغنے نے پوچھا "کیا تم رات میں اسکول جاتے ہو؟"
بچوں نے ترنت سوال جڑ دیا "کیا تم رات میں اپنی ریس لگاتے ہو؟"
سرغنے نے مسکراتے ہوئے پوچھا "رات کہاں ہے؟"
"اسکول کہاں ہے؟"
"تم بچے یہاں کیا کر رہے ہو؟"
"ہم تمہارے لئے چلّو بھر پانی لا رہے ہیں۔"

اس بات سے وہ بہت خوش ہوئے اور انھیں بچّوں پر ترس آنے لگا کہ اتنے ذہین بچّوں کو کنوؤں میں اور سوّروں کے رحم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ پرچھائیں کا تعاقب دوبارہ شروع ہونے تک وہ اپنا وقت بچّوں کو تحفظ دینے میں لگائیں گے۔ چنانچہ وہ سوّروں پر پل پڑے۔ بچوں نے بڑی بڑی خوفزدہ آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ ان کی تپلی تپلی ٹانگیں اکڑ گئیں اور آنتیں سخت ہو کر سکڑنے لگیں۔

میں نے آہستہ سے اپنے دوست سے کہا، "دیکھا، یہ سوّروں سے نجات پانا نہیں چاہتے۔"

وہ سرگوشی میں کہنے لگا، "کون سوّروں سے نجات پانا چاہتا ہے۔"

"یہاں کے لوگ بڑے غیر ذمہ دار معلوم ہوتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے صرف سوّروں کو بچوں کا فضلہ سونگھنے کی اجازت ہے۔"

"انھیں گولی سے اڑا دینا چاہیے۔"

ان کے سرغنے نے مجھ سے پوچھا، "کیا تم یہاں کے لوگوں کو جانتے ہو؟"

اب انھوں نے کنوئیں کی دیواریں توڑنا شروع کر دیں۔ انھیں یقین تھا کہ ان بچوں کے بیج ڈالنے والے یہیں کہیں مل جائیں گے۔ کئی جگہ کنوئیں میں دراڑیں پڑی تھیں جن سے کیچڑ، گوبر، سڑا ہوا فضلہ، مچھلی کی ہڈیاں اور بے شمار چھوٹے چھوٹے کیڑے بجبجاتے ہوئے ابل پڑے۔ سرغنے نے سخت جذباتی ہو کر ایسے سوالات پوچھنے شروع کر دیئے جو صرف بیوقوف ہی پوچھ سکتے ہیں۔ "بھائیو بتاؤ تم کس کی اولاد ہو؟ تم کس ملک سے آئے ہو؟ کونسی ریتیں روایتیں تمہیں اس کنوئیں پر لائیں، اور جب سرغنے کو کوئی جواب نہ ملا تو وہ ایسے ہنسنے لگا جیسے ظاہر کر رہا ہو کہ یہ سب گویا مذاق تھا۔ پھر انھوں نے کنوئیں کی سیڑھیوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ . . . بچے اور سوّر بھاگ کھڑے ہوئے۔ سرغنے نے سب کو حکم دیا کہ وہ یا تو سوّروں کی دُمیں پکڑ لیں یا بچوں کی آوازوں کا پیچھا کریں۔ اُسے یقین تھا کہ بچوں کے والدین یہیں کہیں قریب ہی ہوں گے۔ سوّر یقیناً کسی باڑے کا رُخ کرینگے اس لئے کہ اُن میں بہت سی گابھن سوّرنیاں بھی تھیں جو حملے سے بچنے کی کوشش کرینگی۔ اور اس طرح یہاں کے باشندوں کے بارے میں کوئی سُراغ مل جائے گا۔ اپنے سرغنے کا حکم سنکر پرچھائیں کا پیچھا کرنے والوں نے اپنے چہروں کو ہلمیٹ کیا، اُن پر ڈراؤنے مکھوٹے چڑھائے، زرہ بکتریں پہنیں اور اپنے بدن پھلائے ہوئے انصاف کے عملدرآمد میں جُٹ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے کمینے غیر ذمہ دار لوگ جو اپنے بچوں کو چُلّو بھر پانی لانے کے لئے کنوؤں میں چھوڑ دیتے ہیں یقیناً دولت مند ہونگے۔

اس لئے سرغنے کے ساتھ ساتھ سب ایک ہی سمت میں دوڑ پڑے اُن میں سے بعض نے سوّروں کی دُمیں پکڑ لیں، بعض بچوں کی آوازوں کا پیچھا کرنے لگے۔ کچھ دور تک اندھا دھند دوڑنے کے بعد انھیں رکنا پڑا اس لئے کہ اُن کے آس پاس جھُگیاں تھیں؛ سوّر اور بچے ایک جھگی میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد ایک مسرت بھری کلکاری سنائی دی۔ باہر میدان میں ایک ڈائس بنا ہوا تھا جس پر ایک "مہاتما" تقریر کر رہا تھا اور نیچے کھڑے ہوئے مرد اور عورتیں خوف سے کانپ رہے تھے۔ پیچھا کرنے والوں نے کچھ اور سوچے سمجھے بنا "مہاتما" کو جا پکڑا، اُسے ڈائس سے کھینچکر اتارا اور اپنے جوتوں سے اُس کے سر کا بھرتا بنانے لگے۔ تب انھوں نے دیکھا کہ اندر تو اس کا بھیجا بھرا ہے جس کے زنگ آلود پرزے بیرونِ ملک تیار کئے گئے تھے۔ یہ فرزانہ پاکر وہ اچھل پڑے۔ ادھر ڈائس کے نیچے مرد اور عورتیں اب تک کانپ رہے تھے۔

بے انھوں نے مار دیا ہے وہ تو ہمیں سوروں کے باڑے سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔"
سرا بولا "وہ ہمیں لیڈروں کا پتہ بتا رہا تھا۔"
یرا کہنے لگا "وہ جو کچھ کہہ رہا تھا میری سمجھ میں تو نہیں آتا تھا۔"
ھا "وہ بس یہ چاہتا تھا کہ ہم اس کو چن لیں اور راجدھانی بھیج دیں۔"
اں "ہم نے اب تک توکسی کا چناؤ کیا نہیں وہ خود ہی راجدھانی پہنچ جاتے ہیں۔"
ھا "اور وہاں مخبر بن جاتے ہیں۔"
رغنے نے ڈپٹ کر پوچھا "تم لوگوں کے پاس تھوڑا سا مٹی کا تیل ہوگا؟"
بوڑھا آدمی آگے بڑھا "کیا تم ہماری جھگیوں کو آگ لگانا چاہتے ہو؟"
تیل ہمیں اس بھیجے کے زنگ آلود پرزے صاف کرنے کے لئے چاہئے۔"

باشندوں میں سے ایک دوڑا دوڑا گیا اور مٹی کا تیل لے آیا۔ سرغنے اور اس کے پیروکاروں نے زنگ آلود پرزوں کو نار گڑ رگڑ کر کے صاف کیا کہ چمکا دیا، پھر انھوں نے ان سے اپنی جیبیں بھر لیں۔ اپنی اس کارگزاری پر وہ بہت ہی خوش تھے اور مُعزز آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خود اعتمادی کا یہ حال تھا اب وہ خشکوں کی طرح پھولنے اور سکڑنے لگے۔

رغنے نے پوچھا "تم اپنے بچوں کے فضلے کا کیا کرتے ہو؟"
ھا بولا "ہمارے کوئی بچے نہیں ہیں۔"
پھر سوروں کے باڑے میں کون کلکاریاں مار رہا ہے؟"
سور جفتی کھا رہے ہوں گے۔"
تمہیں سوروں اور انسانوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟"
ہارے خیال میں اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟"
تو کیا تمہارے بچے سورنیوں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں؟"
یوں سمجھتے ہو تو یوں ہی سہی۔"
بہت مال ہوگا تمہارے پاس۔ تم سب مجھے اچھے خاصے دولت مند لگتے ہو۔"

ھا پر بوڑھے کے ساتھی مردوں اور عورتوں نے اچانک اپنی آنکھیں نوچ نکالیں اور انھیں اپنی ہتھیلیوں پر سجا لیا۔ لمحے بھر کے تو سرغنہ اور اس کے چیلے والے بھونچکے رہ گئے۔ وہ ایسے منظروں کے عادی نہیں تھے۔ انھیں منصفوں کا سوانگ رچانے والے ولد اور کھلی ہتھیلیوں پر سے گھورتی ہوئی آنکھوں کے درمیان کوئی ربط سمجھ میں نہیں آیا۔"

غنے نے پوچھا "کیا تم لوگ آنکھوں کے بغیر دیکھ سکتے ہو؟"
ھے نے جواب دیا، "کیا تم ہماری آنکھیں راجدھانی لے جا سکتے ہو؟"
ہیں کیسے معلوم کہ ہم واپس راجدھانی جائیں گے؟"
انہیں بیچ نہیں سکتے؟"
سی ہولناک غلاظت کون خریدے گا؟"

"کیوں — کیا وہاں کوئی عجائب گھر نہیں ہے؟"
"لیکن انھیں عجائب گھر میں تو نہیں رکھا جا سکتا!"
"پھر کیا ہم تمہیں اپنی پگڑیاں دے سکتے ہیں؟"
"ہم صرف ٹائیاں پہنتے ہیں۔"
"ہم بہت دن برہنہ سر رہے ہیں۔ ہم نے اپنی پگڑیاں ٹین کی پرانی پیٹیوں میں چھپا رکھی ہیں۔"
"اسی لئے تم گنجے ہو — تم پگڑیاں کیوں نہیں باندھتے؟"
"نہیں باندھ سکتے۔ ہم محفوظ رہنا چاہتے ہیں۔ یہ سیدھی سیدھی لمبی سیاہ شاخیں دیکھ رہے ہو؟ ہم وہ — وہ نہیں بننا چاہتے — ہم خود کو پھانسی نہیں دینا چاہتے۔"
"مگر کیا ہم نے تمہیں بتایا نہیں کہ ہم صرف ٹائیاں پہنتے ہیں۔"
"ٹائیاں بہت چھوٹی پڑ جائیں گی، تمہارے کام کے لئے بیکار ہیں۔ پگڑیاں اچھی رہیں گی۔ آسانی بھی ہو گی۔"
"اے آدمی بنو! — ہم کیا کوئی خودکشی کرنے والوں کا جتھا ہیں؟"
"ہم اپنے بچوں اور اپنی خوبصورت معصوم گایوں کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتے۔"
"تمہیں پتہ ہے ہم کون ہیں؟"
"پتہ ہے — تمہیں پگڑیوں کی سخت ضرورت ہے۔"
"سب سے پہلے تو تمہیں یہ سکھانا ہو گا کہ بات کس طرح کی جاتی ہے۔"
"کیا تم ان سوروں کو راجدھانی لے جا سکتے ہو؟"
"ہم ایک طویل پرچھائیں کا پیچھا کر رہے ہیں اور شائد ایک روز تمہیں بھی لازماً ایسا ہی ......"
"ہمیں بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔"
"بہرحال ..... جو بھی ہو ..... یہ بتاؤ تم کب تک ایسے اَن پڑھ حرامزادے بنے رہو گے؟"
"کیا تم راجدھانی کو یہاں منتقل نہیں کر سکتے؟"
قبل اس کے کہ مزید کچھ ہوتا، طویل پرچھائیں کو کہرے میں داخل ہوتے دیکھا گیا اس لئے پھر سے تعاقب شروع ہو گیا۔ ہر طرف سناٹا پھیل گیا تھا اور ڈائنس، کوڑے کے ایک تاریک ڈھیر کی صورت ابھر رہا تھا۔ جھگیوں سے کسی قسم کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ بچے اور سُور سکون کی نیند سو رہے تھے۔ کھیت دُور دُور تک خالی تھے بس قدموں کے دُھندلے نشانات کا ایک گنجلک جال پڑا ہوا تھا۔ میں انتظار کر رہا تھا۔ برابر میں بوڑھا خاموش کھڑا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جاتے ہوئے اس کو سلام کروں۔ ٹھیک اسی وقت میرے دوست نے مجھے اشارہ دیا۔ طویل پرچھائیں کا پیچھا کرنے والوں نے رُخ بدل لیا تھا۔ وہ مڑ کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ہم آگے چل پڑے۔

میرا دوست بولا، "تمہیں بوڑھوں کو سلام نہیں کرنا چاہیئے۔"
"اگر میں نے سلام کیا تو کیا وہ مجھ پر غداری کا ٹھپا لگا دیں گے؟" میں نے حو — ،
"ہمیں چلتے رہنا چاہیئے۔"

"کیا خیال ہے ـــــ کیا وہ طویل پرچھائیں کو پکڑ لیں گے ؟"
"مقصد یہ ہے کہ بس پیچھا کیا جائے ؟"
"کیا تم نے اس پرچھائیں کو، بقول ان کے، وادیوں پہاڑیوں میں ریگستانی طوفانوں میں بھاگتے ہوئے دیکھا ہے ؟ اسے جھگیوں کے گرد اگرد، شہر کے گندے نالوں میں، تنگ برہنہ سڑکوں پر، بجھی ہوئی بھٹیوں کے پاس جہاں سوروں کی چتائیں جلائی جاتی ہیں، وہاں، دیکھا ہے ؟"
"تو گویا زبان جو خیالی نقش بناتی ہے تم ان پر ایمان لے آتے ہو ؟"
"میں کہتا ہوں وہ انسانیت کے لئے اور قوم اور پرچم کے لئے کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے ؟"
"وہ پرچم کا سلیپنگ سوٹ یا ڈبل بڈ شیٹ بنا لیں گے ؟"
"میں کہتا ہوں وہ بزدل ہیں ؟"
"اور اپنی بزدلی کا دفاع کرنے کے لئے وہ طویل پرچھائیں کا پیچھا کرتے ہیں ؟"
"اپنی بزدلی کا دفاع کرنے کے وہ بندوقیں تک استعمال کرتے ہیں ؟"
"ہمیں انھیں موقعہ ہی نہ دینا چاہیئے ؟"
"تب کیا وہ دوسرے 'لیڈروں' کی نشان دہی کریں گے ـــــ تمہارا کیا خیال ہے ؟"
"نہیں وہ ان کی نشاندہی کریں گے جو بے قصور ہیں ؟"
"کیا پہلے کبھی اس ملک نے لیڈروں اور خون چوسنے والوں کو جنم دیا ہے ؟"
"تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہ ہمیشہ باہر سے آئے ہیں ؟"
"اور برابر آتے رہیں گے ؟"
"تاریخ ہمیں بتاتی ہے ؟"
"اور اگر کسی وجہ سے وہ نہ آسکیں تو بہر صورت وہ اپنے بھیجے کے پرزے بھیجتے رہیں گے ؟"
"بھیجے اور مغز نہیں ـــــ صرف غلامی درآمد کی جاتی ہے ؟"
"پھر وہ ایک ڈانس بنا لیں گے جیسی اس مہاتما نے بنائی تھی اور ایک لمبی تقریر کریں گے ؟"
"اور ہمیں کانپتے ہوئے عوام کے ہجوم میں شامل ہونا پڑے گا ؟"
"کیا ان میں اتنی ہمت ہے کہ وہ ان مردوں اور عورتوں کی طرح اپنی آنکھیں نوچ نکالیں اور انھیں اپنی ہتھیلیوں پر سجا لیں ؟"
"وہ صرف کاسٹیوم اور آسن بدلتے ہیں ؟"
"اس لئے کہ ان کے ہاتھ میں اقتدار ہے ؟"
"اس لئے ان کے ہاتھ میں اقتدار نہیں ہے ؟"
"کیا تم ان کی جیبوں سے وہ زنگ آلود پرزے اڑا سکتے ہو ؟"
"نہیں ان کی ضرورت نہیں ہے ؟"
"میں انھیں سمندر میں پھینک دینا چاہتا ہوں ـــــ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ؟"

"تمہیں پتہ نہیں ہے..... وہ ماہر غوطہ خور ہیں۔"
"میں اگر اکیلا نہ ہوتا تو بتاتا ان کو۔"
"یہ ایک ذلیل اتفاق ہے کہ ہم ساتھ ہیں، یا......"
"آج بھی سائنس کے کارناموں کے مقابلے میں ایسے ذلیل اتفاقات پر دنیا زیادہ بھروسہ کرتی ہے۔"
"اگر میں اکیلا نہ ہوتا۔۔۔ اگر.... میں۔"
"تمہاری تنہائی کسی کو گیس چیمبر میں پہنچا دے گی؟"
"تم ہنستے کیوں ہو؟"
"چلو چلیں۔۔۔ نہیں تو ہم پھسل جائیں گے۔"
"تمہارا دل کیسے دینداری سے دھڑکتا ہے۔ تم نے......"

رات گہری اور سیاہ تھی اور راستے کے کھنڈروں سے بوڑھے الوؤں کی آواز آ رہی تھی۔ انھوں نے بہت سی چیزیں آزما دیکھی تھیں مگر ناکام ہو گئے تھے۔ آگے اندھیرے میں دریا بہہ رہا تھا۔ اس کے چوڑے کنارے منجمد مٹیالے سنگ مرمر کی طرح لگتے تھے طویل پرچھائیں انھیں جگہ دیکر نکل چکی تھی، وہ دوڑتی ہوئی دریا پار چلی گئی تھی۔ ہم دونوں جب وہاں پہنچے تو ہم نے دیکھا دوکنارے سر نہوڑائے بیٹھے تھے۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ وہ مزے سے بیٹھے گپ مار رہے ہوں گے کیونکہ یہ اطمینان تو ہوگا کہ کہیں سے بھی دوبارہ تعاقب شروع کیا جا سکتا ہے۔ اور تعاقب کو گو چلتے ہی رہنا تھا اس لئے اب ان کا یہ طریقہ بن گیا تھا کہ ہر وقت بس طویل پرچھائیں کا دھیان کرتے رہتے تھے مگر اس بار وہ واقعی دکھی ہو گئے تھے کیونکہ نہ تو اس سلسلے میں وہ کوئی نمایاں دریافت کر سکے تھے اور نہ ہی اس تمام کوشش کو کوئی انقلابی موڑ دے سکے تھے، بیشتر تجربات ناکام ہوئے تھے اور سیاہ لکیریں ان کی ہیلیوں میں گڑ گئی تھیں، اس کے باوجود پرچھائیں کی حقیقت کا تعین اور جس سمت میں وہ فرار ہوئی تھی اُس کا فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے" سرغنہ نے اچانک اور حیرت کے ساتھ کہا، "اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ہم موت پرستی کی رسمیں ادا کرینگے تاریخ کے بغیر ہم بوڑھے نہیں ہو سکتے۔ ہمیں ثابت کرنا ہوگا کہ ہمارا یہ منصوبہ کوئی جعلی کارروائی نہیں تھی۔ لیکن اس بات کو میں جس طرح سمجھتا ہوں، بتانا چاہتا ہوں، سنو۔ ہمیں ایک بات کا بہت خیال رکھنا پڑے گا۔۔۔ اپنی عبادت کی رسموں کے لئے ہمیں ایک ممتاز حیثیت کی لاش درکار ہوگی۔"
کسی نے کہا، "تمام لاشیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔"
"میرا مطلب تھا کسی بڑے آدمی کی لاش۔"
"مگر بڑے آدمیوں کی لاشوں کو محفوظ رکھنا ہماری روایت کا حصہ نہیں ہے۔"
سرغنہ یہ سنکر مایوسی کے ساتھ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔
"اچھا، کسی بڑے آدمی کے نظریات کی لاش سے کام نہیں چل سکتا؟"
"ہمیں ایسی لاش ملے گی کہاں سے؟" سرغنہ جواب تک حیران تھا بول پڑا۔
"ہم سب جگہ تلاش کرینگے۔"
اس پر ان سب نے اتفاق رائے کیا اور اس کے بعد کئی راتوں تک انھوں نے بچوں اور عورتوں، بوڑھوں اور ذہین نوجوان طالب

ملوں میں اپنی تلاش جاری رکھی۔ انھوں نے لائبریریاں چھان ماریں، بینکوں کے لاکر توڑ دیئے، ذاتی سامان میں ڈھونڈتے رہے نالواں اور مرتے ہوئے لوگوں کی وصیتیں اکٹھا کیں۔ انھوں نے پلوں کے تختے اکھاڑ دیئے اور کولتار کی پختہ سڑکیں کھود ڈالیں۔ انھوں نے شرمیلی دیہاتی لڑکیوں کو لیجانے والی پردے دار بیل گاڑیوں میں جھانکا وہ اُن چولھوں کی راکھ کریدتے رہے جن کی آگ مدتوں پہلے بجھائی جاچکی تھی اور بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کی زبانوں کا معائنہ کیا......اکثر و بیشتر خستہ حال مگر مسکین لوگوں کے درمیان سے وہ گزرتے اور انھیں "طویل پرچھائیں" کی دہشت سے بدحواس چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے انھوں نے بھک منگوں کو دہشت زدہ کیا اور اُن کی گدڑیوں کی سیونوں میں تلاش جاری رکھی۔

اس ایک لاش کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے زمین آسمان ایک کردیا۔ وہ جہاں بھی گئے یہی ایک فقرہ دُھراتے کہ "کیا تم میں سے کوئی اس مہان آتما والے کو جانتے ہو جو ننگے فقیر کے نام سے پہچانا جاتا تھا، وہ لاٹھی ٹیک کر چلتا تھا اور بڑی اتراہٹ کے ساتھ اعلان کرتا تھا کہ تمام بنی نوع انسان میرا مسئلہ ہیں"

اتراہٹ — بمشکل یہ لفظ زبان سے ادا ہوتا کہ وہ لوگوں کے گھٹے ہوئے خیالات کو کھدیڑ کر دبوچ لینے کی غرض سے انہیں کتے چھوڑ دیتے اور لوگ لرزتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر زمین پر جھک جاتے — امید ختم ہوچکی تھی مگر پرچھائیں کا پیچھا کرنے والوں نے اپنا تعاقب جاری رکھا۔

ایک بار پھر وہ جھگیوں کی طرف گئے۔ کوڑے کے ڈھیر پر انھوں نے ایک نئی ڈانس بنائی اور سُوروں اور تمام بچوں، مردوں اور عورتوں کو اکٹھا کیا۔ انھوں نے کنوئیں کھدوانے کا وعدہ کیا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ سوروں کو راجدھانی لے جائیں گے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی شرطیں پیش کیں مگر کچھ نہ ہوا۔ انھوں نے ٹین کی پرانی زنگ آلود پیٹیاں توڑ ڈالیں اور ان کی پگڑیوں کو ٹٹول کر دیکھا۔ انھوں نے خوبصورت معصوم گایوں کی آنکھوں میں دیکھا مگر کچھ بھی نہ ہوا۔

کانپتے ہوئے مردوں اور عورتوں نے انھیں بتایا کہ ہم نے ان علاقوں میں کبھی کوئی لاش نہیں دیکھی لوگ مرتے ہیں لیکن فوراً ہی ان کا کریا کرم کردیا جاتا ہے۔ اب کیونکہ کوئی امید نہیں تھی اس لئے وہ چل پڑے اور ایک رات ایک دریا کے کنارے جمع ہوئے تاکہ اور زیادہ گفت و شنید کی جاسکے۔ یہ بڑی سنسان سی جگہ تھی، آس پاس کوئی جاسوس بھی نہیں تھا اور میں سمجھ گیا کہ اب جلد ہی ہم سچائی کی تہہ تک پہنچ جائیں گے۔ طویل پرچھائیں کا مسئلہ اٹھانے کا وقت آگیا تھا میں نے اپنے دوست کی طرف دیکھا وہ مجھے اس وقت یہ مسئلہ چھیڑنے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچھا اگر میں اس کی نہ سنوں تو کیا ہوگا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہی تو یہ ہو؟۔ میں تذبذب میں پڑ گیا۔ اس بھیانک یخ زدہ کورس کے سوا میرے پاس اور ثبوت بھی کیا ہے؟ اور ان کانپتے ہوئے مردوں عورتوں کے پاس بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وہ ...... میں نے اُن کے سرغنہ کو گھورتے اور ہماری طرف دانت نکالتے مسکراتے ہوئے دیکھا۔ میں نے سوچا کیا بزدلوں کی فتح بھی آتنی منحوس ہوسکتی ہے۔

میں پھٹ پڑا "تم سب جھوٹے اور غدار ہو"

"ہم ان لفظوں کو تسلیم نہیں کرتے" سرغنہ نے کہا، اسکی آواز فہم و ادراک سے باہر تھی۔

"تم قصوروار ہو — تم سب......"

"ہم تاریخ بنانے والے لوگ ہیں"

"اور تمہاری تاریخ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ بے معنی ہے۔ تم نے اگر کچھ کیا ہے تو بس یہ کہ اپنے لئے ایک سانچا ڈھونڈ لیا ہے"

"تاریخ محض تاریخ ہے یہ نہ سچ ہے نہ جھوٹ"

"تم صفحۂ ابد پر ایک دھبا بنے رہو گے"

"ہم صرف رہیں گے"

"تمہارا منصوبہ ناکام ہو چکا ہے"

"ہمیں کامیابی کی خواہش نہیں تھی"

"ہم دونوں تمہیں تباہ کر دینگے۔ ہم لوگوں کو بتا دیں گے کہ تم کون ہو۔ ہم تمہارا راز کھول دینگے"

"تاریخ بھگوڑوں سے واقف نہیں ہے۔ جو تمہارا جی چاہے کہو، لوگ تمہیں ہمارا ترجمان سمجھیں گے۔ ہماری ناکامی تمہاری سرخروئی بن جائے گی۔ تم ہمیں اسٹیبلش کر دو گے"

اور اس کے ساتھ ہی وہ سب اٹھے اور وادی کے محفوظ حصے کی طرف چلے گئے"

میں چیخنے لگا،" انھیں روکو! انھیں روکو! یہ سب قاتل ہیں۔۔۔۔ یہ سب۔۔۔۔"

"تمہیں خاموش رہنے کی عادت اختیار کرنی چاہئے،" میرے دوست نے کہا۔

"میں انھیں جانے نہیں دوں گا"

"کیا تم نہیں آ رہے ؟"

"میں کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتا ہوں"

"جب کسی فیصلے پر پہنچ گئے تو ختم ہو جاؤ گے"

"نہیں میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ تم میرے گواہ ہو۔ میرے۔۔۔۔۔۔"

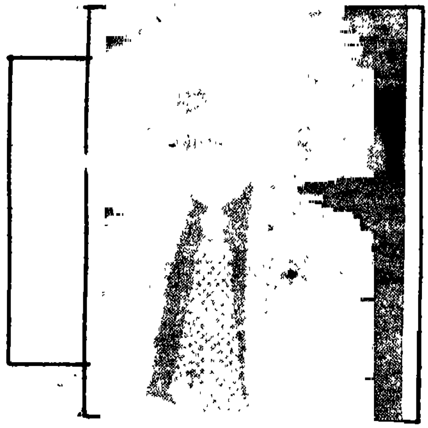
"میں خود کو ہلاک کرنا نہیں چاہتا۔ میں جا رہا ہوں"

میں اس سے لپٹ گیا،" میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔"

"اب انھیں لاش مل جائے گی۔ اب انھیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی" میرے دوست نے چیخ ماری اور بے جان ہو کر گر گیا"

میں نے آنکھ کھولی تو صبح تھی۔ بھیانک فیل پا سے سوجے ہوئے ایک پیر تلے میری گردن دبی پڑی تھی اور اس بیماری کا سایہ میلوں میل تک پھیلا ہوا تھا۔

●
●



کھوئے ہوؤں کی جستجو

شہرت بخاری

رات کے نو، ساڑھے نو، دس، گیارہ، ساڑھے گیارہ —— شیرانوالہ دروازے کے باہر واقع فیروز پرنٹنگ پریس کے صدر دروازے کے بغلی کمرے کی جالی دار کھڑکی کے سامنے بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ نوعمر لڑکوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان کے چہروں کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ وہ خاموش تھے۔ ان کی آنکھوں سے امید و ناامیدی کی کیفیت بیک وقت ٹپکی پڑ رہی تھی۔ کبھی کبھی ایک دوسرے سے سرگوشی میں کوئی بات کر لیتے تھے۔ بعضوں کے ساتھ ان کے باپ یا بھائی بھی تھے۔ عجب تھا کہ اتنی بھیڑ کے باوجود ہر طرف سناٹا سا تھا۔ ابا اور میں سڑک کی دوسری طرف باغ کے کنارے بھیڑ سے ذرا ہٹ کر چپ چاپ کھڑے تھے۔ سب کی نظریں اس کھڑکی کی طرف لگی تھیں کہ کب کھلتی ہے۔ کمرے کی روشنی کھڑکی کے شیشوں سے جھانک رہی تھی —— اتنے میں چھاپے خانے کے چھوٹے دروازے سے ایک آدمی نے جھک کر گردن باہر نکالی اور بلند آواز میں کہا۔ سب لوگ قطار بنائیں اور اطمینان سے کھڑے ہو جائیں۔ تمام حاضرین نے بغیر کسی پولیس کے سپاہی کی موجودگی کے قطار بنالی۔ ابا نے مجھے بھی قطار میں کھڑے ہونے کو کہا اور خود دم میں کھڑے رہے۔ میں ازل کا مرگلا سا قطار کے پچھلے حصے میں جا کھڑا ہوا۔ گھڑیال نے بارہ بجائے اور کھڑکی کھلی۔ باری باری لڑکے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کاغذ تھا۔ وہ کاغذ اندر کرتے جاتے اور واپس ملنے پر قطار سے باہر نکل جاتے۔ کوئی ہنس رہا تھا۔ کسی کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ فضا میں بھنبھناہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ گھر بھاگ جاؤں۔ موجودہ صورت حال کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا حوصلہ مجھ میں کبھی بھی نہیں ہوا۔ مگر میں ایسا کر نہیں سکتا تھا کہ ابا سامنے کھڑے تھے —— اللہ اللہ کر کے کھڑکی تک پہنچا۔ میں نے بھی کاغذ اندر کیا، کاغذ واپس آیا۔ اس پر میرے رول نمبر کے سامنے حاصل کردہ نمبروں کی تعداد لکھی تھی۔ میں اچھل پڑا، اندھیرا آنکھوں میں چھا گیا۔ مگر میں دوڑا اور ابا سے لپٹ گیا۔ ابا سمجھ گئے کہ ان کا بیٹا دسویں کے امتحان میں کامیاب ہو گیا ہے۔ انھوں نے میرے سر پہ دو تین پیار کئے اور لپٹائے لپٹائے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس زمانے میں دسویں جماعت کا نتیجہ شہر کے اہم ترین واقعات میں سے ایک ہوتا تھا۔ آج کی طرح شاید ہی کسی کو قبل از وقت اپنے نتیجے کا علم ہوتا ہوگا۔ رات کے ایک بجے کے قریب اخباروں کے خاص ضمیمے شائع ہوتے اور اخبار فروش بازاروں اور گلیوں میں "دسویں کا نتیجہ شائع ہو گیا" کا نعرہ لگاتے بھاگتے پھرتے۔ اکثر گھروں میں لوگ جاگتے رہتے۔ جن کے بچوں نے امتحان نہ دیا ہوتا تھا، وہ بھی دوسروں کے معاملے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اور دیر تک شہر میں خاصی چہل پہل رہتی تھی۔

گھر کے دروازے میں داخل ہوتے وقت ابا نے کہا' پہلے اپنے چچاؤں اور پھوپھی کو جا کر سلام کرو۔ میں بھی اپنی کامیابی پر ایسا خوش تھا گویا کوئی بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔ ایک ایک کے پاس جا کر اترا اترا کر سلام کیا۔ کم و بیش سلام کر کے اور مبارکبادیاں لے کر میں ابا کے پاس

آکر بیٹھ گیا۔ آپا بھی ہمارے پاس بیٹھی تھیں۔ ہم تینوں اس سے پہلے شاید اتنے خوش کبھی نہیں ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد اپنے اپنے بچھونوں پر جا کر سو رہے۔

ابا کی عادت تھی کہ رات کو چاہے کسی وقت ان کی آنکھ لگتی، فجر کی اذان کے ساتھ بستر چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے۔ میں ہمیشہ دیر سے سونے اور دیر سے اٹھنے کا عادی ہوں۔ مگر آج میری آنکھ بھی فجر کی اذان کے ساتھ کھل گئی۔ ابا کے ساتھ کوٹھے سے نیچے آ گیا۔ وہ حسب معمول غسل کرنے لگے، میں نے منہ ہاتھ دھویا، وضو کیا اور پھر ہم دونوں نے مل کر نماز پڑھی۔ نماز کے بعد ابا نے کہا دو نفل شکرانے کے بھی پڑھو ——— صبح ہوئی، ابا دفتر چلے گئے۔ میں سارا دن یوں اکڑا اکڑا پھرتا رہا اور اپنی لیاقت کا رعب گانٹھتا رہا۔ گویا پہلے کسی نے یہ کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔ دراصل میں کچھ جھوٹی شیخی نہیں مار رہا تھا۔ اس اعتبار سے کہ اتفاق سے میرے خاندان میں یہ روایت قائم تھی کہ ہر لڑکا دسویں کے امتحان میں ایک بار ضرور لڑھکتا تھا۔ میں نے اس روایت کو توڑا تھا۔ اگرچہ نمبروں کی تعداد قابل فخر نہ تھی ——— شام کو ابا ایک نئی سائیکل "ہرکولیز" کی لے کر آئے۔ میں سمجھا ابا نے اپنی پرانی سائیکل بیچ دی ہے اور نئی خرید لی ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ تو امتحان میں کامیابی کا انعام ہے۔ اے سبحان اللہ، مسرت و شادمانی کی انتہا نہ رہی۔ امتحان میں کامیاب ہونے کا اتنا نشہ نہ اس سے پہلے کبھی چڑھا تھا نہ بعد کو، بعد کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

رات ہوئی، میں ابا کے ساتھ ہی لیٹ گیا۔ وہ سنا رہے تھے کہ ان کے دوستوں نے میرے مستقبل کے بارے میں آج دن بھر کیا کیا مشورے دئے تھے ——— یہ مشورے اپنی پوری تفصیل کے ساتھ وہ بیان کر رہے تھے۔ یوں کہ گویا میری پوری زندگی کا پروگرام تیار کیا جا رہا تھا۔ میں تو خیر اپنی کم عمری اور گاؤدی پن کے باعث اس معمولی کامیابی پر آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا مگر ابا صاحب مجھ سے کچھ کم پھٹے نہیں پڑ رہے تھے ——— ان کی ساری گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ آنے والا وقت مشین کا وقت ہے اور وہی شخص زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے جو انجینیرنگ کی تعلیم حاصل کرے گا۔ انھوں نے بتایا کہ ریلوے ملازم ہونے کی حیثیت سے انھیں اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو ریلوے ملازمین کے کوٹے کے ذریعہ انجینیرنگ کالج میں داخلہ دلا سکیں۔ اس زمانے میں موجودہ انجینیرنگ یونیورسٹی کے وسیع و عریض کیمپس میں شامل بلاکوں میں سے ایک بلاک میں میکلیگن انجینیرنگ کالج ریلوے انتظامیہ کی نگرانی میں قائم تھا ——— یہاں کے سند یافتہ ریلوے کے مختلف شعبوں میں ملازم ہو جایا کرتے تھے ——— ابا مجھے زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور میرے ذہن میں یہ بٹھانا چاہتے تھے کہ میری زندگی کی ساری کامیابیاں اس مشورے میں پوشیدہ ہیں کہ میں انجینیرنگ کالج میں داخل ہو جاؤں۔ مجھے تو کچھ زیادہ خبر نہیں تھی کہ زندگی کی کامیابی یا ناکامی کیا ہوتی ہے۔ مگر ان کی باتوں کے دوران مجھے بار بار یہ خیال گزر رہا تھا کہ فرض کر لو کہ میں انجینیر ہو بھی گیا، جو یوں بھی تقریباً ناممکن ہے کہ مجھے سائنس زہر معلوم ہوتی ہے۔ ریاضی سے مجھے للّٰہی بغض ہے اور ڈرائنگ میں تو ایک لکیر بھی سیدھی نہیں کھینچ سکتا۔ تب بھی ورکشاپ میں ملازمت کرنا تو میرے لئے کسی عذاب سے کم نہیں۔ ریلوے کارخانے کے گھگّو (سائرن) شاید شہر کی آبادی کم ہونے کے سبب دور دور تک سنے جاتے تھے۔ اور کارخانے کے ملازمین صبح جھٹپٹے کے وقت گھر سے نکلتے تھے اور شام پڑے واپس آتے تھے۔ اُجلے کپڑے پہن کر جاتے تھے اور میلے چیکٹ لوٹتے تھے ——— اس بات سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ مگر میرے لئے اس وقت یہ بات ممکن نہیں تھی کہ میں اپنے خیال کا اظہار کر سکتا۔ ابا بہت سنجیدہ تھے ——— معلوم نہیں کیا کیا امنگیں اس وقت ان کے دل میں کوند رہی ہوں گی۔ پس میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ وہ یہ سمجھے کہ میں ان کا فرمانبردار بیٹا ہوں۔ لہٰذا میری چپ ہی میری رضامندی ہے، جیسی اس زمانے میں نکاح کے وقت لڑکیوں کی خاموشی سے ان کی رضا معلوم کر لی جاتی تھی۔

دوسرے دن پراسپیکٹس بھی آ گئے۔ فارم بھی پُر کر لیا گیا۔ نمبر چونکہ کم تھے لہٰذا سفارش بھی تلاش کر لی گئی۔ جوں جوں یہ مرحلے طے ہو رہے تھے میرا دم گھٹتا جا رہا تھا۔ دو تین دن میں اپنے آپ کو ابا سے مذاکرات کے لئے تیار کرتا رہا۔ آخر تیسری رات میں ان کے ساتھ ہی لیٹ گیا ——— اور بڑی محبت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ہاتھ ان کے سینے پر رکھ دیا اور ایک ٹانگ ان کے پیٹ پر اور جیسے لاڈ میں آ کر کہا: "ابا ایک بات کہوں،

مانیں گے؟ ——— جواب دیا "کیا بات ہے، کہو۔" میں نے کہا "پہلے آپ وعدہ کریں کہ مانیں گے، پھر کہوں گا۔" میری اتراہٹ اور لجاجت بڑھتی جارہی تھی۔ وہ بولے "کہو تو۔" کہا "پہلے وعدہ۔" ——— انھوں نے حقّے کا ایک لمبا سا کش لیا، چند لمحے چپ چاپ آسمان کو تکتے رہے پھر کہا "ایسی کونسی بات ہے جس کے وعدے لئے جارہے ہو، کہو مانوں گا۔" تب میں نے اپنا منہ ان کی بغل میں دے دیا اور جھجکتے جھجکتے رک رک کر کہا "ابّا، بات یہ ہے کہ مجھے کارخانے کا کام ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ میں انجینیر بننا نہیں چاہتا۔ مجھے کالج میں داخل کرادیں۔ میرا جی چاہتا ہے، میں بی اے، ایم اے کروں اور پھر ماسٹر یا پروفیسر بنوں۔ مجھے یہ کام بہت اچھے لگتے ہیں۔" ابّا چپ چاپ سنتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگے ——— "بیٹا! میں تمھارے ہی بھلے کی کہتا ہوں۔ اگر تم نہیں چاہتے تو نہ سہی۔ اب جاؤ سو رہو۔ باقی باتیں کل ———" مجھے معلوم ہوا کہ حقیقی کامیابی تو اب حاصل ہوئی ہے۔

میرے پھوپھی زاد کہ اب میرے بہنوئی ہیں اور میں انھیں بھائی جی کہتا ہوں، ایف سی کالج اور دیال سنگھ کالج کے فارغ التحصیل تھے۔ وہ ان کالجوں کی بڑی کہانیاں سنایا کرتے تھے مزے مزے کی ——— ان مزیدار باتوں میں سب سے پرکشش بات یہ تھی کہ ان کالجوں میں لڑکیاں بھی ساتھ ہی پڑھتی ہیں۔ میرے خاندانی ماحول نے اور ابّا نے مسلسل یہ تربیت دی تھی کہ میں اور گھر کے دوسرے لڑکے اس بات پر ایمان کی حد تک یقین کرلیں کہ دنیا کی ہر لڑکی سے ہر لڑکے کا صرف ایک رشتہ ہے، اور وہ یہ کہ وہ بہن ہے۔ جب تک ان میں سے کسی ایک سے شادی نہ ہوجائے، اور بہن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا ایک ایسا گناہ ہے جس کی پاداش میں قیامت کو آنکھوں میں تپتی ہوئی سلائیاں پھیری جائیں گی۔ باقی چچا زادوں اور پھوپھی زادوں کا تو مجھے علم نہیں مگر میرا یہ حال تھا کہ میں کسی بھی لڑکی کو بہن نہیں بنا تا تھا۔ سوائے خاندان کی لڑکیوں کے۔ تاہم اس عجیب و غریب نظریے میں جو ہم میں سرایت کیا جاتا تھا۔ کامیابی یوں بھی ہوتی رہی کہ اس زمانے میں مسلمان محلوں میں عموماً لڑکی بے پردہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ تاہم میری سرشت میں بدی کا عنصر جو تھا وہ مجھ پر غالب رہتا تھا اور جب بھی کوئی لڑکی گلی بازار میں سامنے سے آتی یا چلمن میں سے جھانکتی محسوس ہوتی میری نظر بغیر کسی ارادے کے اس کی طرف اٹھ جاتی۔ یہ کیفیت تب سے ہے جب مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ لڑکی کیا ہے اور کیوں ہے مگر صرف یہ کہ میرا دل اچھا سا چہرہ دیکھ کر ذرا سا دھڑکتا تھا اور تھوڑی سی خوشی ہوتی تھی بس ——— اب جو کالج کے انتخاب کا موقع آیا تو میرے سامنے سب سے پہلے اسلامیہ کالج آیا۔ مجھے یہ کالج بالکل اچھا نہیں لگا، قطعی بور۔ اور باتوں کے علاوہ ساری دنیا اتوار کو ہفتہ وار چھٹی کرتی، اسلامیہ کالج جمعہ کو۔ مجھے یہ بات سخت ناپسند تھی۔ گورنمنٹ کالج تو ہم لوگوں کے خیال میں انگریز پرستوں کا مرکز تھا اور انگریز سے مجھے پیدائشی نفرت تھی۔ ایف سی کالج بھی انگریزوں ہی کا تھا۔ ڈی اے وی اور سناتن دھرم کالج تو یوں بھی مسلمانوں کے لئے ممنوع علاقے تھے۔ اب لے دے کر رہ گیا دیال سنگھ کالج۔ جس میں ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی تعلیم پاتے تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہاں لڑکیاں بھی ہوتی تھیں ——— پس دل میں فیصلہ کیا گیا کہ دیال سنگھ کالج بالکل ٹھیک ہے ——— فوراً وہاں گیا، پراسپیکٹس اور فارم لایا۔ شام کو ابّا کو دکھلائے۔ انھوں نے آہستگی سے کہا "تو تم نے واقعی یہی فیصلہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے پھر سوچ لو۔ بیٹا! زندگی بڑی مشکل چیز ہے۔ پھر سوچ لو۔" میں نے نہایت اعتماد اور استقامت سے جواب دیا "ابّا، میں نے سوچ لیا ہے۔ بس آپ مجھے داخل کرادیں۔"

اور دوسری صبح میں دیال سنگھ کالج میں داخل ہوگیا۔ کس قدر پرفضا تھا یہ کالج اس زمانے میں۔ داخلے کر میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ دو ہم جماعت بھی مل گئے۔ پہلے دن بہت ہی لطف آیا، بس جی خوش ہوگیا۔ یہاں مذہبی تفریق کا احساس بالکل نہیں ہورہا تھا۔ خوبصورت خوبصورت لڑکیاں پیارے پیارے کپڑوں میں ملبوس تتلیوں کی طرح آجارہی تھیں۔ میں نے تو اتنی خوبصورت اور اتنی تعداد میں لڑکیاں کبھی دیکھی ہی نہیں تھیں۔ عشق عشق کر اٹھا۔ دل کبھی تیز دھڑکتا کبھی رک رک جاتا۔ پہلی مرتبہ زندگی کا احساس ہوا اور میں نے سوچا کہ کم از کم اس معاملے میں، میں ابّا سے زیادہ عقلمند اور دور اندیش نکلا۔ بھلا انجینیرنگ کالج میں کیا رکھا ہے۔ ہتھوڑا اور چھینی لعنت بھیجو ——— بہر حال کلاسوں کے باقاعدہ

شروع ہونے تک میں روز صبح کالج آجاتا اور دوپہر تک وہیں رہتا۔ خوشی خوشی واپس جاتا اور پیٹ بھر کے روٹی کھاتا۔ پہلے دو چپاتیاں کھاتا تھا اب تین ساڑھے تین کھانے لگا۔ چلوؤں خون بڑھ رہا تھا ـــــ کلاسیں شروع ہوئیں ـــــ میں پہلا طالب علم تھا جو کلاس روم میں جا کر بیٹھا۔ پہلا پیریڈ اکنامکس کا تھا۔ میں اس مضمون کے بارے میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ کیا ہے ـ ـ ـ ـ بس نیا سا لگا اور میں نے فارم میں لکھ دیا۔ ایک بزرگ کلاس روم میں داخل ہوئے۔ یوں معلوم ہوا کہ محلے کا کوئی بنیا دھوتی کی جگہ کھدر کا تنگ مہری کا پاجامہ، کھدر کا کرتا، سر پہ ہندوؤں کی مخصوص ٹوپی اور دیسی جوتے پہنے تشریف لائے۔ دبیز شیشوں کی عینک سے طالب علموں پر نظر دوڑائی پھر چپ چاپ کرسی پر بیٹھے رہے تھوڑی دیر بعد اٹھے اور بتانے لگے کہ یہ مضمون ہے کیا ـــــ یہ بزرگ تھے پروفیسر چرنجی لال ـــــ پندرہ بیس منٹ بعد مجھے پروفیسر چرنجی لال اور اکنامکس دونوں سے دہشت ہونے لگی۔ جس کالج میں اتنی خوبصورت لڑکیاں ہوں اس کالج میں اتنا بھیانک استاد کیسے ہو سکتا ہے۔ اور میں نے فوراً طے کر لیا کہ میں یہ مضمون ہرگز نہیں پڑھوں گا۔ دوسرا پیریڈ انگریزی کا تھا۔ ایک گوارا سی شکل و صورت اور خوش لباس و خوش ادا اور خوش زبان استاد کمرے میں داخل ہوا۔ اور آتے ہی انگریزی یونہی شروع کر دی۔ بتایا کہ "میرا نام ایل آر سیٹھی ہے" پیریڈ اچھا بھلا گزر گیا۔ یہ شخص نہ زیادہ پسند آیا نہ ناپسند۔ انگریزی اس کی زبان سے میٹھی میٹھی لگ رہی تھی۔ میں تو انگریز اور انگریزی سے کمال کینہ رکھتا تھا۔ مجبوری تھی کہ اتنی پڑھوں جتنی امتحان میں کامیاب ہو سکے۔ تیسرا پیریڈ تھا، اس زمانے میں دیال سنگھ کالج میں عربی، فارسی، سنسکرت، فرانسیسی اور بنگالی میں سے ایک زبان لازمی انتخاب کرنی ہوتی تھی۔ ایک بھنبھناہٹ سی تھی۔ لڑکے ایک دوسرے سے تعارف کر رہے تھے۔ چند منٹ کے بعد استاد کمرے میں داخل ہوا۔ ایک دم سناٹا طاری ہو گیا۔ دراز قامت، گورا رنگ، پتلے پتلے ہونٹ، کھڑی کھڑی ناک اور اس پر سیاہ فریم کی عینک میں نہایت خوبصورت مگر ہنستی ہوئی آنکھیں، بھرا ہوا جسم کوٹ پتلون اور ٹائی سے آراستہ، سر سے ننگا، نہایت تیزی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ چوکی پر چڑھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ کلاس کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ اس قدر حسین و جمیل، اس قدر پرکشش کہ لڑکے تو دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ چند لمحوں بعد نہایت رسیلی، دلکش اور کسی حد تک لڑکیوں کی آواز میں اس نے تقریباً ان لفظوں میں خطاب شروع کیا:

"MY BOYS. I AM SYED ABID ALI. PERSIAN IS MY SUBJECT. ANY CHAP WRONGLY SITTING HERE MAY PLEASE GO."

پروفیسر سیٹھی کا جو تھوڑا بہت رعب دل پر بیٹھا ایک پل میں زائل ہو گیا ـــــ سید عابد علی انگریزی بولے جا رہے تھے۔ اور مجھ سمیت لڑکے عشاق کی طرح ان کو تکے جا رہے تھے۔ منہ سے پھول جھڑنے کا محاورہ اگر کہیں صادق آتا دیکھا ہے تو وہ یہاں پہلی اور آخری مرتبہ۔ یقیناً چند طالب علم غلطی سے بھی اس کمرے میں آ گئے ہوں گے مگر کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلا ـــــ اس زمانے میں فارسی انگریزی میں پڑھائی جاتی تھی۔ تقریباً دس منٹ تک کالج کی زندگی کے بارے میں کچھ تعلیم اور کچھ عام زندگی کے متعلق باتیں کرنے کے بعد حاضری لی اور پھر کہا کہ "دو دن میں کتاب خرید لو اور پھر تیسرے دن کلاس میں آنا" ـــــ پروفیسر سید عابد علی جب چلے گئے تو میں نے اپنے حافظے کو ٹٹولنا شروع کیا کہ یہ چہرہ تو بہت ہی مانوس سا معلوم ہوتا ہے یہ کون ہے، اسے کہاں دیکھا ہے ـــــ مجھے الجھن ہونے لگی۔ اس کے علاوہ دس برس اسکول میں پڑھا تھا۔ طرح طرح کے اساتذہ سے سابقہ پڑا تھا کرخت بھی، ملائم بھی، عالم بھی جاہل بھی مگر ایسا جادوگر استاد تو دیکھا ہی نہیں تھا کہ چند منٹ میں دور تک روح میں اتر گیا۔ گھر جا کر سیدھا بھائی جی کے پاس گیا اور سوال کیا کہ "بھائی جی یہ پروفیسر سید عابد علی کون ہیں؟ انھیں میں نے کہاں دیکھا ہے؟ وہ کہنے لگے "دیکھا کہاں ہے یہیں تو رہتے ہیں۔ پل کے ادھر منو سا سٹریٹ میں" اوہو، اب مجھے یاد آیا کہ شیرانوالہ دروازے کے باہر جرنیلی سڑک کے پار فاروق گنج کی نئی بستی کی طرف جاتے ہوئے ریلوے لائن سے پہلے جو مختصر سی آبادی ہے اس کی گلی کہ منو سا سٹریٹ کہلاتی ہے میں پروفیسر سید عابد علی رہتے ہیں اور میں نے انھیں یہیں آتے جاتے دیکھا ہے۔ اس کا مطلب ہے ان کی شخصیت میں کوئی غیر معمولی کشش ضرور تھی ورنہ میرے ذہن کے گوشے میں تو اکثر وہ چہرے

بھی محفوظ نہیں رہتے جنھیں میں متعدد بار تعارف کے ساتھ دیکھتا ہوں ـــــ

دو دن کے بعد فارسی کلاس ہوئی۔ سید صاحب پھر اسی ادائے محبوبانہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے، حاضری لی اور بغیر توقف کے کرسی پر بیٹھتے ہی طالب علموں سے نصابی کتاب "سبد گل" کا حصہ نظم نکالنے کو کہا۔ یہ حصہ سعدی کی غزل سے شروع ہوتا تھا۔ غزل پڑھنی شروع کی ـــــ

مشتاق و صبوری از حد گزشت مارا　　　گر تو شکیب داری طاقت نماند مارا

شعر پڑھنے کا یہ اسلوب کسی بھی استاد کے منہ سے میرے لئے انتہائی دلآویز تھا۔ میں نے اس سے پہلے کسی بھی استاد کو معانی یا شرح کرنے سے پہلے صرف قرأت کرتے اس خوبصورت لہجے اور آواز کے زیر و بم کے ساتھ نہیں سنا تھا۔ ان سے پہلے مرزا ہادی علی بیگ کرفائق رامپوری تخلص کرتے تھے، اب خاصے معمر ہیں اور سمن آباد میں خانہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ایک استاد ایسے خوش قسمتی سے نصیب ہوئے تھے جن کا انداز تدریس سحر کن تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ ذوق کی غزل ـــــ

لکھئے اسے خط میں کہ ستم اٹھ نہیں سکتا　　　پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اٹھ نہیں سکتا
آتی ہے صدائے جرس ناقۂ لیلےٰ　　　صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

جب پڑھا رہے تھے تو ساری کلاس بالکل گم ہو گئی تھی۔ اور جب یہ شعر انھوں نے پڑھا تو اس کی تفصیلی تشریح انھوں نے اس انداز میں کی کہ خود ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور طالب علموں کے بھی ـــــ

جو داغ معاصی ہے مرے دامن تر پر　　　جوں حرف سر کاغذِ نم اٹھ نہیں سکتا

اس غزل کا اثر میرے دل و دماغ پر اتنا گہرا ہوا تھا کہ اب تک محسوس کرتا ہوں۔ اور اس دن مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مرزا ہادی علی بیگ سے بہتر کونسا استاد ہو سکتا ہے ـــــ مگر عابد صاحب نے چند منٹ میں ان کے اثر کو محو تو نہیں کیا البتہ کچھ کچھ دھندلا دیا ـــــ غزل پڑھنے کے بعد لفظوں کے انگریزی میں معنی بتائے اور پھر گویا شعر کا ترجمہ کر دیا ـــــ ایسا کرنے کے بعد کتاب پر ہاتھ رکھ کر کلاس کی طرف دیکھا، دیکھتے رہے، اور پھر اردو میں سوال کیا کہ کچھ سمجھ میں آیا؟ ـــــ جواب خاموشی میں ـــــ پھر سوال کیا "کچھ سمجھ میں آیا؟" ـــــ لڑکوں نے زبان کی بجائے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا ـــــ پوچھا "کیوں، کیا مشکل ہے؟" ایک طالب علم نے جو اگلی ہی بنچ پر بیٹھا تھا جرأت کی، کھڑا ہو گیا اور کہا "جناب اتنی انگریزی سمجھ میں نہیں آتی ہے" سوال کیا "پھر کتنی آتی ہے؟" عرض کیا "ذرا بھی نہیں" ـــــ استاد کو یہ جواب اچھا نہیں لگا فرمایا "تو پھر پہلے انگریزی سیکھ کر آؤ ـــ" ایک اور لڑکا جھجکتے جھجکتے کھڑا ہو گیا۔ عرض کیا "جناب اگر چند دن تک پہلے اردو میں سمجھا دیا جائے اور اس کے ساتھ انگریزی میں تو بات بن جائے گی ـــــ کیا کریں جی انگریزی آتی ہی نہیں" اس نے کچھ ایسے مسکین انداز میں یہ بات کہی کہ شاہ صاحب مسکرا دئے، کہا "اچھا، پھر یوں کرو کہ دو تین غزلیں لکھ لو۔ گھر جا کر دہرا لیا کرو، ٹھیک ہے" لڑکے تو کھل گئے، یک زبان "ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ شکریہ جی شکریہ ـــــ" اس دن صرف ایک ہی شعر پڑھایا اور لکھایا گیا ـــ مگر جب میں کلاس سے نکلا تو محسوس ہوا کہ میرا سینہ علم سے معمور ہے۔

میں اسلامیہ اسکول کا طالب علم تھا۔ پرائمری تک میونسپل کمیٹی کے اسکول میں رہا۔ یہ ادارے مجھ سے غریبوں یا زیادہ سے زیادہ نچلے متوسط طبقے کے بچوں کے لئے ہوتے تھے ـــــ اسلامیہ اسکول انجمن حمایت الاسلام کی نگرانی میں قوم کے چندے سے چل رہے تھے۔ جو ادارے محض چندے سے چلتے ہوں ظاہر ہے ان کی حالت کیا ہو گی۔ عمارت اور فرنیچر تو خیر اہمیت رکھنے کے باوجود کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا مگر اساتذہ کے مالی حالات ایسے نہیں ہوتے تھے جن پر کوئی قوم اطمینان کا اظہار کر سکے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس زمانے میں اساتذہ ایک طرح سے قومی

خدمت کے جذبے کے تحت اس قسم کے مدارس میں ملازمت اختیار کرتے تھے۔ حالانکہ اپنے علم و فضل کے اعتبار سے کسی بھی غیر مسلم مدرسے کے عملے سے کم رتبہ نہیں ہوتے تھے۔ تاہم زندہ رہنے کے لئے صرف جذبہ ہی کام نہیں کرتا، مادّی ضرورتوں کو مادی ذرائع ہی پورا کر سکتے ہیں۔ اور جب انسان کی بنیادی مادّی ضرورتیں پوری نہ ہوں تو اس کا دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ رفتہ رفتہ اس کا سارا جوش، سارا ولولہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ مزاج میں استقلال باقی نہیں رہتا اور کام کرنے کی وہ لگن ختم ہو جاتی ہے جو اسے گھر سے نکال کر لاتی ہے شفقت کی جگہ جھنجھلاہٹ لے لیتی ہے

انجمن حمایت الاسلام کی خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے۔ شمال مغربی ہندوستان میں یہ ایک ایسی انجمن تھی کہ اگر نہ ہوتی تو خصوصاً پنجاب کے لوگ اگر بالکل غیر تعلیم یافتہ نہیں تو اب سے کم از کم پچاس برس پیچھے ضرور ہوتے۔ چند صاحب دل لوگوں نے بقول بعض سر سید کی علی گڑھ تحریک سے متاثر ہو کر اور بقول بعض سر سید کے مشورے سے اس انجمن کی بنیاد رکھی تھی۔ ایک ایک مٹھی آٹا روز جمع کرتے، اسے فروخت کرتے پیسے جوڑتے ۔ جوڑتے رہے۔ اس میں اتنی برکت ہوئی کہ بہت کم مدّت میں ایک اسکول قائم کر لیا۔ شہر کے شمالی حصّے میں شیرانوالہ دروازے سے متصل ۔ پھر یہ اسکول کالج بھی بن گیا۔ اور بہت عرصے کے بعد موجودہ اسلامیہ کالج' ریلوے روڈ۔ کی بنیاد رکھی گئی۔ مسلمانان پنجاب نے بھی دل کھول کر انجمن کی حوصلہ افزائی کی۔ یہاں تک کہ اس شہر میں چار ہائی اسکول، تین کالج اور ایک طبّیہ کالج انجمن کی نگرانی میں قائم ہوئے۔ ان اداروں کے اساتذہ چونکہ محض ملازمت کے لالچ میں یہاں ملازمت نہیں کرتے تھے اس لئے ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ نئی نسل کو اپنی صلاحیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ تربیت کریں۔ تربیت کرنے کے جو طریقے یہ اختیار کرتے تھے ان میں تعزیر پر زیادہ زور ہوتا تھا۔ ذرا سی بات پر مرغا بنا دینا، بید زنی کرنا، گھونسے مارنا تو عام بات تھی۔ طالب علم بھی بڑے ہی سخت جان ہوتے تھے۔ وہ پانچ سات منٹ میں ان تعزیروں کا اثر زائل کر لیتے تھے۔ مگر بعض مجھ ایسے کمزور اعصاب والے بھی تھے جو اکثر پریشان رہتے تھے۔ اسکول میں داخل ہونے سے چھٹی تک کا وقت ایک عجیب سے خوف ہی میں بسر ہوتا تھا۔ معدودے چند اساتذہ کے سوا یہ وطیرہ تقریباً سبھی استادوں کا تھا ——— اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، ہمارے ایک استاد تھے، جو ہمیں انگریزی اور ریاضی پڑھاتے تھے انھیں سزا دینے میں شاید کچھ زیادہ مہارت حاصل تھی۔ اور شاید انھیں اس میں کچھ تسکین پہنچتی تھی۔ پڑھاتے بہت اچھا تھے مگر ان کے گھونسے ہماری روح قبض رکھتے تھے۔ میرا تو انھیں دیکھ کر ہی رنگ اڑ جاتا تھا۔ جو آتا تھا وہ بھی بھول جاتا تھا معلوم نہیں کیسے ساتویں اور آٹھویں جماعت ان کی شفقتوں میں بسر کی۔ نویں جماعت چڑھا تو سب سے بڑی خوشی اس بات سے ہوئی کہ اور کچھ ہو نہ ہو ان بزرگ سے نجات مل گئی۔ مگر عجب ہوا کہ انتظامیہ نے انھیں ترقی دے کر میٹرک کی کلاس دے دی۔ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ جو آزادی کے گزرے ان پر برف پڑ گئی ۔ میں ریاضی میں ہمیشہ سے بہت ہی کمزور رہا تھا اور اس کا سبب بھی اب سوچتا ہوں تو اس قسم کے اساتذہ تھے جو پڑھاتے کم تھے پٹائی زیادہ کرتے تھے یا پڑھاتے تھے تو اس کا اثر ضائع کر دیتے تھے۔ خوف زدہ ذہن کیا سیکھ سکتا ہے۔ میٹرک میں ریاضی انگریزی میں تھی۔ ریاضی میں الجبرا کو خصوصاً میرا ذہن بالکل قبول نہیں کرتا تھا۔ ایک دن ایک نیا طریقہ سمجھانے لگے اور کچھ یوں شروع کیا:

(فرض کرو اے برابر ہے بی کے) SUPPOSE A = B

میری سمجھ میں یہ بات پہلے بھی کبھی نہیں آئی تھی کہ "فرض کرو الف برابر ہے ب کے" ——— میں سوچتا تھا کہ آخر میں کیوں فرض کروں۔ اگر فرض نہ کروں تو کیا نقصان ہوگا۔ نیز الف برابر ب کے ہی کیوں، الف برابر ج کے کیوں نہیں۔ میری بد قسمتی کہ میں نے جرأت کر کے یہ سوال ماسٹر صاحب سے کر ڈالا کہ "ماسٹر صاحب اگر میں یہ فرض نہ کروں کہ اے، بی کے برابر ہے تو کیا ہو" ——— وہ بہت اطمینان سے مسکراتے ہوئے میرے قریب تشریف لائے اور نہایت شفقت سے فرمایا "سوال دہراؤ"۔ میں نے دہرایا "جی میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ میں فرض کیوں کروں۔ اگر فرض نہ کروں پھر سوال کیسے حل ہوگا؟" ——— میرا سوال پورا ہوا ہی تھا کہ ایک دھاکے کی آواز آئی اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر دوسرا دھاکا، پھر تیسرا۔ اور میں ڈیسک پر گر گیا ——— دماغ ماؤف سا ہو گیا اور مجھے یہ خبر ہی نہ رہی کہ میں کہاں ہوں ——— معلوم

نہیں کتنے منٹ اسی حالت میں رہا۔ پھر رفتہ رفتہ میں اپنے آپ میں آنے لگا ـــــ تین دن بخار میں پڑا رہا ـــــ انجمن کا ایک اور اسکول تھا، وطن اسلامیہ ہائی اسکول ـــــ وطن کا لفظ اس لئے منسلک تھا کہ جس عمارت میں یہ اسکول قائم تھا اس کا نام وطن بلڈنگ تھا۔ بودتی دروازے اور اکبری دروازے کے درمیان سرکلر روڈ پر شاہ محمد غوثؒ کے مزار کے سامنے واقع ہے ـــــ میں نے ابا کو بڑی مشکل اور چالاکی سے اس بات پر رضامند کرلیا کہ یہ اسکول پڑھائی کے لحاظ سے شیرانوالہ اسکول سے بہت بہتر ہے۔ اور پھر میں نے اسکول بدل لیا ـــــ میں بہت خوش تھا۔ پڑھائی سے جو طبیعت اچاٹ ہوگئی تھی اس میں افاقہ ہونے لگا۔ ڈیڑھ دو مہینے میں میری ذہنی صحت بحال ہوگئی کہ ایک دن انگریزی کا پیریڈ شروع ہوا تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ وہی ماسٹر صاحب بید اور حاضری کا رجسٹر لئے کلاس روم میں داخل ہو رہے ہیں لڑکے نئے استاد کا پس منظر نہیں جانتے تھے اس لئے انھیں محسوس نہ ہوا۔ مگر میرا جی چاہا کہ میں اسکول کی تیسری منزل سے کود جاؤں ماسٹر صاحب نے حاضری لی، پھر کھڑے ہوئے۔ اب جو نظر مجھ پر پڑی ـــــ ہنس دئے، ہنستے رہے۔ لڑکے حیران کہ ماسٹر صاحب کو کیا ہوا۔ جب ان کی ہنسی کم ہوئی تو پکارا "اللہ اوئے انورا ـ ایدھر آ خان بچو ـ" میری ٹانگیں بے جان سی ہو رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے جگہ سے اٹھا، حاضر ہوا۔ چھٹتے ہی میرا کان پکڑ لیا اور کہا "حن دس خان بچو کتھے جائیں گا۔ میرا آکھا من پیو نوں کہو کیتھڈرل داخلہ دوا دے۔ اوتھے ماسٹر پیار کردے نے (اب بتا برخودار کہاں جائے گا؟ میرا کہنا مان اپنے باپ سے کہہ کیتھڈرل میں داخل کرادے۔ وہاں کے ماسٹر پیار کرتے ہیں) میرے دانت سلے ہوئے تھے، پھر غیر متوقع طور پر انھوں نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا، میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "پتر جی استاد دی مار کھاؤ گے تاں کجھ بن گے، نئیں تے دھکے کھاؤ گے، میں بے شک مار ناہاں پر کیوں تہاڈے ای بھلے نوں" (بیٹا جی استاد کی مار کھاؤ گے تو کچھ ہو گے، ورنہ دھکے ہی کھاؤ گے۔ میں بے شک مارتا ہوں مگر کیوں؟ تمھارے ہی بھلے کو۔) ایک پل میں نہ میرا خوف باقی رہا نہ ماسٹر صاحب سے شکوہ ـــــ اور اچانک یہ استاد مجھے بالکل اپنے ابا معلوم ہونے لگے۔ ڈیڑھ برس تک میں ان کی کلاس میں رہا۔ پھر انھوں نے مجھے کبھی کچھ نہیں کہا ـــــ آج یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو وہ مجھے بے حد یاد آرہے ہیں۔ اور میرا جی چاہ رہا ہے کہ اگر کہیں مل جائیں تو میں ان سے ان گستاخیوں کی معافی مانگوں جو میں دل ہی دل میں کیا کرتا تھا۔

اس ایک واقعے سے اسکول کے اس سنگلاخ ماحول کا اندازہ ہو سکتا ہے جہاں میں نے دس برس زندگی بسر کی تھی۔ یہ کالج کی فضا اس سے یکسر مختلف تھی۔ وہاں استاد یا پڑھاتے تھے یا نصیحتیں کرتے تھے۔ یہاں استاد صرف پڑھاتے تھے۔ وہاں استاد کو دیکھ کر خوف طاری ہوتا تھا یہاں استاد دوست معلوم ہوتے تھے۔ ہنستے تھے ہنساتے تھے، مذاق کرتے تھے ـــــ ممکن ہے بعض لوگوں کے نزدیک یہ ایک معمول کی صورت حال ہو مگر مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا گویا میں بلیک ہول سے نکل کر کشمیر کے مرغزار میں آگیا ـــــ عابد صاحب کی کلاس میں چند دن بسر کر کے یہ لذت اور بھی لذیذ ہوگئی۔ عابد صاحب کلاس میں صرف کتاب نہیں پڑھاتے تھے بلکہ معلوم نہیں کیا کیا پڑھاتے تھے۔ علم کیا ہے مجھے اس کا احساس کہہ لو یا شعور جان لو پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ دوسروں کے بارے میں تو میں نہیں کہہ سکتا، اپنے متعلق میں اتنا جانتا ہوں کہ میرا جی یہ چاہتا تھا کہ عابد صاحب بولتے رہیں اور میں سنتا رہوں۔ پینتالیس منٹ آنکھ جھپکتے ہی گزر جاتے تھے۔ جب گھنٹی بجی تھی تو جیسے دھچکا سا لگتا تھا۔ وہ واحد استاد تھے جنھیں میں نے اپنی زندگی میں کلاس میں سگریٹ یا پائپ پیتے دیکھا۔ اور ان کا یہ غیر روایتی طریقہ دل کو ناپسندیدہ لگا بہت ہی بھاتا تھا۔ مگر اتنی ذہنی قربت کے باوجود عجیب صورت حال تھی کہ کلاس سے باہر ہوائے سلام کرنے کے، وہ بھی ہچکچاتے ہچکچاتے کوئی اور بات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ بارہا جی چاہا کہ کوئی بات کروں مگر جرأت ہی نہیں ہوتی تھی۔ عجیب سا رعب تھا جو میرے دل و دماغ پر طاری تھا۔ اور حیرت اس بات پر ہے کہ آنے والے زمانے میں بھی جب میں ان سے بہت قریب ہوگیا تھا یہ رعب طاری رہا۔ حالانکہ وہ خود دوستا قریبی دوستوں کی طرح خاصے بے تکلف ہوگئے تھے۔

میری شاعری ابتدائی مرحلوں میں تھی۔ احسان صاحب کا تلمذ حاصل کئے ڈیڑھ دو برس گزر گئے تھے۔ احسان صاحب اوّل دن سے مجھ پر بہت ہی مہربان رہے۔ انھوں نے اصلاح دینے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ احسان صاحب مجھے بہت ہی اچھے لگتے تھے مگر معلوم نہیں کیوں اب مجھے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ عابد صاحب مسائل شعر پر جو عبور رکھتے ہیں وہ یقیناً حیرت انگیز ہے۔ اور کبھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ میں عابد صاحب سے شاعری کے بارے میں کچھ ایسے سوال کروں جو میرے ذہن میں اکثر کھٹکتے تھے۔ مثلاً کبھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ کوئی ایسی صورت جلد از جلد پیدا ہو جائے کہ مجھے اصلاح کی ضرورت نہ رہے۔ مجھے خود پر ذرہ برابر اعتماد نہیں تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں یہ اعتماد کیوں کر حاصل کروں ــــــ ظاہر ہے اس کے لئے مجھے زبان و بیان کی ایسی معلومات حاصل ہونی چاہیئے تھیں جو مجھے کسی اور محتاجی سے چھٹکارا دلا سکتیں ــــــ احسان صاحب کو میں غزل پیش کرتا، وہ بہت ہی محبت اور خلوص کے ساتھ اسے دیکھتے۔ جو غلطی ہوتی اسے دور کر دیتے تھے بعض اوقات لفظ تبدیل کر دیتے، بعض اوقات مصرع، کبھی کبھی تو شعر کا شعر ہی بدل دیتے تھے۔ بے شک میں کسی کے سامنے یہ اصلاح شدہ چیز بڑے اعتماد کے ساتھ پڑھتا تھا مگر میرا دل تو جانتا تھا کہ یہ لفظ، یہ مصرع یا شعر میرا نہیں ہے، احسان صاحب کا ہے۔ میں تو صرف پڑھ رہا ہوں ــــــ اور میں دل ہی دل میں شرمندہ سا ہوتا تھا۔ عابد صاحب جس طرح شعر سمجھاتے تھے، جس طرح اس کے فنی پہلو واضح کرتے تھے اس سے میرے دل و دماغ میں ایک کشمکش سی پیدا ہو گئی تھی اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ محض مصرعے جوڑنا شاعری نہیں ہے۔ یہ تو بڑا ہی نازک کام ہے، شیشہ گری ہے، ایک باقاعدہ فن ہے جو آدمی خود ہی سیکھ سکتا ہے۔ مگر مجھ میں تو اتنی جرأت بھی نہیں تھی کہ میں عابد صاحب سے کلاس میں سمجھ میں نہ آنے والی بات ہی سمجھ سکوں۔ چہ جائیکہ میں یہ ظاہر کرتا کہ میں شاعر ہوں۔

اس زمانے میں محرم کی چار چھٹیاں ہوتی تھیں۔ ساتویں، آٹھویں، نویں اور دسویں کی ــــــ اس سال معلوم نہیں کیا ہوا کہ پرنسپل نے ایک چھٹی یعنی ساتویں کی چھٹی کا اعلان نہیں کیا۔ کالج کے شیعہ لڑکوں نے جھٹ سے ہال کے سامنے والے لان میں ایک جلسہ منعقد کر لیا اور لگے احتجاجی تقریریں کرنے۔ چونکہ معاملہ چھٹی کا تھا لہٰذا اس احتجاج میں بغیر امتیاز مذہب و عقیدت طالب علم شریک تھے۔ غیر شیعہ مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ طالب علم بھی، بلکہ وہ زیادہ پر جوش تھے۔ کہتے تھے کہ آج محرم کی چھٹی کم کی ہے کل دسہرے کی کریں گے۔ آخر میں طے پایا کہ ہر کلاس سے ایک نمائندہ لیا جائے اور یوں چار طالب علم پہلے پروفیسر عابد علی سے رابطہ قائم کریں بعد میں پرنسپل صاحب سے۔ نمائندے انتخاب کرنے کا وقت آیا تو میری ہی کلاس کے ایک طالب علم نے جو میرا اسکول کا رفیق تھا میرا نام تجویز کر دیا اور چونکہ دوسرا کوئی اور نام تجویز نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا میں ان چار طالب علموں میں سے ایک مقرر ہوا جو اس کار خیر کے لئے عابد صاحب سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ شاہ صاحب اسٹاف روم کے ایک گوشے میں ٹانگیں پھیلائے آرام کرسی میں نیم دراز حالت میں مطالعے میں مشغول تھے۔ ہم ان کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے، سلام کیا۔ انھوں نے کتاب بند کر دی، آنے کا سبب پوچھا۔ ہم نے مدعا عرض کیا۔ سنتے رہے، سنتے رہے، مسکراتے رہے، پھر سوال کیا "تم لوگ کیا کرو گے اگر چھٹی مل جائے گی تو؟" عرض کیا۔ "یہ ہمارا مذہبی معاملہ ہے اور ہم کسی کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ ہماری مذہبی رسوم کی ادائیگی میں مداخلت کرے۔"
عابد صاحب نے کہا "بات یہ ہے کہ میرے اختیار میں کیا ہے۔ میرے پاس کیوں آئے ہو؟" کہا "اس لئے کہ آپ بھی شیعہ ہیں"۔ فرمایا "غلط" میں یہاں پروفیسر عابد علی ہوں، فارسی پڑھاتا ہوں، بس۔ یہاں نہ میں ہندو ہوں نہ مسلمان نہ شیعہ نہ سنی۔ تمھیں کسی نے غلط بتایا ہے۔" عابد صاحب کی اس منطق نے وفد کو لاجواب کر دیا اور میری نظر میں عابد صاحب اتنے قدآور ہو گئے کہ ان کا احاطہ کرنے سے قاصر ہوں۔ پھر ہم پرنسپل کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ڈاکٹر ہیم راج پرنسپل تھے۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے، کہاں چلے گئے ایسے لوگ، کتنا اداس ہو جاتا ہوں۔ میں کبھی کبھی جب ان استادوں کو یاد کرتا ہوں۔ اور اپنے زمانے کے استادوں کو دیکھتا ہوں۔ ڈاکٹر ہیم راج پنجاب بھر میں ریاضی کے مسلم استاد تھے سر سے پاؤں تک کھدر پوش، سر پر کھدر ہی کا پگڑ۔ پہلو میں حقہ دھرا تھا۔ اس قدر ملائم کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ ہم نے زیادہ سے زیادہ دو منٹ میں اپنا مقصد

بیان کیا۔ کہا "مجھے غلط بتایا گیا تھا۔ اگر واقعی یہ دن تمھارا مذہبی دن ہے تو ضرور کالج بند ہوگا۔ گھنٹی بجا کر ہیڈ کلرک کو بلایا اور اس سے کہا کہ "ساتویں کی تعطیل کا ابھی نوٹس لگا دو۔" پھر ہم سے کہا "بس اب تو خوش ہوتا۔ جاؤ اپنی اپنی کلاسوں میں"۔۔۔۔ کیا آج اس طرح مسائل حل کئے جاتے ہیں۔۔۔۔ ہم وہاں سے عابد علی صاحب کے پاس آئے اور انھیں صورت حال سے آگاہ کیا، مسکرائے، کہا "تیرہ سو برس میں زہر کم نہیں ہوا تم لوگوں کا۔"

یہ میری ان سے ان معنوں میں پہلی ملاقات تھی کہ کلاس سے باہر ہوئی تھی۔۔۔۔ ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ مگر جھجک کی کمر ٹوٹ گئی۔ پھر ایک دن اس بہانے سے حاضر ہوا کہ یہ غزل جو آج آپ نے پڑھائی ہے اس کے بعض شعر مجھ پر واضح نہیں ہوئے، کہا "پڑھو" میں نے شعر پڑھا۔ خفا سے ہو گئے۔ کہا "شعر پڑھنا نہیں آتا تو سمجھ میں کیسے آئے"۔۔۔۔ پھر خود پڑھا، کہا "اب پڑھو"۔ میں نے اسی طرح پڑھا۔ انھوں نے وضاحت کر دی۔ شعر تو جو سمجھ میں آیا سو آیا ایک بات ضرور سمجھ میں آئی کہ شعر کو پڑھنا بھی اپنی جگہ ایک سلیقہ ہے۔ دو تین دن بعد ایک دن پھر میں حاضر ہوا۔ اب کے ایک میرا ہم جماعت بھی میرے ساتھ تھا۔ جب ہم مطلب کی بات کر چکے تو اس کم بخت نے کہا "شاہ صاحب یہ بھی شاعر ہے۔" ایک دم شاہ صاحب کا سارا چہرہ مسکرا اٹھا۔ اور گویا طنزیہ انداز میں کہا "اچھا۔۔۔۔" اچھا کا چھا بہت ہی لمبا کر کے۔ میں شرمندہ ہو گیا۔ پھر کہا "کیا کہتے ہو؟" میں نے دل کڑا کر کے جواب دیا "غزل"۔ پوچھا غزل کیا ہوتی ہے؟ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ غزل کیا ہوتی ہے۔ میں تو بس غزل کہتا تھا۔ میں چپ کا چپ رہ گیا۔ میری پتلون کو چٹکی سے پکڑ کر کہا "یہ کیا پہنا ہوا ہے؟" عرض کیا "پتلون"۔ کہا "بتا سکتے ہو پتلون کیا ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے، جو کپڑا تم پہنتے ہو اس کے بارے میں جانتے ہو کہ کیا ہے۔ مگر غزل کہتے ہو اور جانتے نہیں کہ غزل کیا ہوتی ہے"۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر کہا "کچھ سناؤ"۔ ہر چند کہ مجھے اپنی جہالت سے شدید تکلیف محسوس ہو رہی تھی مگر میں نے جلدی سے خود پر قابو [illegible] ایک غزل سنائی، سنتے رہے، غزل ختم ہو گئی تو کہا "یہ غزل ہے؟" میرا تو دل ڈوب گیا۔ کہنے لگے "یوں تم کہہ سکتے ہو [illegible] کچھ پڑھا بھی کرو۔۔۔۔ اور میں منہ لٹکائے ہوئے اسٹاف روم سے باہر نکل آیا۔ باہر آکر میں نے اپنے ساتھی کو وہ تمام گالیاں [illegible] جو بچے آتی تھیں۔ اسے غصہ چڑھا ہوا تھا۔ کہنے لگا "یہ شاہ بڑا مغرور لگتا ہے۔ پتہ نہیں کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔ آ، مولانا کے پاس چل کر یہی غزل سنائیں۔" میں نے کہا "نہیں میں نہیں جاؤں گا۔" مگر وہ نہیں مانا اور زبردستی مولانا کے پاس لے گیا۔ جو باہر لان میں بیٹھے تھے۔

شمس العلماء مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی۔ درمیانہ قد، بڑی سی توند، بھرا ہوا چہرہ، شرعی سی ڈاڑھی، بدن پر اچکن، سر پہ ترکی ٹوپی، ہاتھ میں چھڑی، چہرے پر ظرافت بکھری ہوئی۔ آنکھوں میں ذہانت اور علم پھیلا ہوا۔ موٹے موٹے ہونٹ پان سے سرخ، مگر ان پر سدا کھیلتی ہوئی مسکراہٹ، نہایت خوش گفتار اور بلا کے بذلہ سنج۔ فقرہ کسنے اور فقرہ برداشت کرنے میں کمال حاصل تھا۔ عربی، فارسی اور اردو کے بے نظیر عالم۔ فن شعر پر عبور کامل۔ دیوبند کے تعلیم یافتہ۔۔۔۔ اپنے علم وفضل پر غرور تو نہیں کرتے تھے مگر اپنے آپ کو کسی سے کم بھی نہیں جانتے تھے، اور اس بات کا اعلان بھی کرتے تھے۔ طرح طرح کی منصوبہ بندیوں میں ان کا دماغ خوب کام کرتا تھا۔ ہندو مسلمان کی تفریق ان کے مسلک میں جرم تھی۔ کثیر الاحباب تھے۔ کبھی تنہا نہیں رہتے تھے۔ کوئی نہ کوئی ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ قدیم تہذیب کے لاہور میں شاید آخری نمائندہ تھے۔ خوردوں سے انتہائی شفقت سے پیش آتے تھے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی گویا ان کا فرض تھا۔ شاگرد کرنے کا انھیں شوق تھا۔ ان کے بے شمار شاگرد تھے۔ ان میں ہندو بھی تھے، مسلمان بھی، سکھ بھی۔ شاگردوں کی ایک جماعت کی انھوں نے مشاعرے کے لئے خاص طور سے تربیت کر رکھی تھی، جتھے بندی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ دیال سنگھ کالج میں نہایت محترم شخصیت تھے۔ اردو کے واحد استاد تھے۔ اس زمانے میں اردو صرف آپشنل کے طور پر پڑھائی جاتی تھی۔ مولانا کی کلاس کا طالب علم بے چینی سے انتظار کرتے تھے اور سب کچھ

چھوڑ کر ان کے پیریڈ میں حاضر ہوتے تھے ——— اس لئے نہیں کہ وہاں سے کچھ علم حاصل کرنا مقصود ہوتا تھا۔ علم تو مولانا کلاس میں چھپا کر رکھتے تھے یہ کام وہ اپنے گھر میں کرتے تھے۔ کلاس میں تو صرف لطیفہ گوئی اور جگت بازی کے لئے تشریف لاتے تھے۔ انھیں بڑی سے بڑی گالی دینے میں بھی باک نہ تھا اور طالب علم ان سے گالیاں کھا کر اتنا خوش ہوتے تھے کہ کلاس کے بعد دیر تک ان کا لطف حاصل کرتے رہتے تھے۔ کلاس زعفران زار ہوتی تھی۔ سکھوں کو سکھوں کے لطیفے سنا سنا کر مارتے تھے۔ ذات جماعت کا احساس انھیں شدید تھا۔ خود کو صحیح النسب درّانی پٹھان کہتے تھے، اور اس پر فخر کرتے تھے۔ جس شخص کے بارے میں انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ نسب کے اعتبار سے ان کے معیار کے مطابق نہیں اس سے گریز کرتے تھے —— بظاہر ہنسوڑ تھے مگر اندر سے بڑے ہی دکھی۔ دو جوان بیٹے ایک ہی دن میں وبائی مرض میں مبتلا ہو کر انھیں بہت ہی گہرے زخم دے گئے تھے۔ وہ مرے تو نہیں مگر کچھ زیادہ زندہ بھی نہیں تھے۔ شعر سے انھیں بلا کا لگاؤ تھا۔ نہایت پختہ گو شاعر تھے مگر عجیب بات ہے کہ کلام کبھی محفوظ نہیں رکھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ شاعر سے زیادہ شاعر گر ہیں۔ ان کا سب سے بڑا معرکہ اختر شیرانی تھا۔ جس پر انھیں بے حد ناز تھا۔ یوں ان کا دعویٰ تھا کہ احسان دانش بھی ان کے شاگرد ہیں۔ احسان صاحب اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ ن۔م۔ راشد، اودے سنگھ شائق، تلوک چند محروم اور ببیلا رام وفا ان کے شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ ان کے متعدد شاگرد اس زمانے میں نامور تھے۔

میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور بغیر کسی تمہید کے عرض کیا ”مولانا صاحب میں غزل کہتا ہوں۔ آپ میری ایک غزل سن لیجئے۔“ مولانا بہت خوش ہوئے۔ سوال کیا ”کیا نام ہے تمہارا؟“ عرض کیا سید محمد انور شہرت بخاری۔ کہا ”اوہ، اتنا لمبا نام، ہے۔ میاں شعر کہتے ہو تو تمھارا نام تمھارا تخلص ہی ہے۔ کیا ہے وہ؟“ جواب دیا ”شہرت بخاری“ فرمایا ”ہاں اب ٹھیک ہے —— اچھا تم سید ہو، بس ٹھیک ہے۔ کب سے شعر کہہ رہے ہو؟“ عرض کیا ”ساتویں آٹھویں جماعت سے۔“ کہنے لگے ”پھر تو تم خود استاد ہو گئے۔“ میں نے کہا ”نہیں مولانا میرا یہی تو مسئلہ ہے مجھے پتہ نہیں چل رہا ہے۔“ کہا ”اچھا سناؤ غزل۔“ میں نے غزل سنائی۔ کہا ”اچھی ہے۔ اس عمر میں اس سے اچھی کیا ہو گی —— مگر ایک شعر نکال دو یا دوبارہ کہو۔ اس میں جھول ہے (شعر مجھے یاد نہیں رہا) — میں اور میرا ساتھی خوش خوش سلام کر کے واپس آئے۔ اس دن میں عابد صاحب سے ناراض ہو گیا اور میں نے سمجھ لیا کہ میں خواہ مخواہ ان کے علم و فضل سے مرعوب ہو گیا۔ وہ علم جو دوسروں کے چراغ روشن نہ کر سکے علم کیا ہوا۔ استاد کا کام تو حوصلہ افزائی ہے حوصلہ شکنی تو نہیں —— اور یہی کوشش کرنے لگا کہ مولانا کی صحبت سے فیض حاصل کرتا رہوں۔ میں کبھی کبھار انھیں غزل سناتا تھا مگر ان سے اصلاح کا کبھی طالب نہیں ہوا۔ وہ خود ہی کرم کرتے اور میری کسی لغزش کی طرف اشارہ کر دیتے۔ فلیمنگ روڈ پر ان کا گھر تھا۔ کبھی کبھار وہاں بھی حاضری دیتا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک مولانا دنیا سے رخصت نہ ہو گئے۔ میں ان کا کالج میں شاگرد تھا اور اگر وہ مجھے شاعری میں بھی شاگرد کہتے تو فخر ہی کا باعث ہوتا۔ سبکی کی بات نہیں تھی۔ ایسے استاد تو اب چراغ لے کر ڈھونڈو نہ ملیں گے۔

میں عابد صاحب سے خفا تھا۔ میری عقیدت متزلزل ہو چکی تھی۔ مگر ان کی کلاس میں، میں اس محویت کے ساتھ حاضر ہوتا اور ان پینتالیس منٹوں کے لئے دل ہی دل میں جنگ بندی کر لیا کرتا تھا۔ وہ ایک دن کچھ جلدی فارغ ہو گئے۔ میں اگلی ہی بنچ پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھا اور کہا ”سنا بھئی کوئی غزل وزل کہی“ —— میں احتراماً کھڑا ہو گیا اور بڑے اعتماد کے ساتھ عرض کیا ”جی، روز کہتا ہوں“ مسکرا کر اور آنکھیں پھاڑ کر جن میں شرارت ناچ اٹھی تھی کہا ”اچھا“ پھر کلاس سے مخاطب ہو کر کہا ”تم لوگوں کو معلوم ہے تمھاری کلاس میں ایک شاعر روز ایک غزل کہتا ہے۔ تم سنو گے؟“ سب نے بیک آواز کہا ”ضرور جی ضرور“ شاہ صاحب نے کہا ”تو کبھی غزل سناؤ۔ مگر پہلے اپنا تعارف کراؤ“ مجھے پسینہ آ گیا۔ عرض کیا ”یاد نہیں“ کہا ”کیسے ہو سکتا ہے۔ جو روز غزل کہے اسے ضرور یاد ہونی چاہیئے“ ادھر لڑکوں کا اصرار بڑھا، شور سا ہو گیا۔ قصہ کوتاہ، میں نے غزل سنائی۔ سن کر کہا ”[illegible] —— مطلع میں ایطا ہے اسے دور کرا“ —— ایک دم میری صلح ہو گئی۔ میں بے حد خوش ہوا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ

یہ "ایطا" کیا ہے۔ کلاس کے بعد اسٹاف روم میں گیا اور عرض کیا "شاہ جی یہ ایطا کیا ہوتا ہے؟" کہا "اسی لئے میں نے کہا تھا کہ کچھ پڑھا بھی کرو۔" میں نے کہا "کیا پڑھوں آپ ہی رہنمائی کیجئے۔" فرمایا "داغ کو پڑھا ہے، ذوق کو پڑھا ہے، امیر کو پڑھا ہے؟" میں نے کہا "نہیں۔" کہنے لگے "پھر غزل کیسے کہو گے اور کیا سیکھو گے۔ انھیں غور سے پڑھو۔ اور حسرت موہانی کی کتاب نکات سخن کا مطالعہ کرو۔"——— پھر دیر تک سمجھاتے رہے کہ "ایطا" کیا ہوتا ہے۔

آج میں واقعی ایک استاد کے پاس سے اٹھ کر آیا تھا۔ دل کو ایک خاص قسم کا اطمینان حاصل ہوا تھا۔ اب میں کوشش کرتا کہ جب کبھی موقع ملے میں شاہ جی کے پاس جا بیٹھوں اور کوئی نہ کوئی بات سیکھوں۔ کوشش یہ کر رہا تھا کہ احسان صاحب کو یہ علم نہ ہو کہ میں عابد صاحب اور مولانا تاجور سے عقیدت کا اظہار کرتا ہوں۔ عابد صاحب کو یہ خبر نہ ہو کہ میں احسان صاحب اور مولانا تاجور کا ارادت مند ہوں اور مولانا تاجور کو یہ پتہ نہ چلے کہ میرا احسان صاحب یا عابد صاحب سے کوئی تعلق ہے۔ بس ایک ہی دھن تھی کہ جس کنوئیں سے جتنا پانی مل سکے پی لوں ——— لیکن حقیقت میں اصلاح احسان صاحب سے ہی لیتا۔ ان دونوں سے تو سیکھنے کی کوشش میں تھا۔ مولانا تاجور کو میں نے اصلاح دیتے دیکھا تھا۔ ان کا طریقہ بھی تقریباً وہی تھا جو احسان صاحب کا کہ مصرع کاٹ کر دوسرا لکھ دیا وغیرہ۔ مگر عابد صاحب شاگرد کرتے ہی نہیں تھے۔ وہ استادی شاگردی کے روایتی طریقے کے خلاف تھے۔ اگر کوئی سقم نظر آتا تو اس کی طرف اشارہ کر دیا کرتے تھے۔ یہ احسان بھی ہر ایک پر نہیں کرتے تھے۔ بہت ہی کم مبتدیوں کے ساتھ ان کا یہ سلوک ہوتا تھا۔ انھیں غزل سناتا ہمیشہ گھبراتا تھا۔ دراصل میں ان کے علم و فضل اور طبیعت کی براقی سے بے حد مرعوب تھا۔ اس کے علاوہ میں ان سے یوں ڈرتا تھا جیسے اسکول کے ماسٹروں سے خوفزدہ رہتا تھا۔ اس کا سبب مجھے معلوم نہیں، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں نے اسی رات ایک غزل کہی تھی۔ عابد صاحب کو اسٹاف روم میں فارغ بیٹھا دیکھ کر طبیعت مچل گئی اور میں نے طے کیا کہ آج شاہ جی کو غزل سنا ہی دینی چاہئے۔ چنانچہ لہراتا ہوا ان کے قریب آ کر سلام کیا اور لاڈ میں آ کر عرض کیا "شاہ جی آج ایک غزل سن لیجئے۔" اتفاق سے وہ بھی اچھے موڈ میں تھے، فرمایا "سناؤ۔" میں قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور غزل سنانے لگا۔ وہ بالکل خاموش تھے نظر بھی اٹھا کر نہ دیکھا۔ میں نے اس طرف توجہ نہ کی۔ غزل ختم کر کے کاغذ ان کی طرف بڑھایا۔ جیسے احسان صاحب کے سامنے رکھ دیتا تھا۔ اور عرض کیا "شاہ جی اس کی اصلاح کر دیجئے۔" انھوں نے اطمینان سے کاغذ میرے ہاتھ سے لے کر اسے پرزے پرزے کر دیا اور کہا "بس جاؤ۔" میں تو سناٹے میں آ گیا۔ بات کرنا چاہوں زبان ساتھ نہ دے، اٹھنا چاہا اٹھا نہ گیا۔ شاہ صاحب نے کتاب کھول کر پڑھنی شروع کر دی ——— میں بیٹھا رہا۔ پانچ سات منٹ بعد بغیر نظریں کتاب سے اٹھائے کہا "جاؤ اپنا کام کرو۔" مجھے غصہ سا آ گیا۔ میں نے کہا "کہاں جاؤں شاہ جی، آپ نے غزل پھاڑ دی۔ یہ نہیں بتایا کہ کیوں۔" کتاب بند کی اور کہا "غزل، کونسی غزل، وہ غزل تھی؟" میں نے کہا "میں تو غزل ہی سمجھ رہا ہوں۔"——— بحث کرنا چاہتے ہو کیا؟" عرض کیا، "نہیں سیکھنا چاہتا ہوں۔" مسکرا دئے، فرمایا "تم سے کہا ہے کہ محض قافیہ بندی غزل نہیں ہوتی۔ کچھ پڑھا کرو۔ دوسرے، اصلاح کا قائل نہیں خود اصلاح کرو۔ بس اب جاؤ میرا دماغ نہ چاٹو۔" میں نے ضد کر کے کہا "میں نہیں جاؤں گا۔ میں آپ کا شاگرد ہوں۔" کھل کر مسکرائے کہا "یار تو تو بڑا کمینہ ہے۔ بندے خدا کے اصلاح کے زمانے گزر گئے۔ اچھا یوں کرو اسی زمین میں اور شعر کہو۔"——— میں دوسرے دن پھر اسی زمین میں شعر کہہ کر لے گیا ——— دیکھے، کہا "پھر کہو۔ ابھی کہو۔ یہیں بیٹھ کر۔" یہ کام تو میں نے کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ میں نے کہا، کل لاؤں گا۔ شاہ صاحب اب مہربان ہو چکے تھے، کہا "نہیں، ابھی کہو۔ دس منٹ میں پانچ شعر۔" پانچ تو نہیں تین شعر واقعی ہو گئے۔ دکھائے، کہا "یہ تین شعر ان پندرہ شعروں سے بہتر ہیں جو تم کہہ کر لائے تھے۔ مشق اور مطالعہ جاری رکھو اور اصلاح کا وہم نکال دو۔ اصلاح سے شاعر اپنی ذات کو گم کر دیتا ہے۔ اگر کوئی وزن میں مصرعے جوڑ سکتا ہے تو اسے اصلاح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف رہنمائی درکار

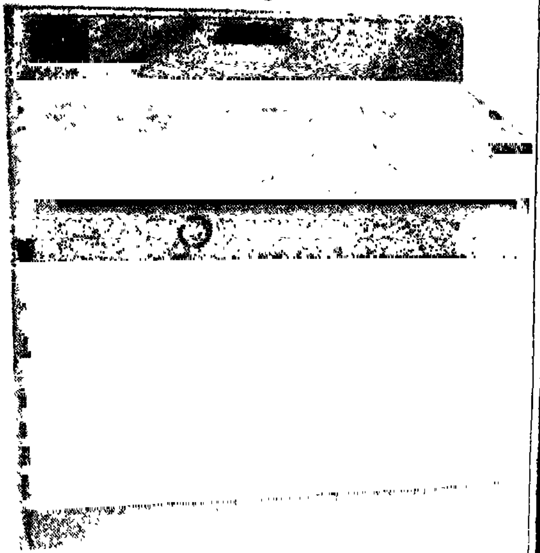
ہوتی ہے۔ تم نے داغ کو پڑھا ہے؟" میں نے عرض کیا "تھوڑا سا"۔ کہا "نہیں، داغ کو توجہ کے ساتھ پڑھو کہ داغ سے نہ صرف زبان و بیان کی نزاکتیں سیکھو گے بلکہ شعر کہنے کا سلیقہ بھی سیکھو گے۔ پھر ذوق کو پڑھو، امیر کو پڑھو۔" میں نے کہا "شاہ جی، داغ کو تو میں نے آپ کے حکم کے مطابق پڑھا۔ وہ تو خیر ٹھیک ہے۔ یہ ذوق اور امیر پڑھے نہیں جاتے۔" ناراض ہو گئے۔ "کیوں، ان سے گزر گئے ہو — آج لڑکوں میں جو تباہی مچی ہوئی ہے اس کا سبب یہی ہے۔ ذوق اور امیر ہی نہیں، اگر واقعی شعر کہنا ہے تو لکھنؤ کے سارے شاعر پڑھو، غالب اور میر کو ابھی ہاتھ نہ لگانا، یہ کھا جائیں گے۔"

بس اس طرح میں جب موقع ملتا شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا اور مجھے راستے آسان معلوم ہونے شروع ہوئے۔ اس زمانے میں لاہور میں مشاعروں کا بڑا زور تھا۔ کہیں نہ کہیں مشاعرہ ہوتا ہی رہتا تھا۔ شاہ جی مجھے اپنے ساتھ کبھی کبھی میری فرمائش پر مشاعرے میں بھی لے جاتے تھے۔ مگر میں پڑھتا نہیں تھا۔ صرف سنتا تھا۔ البتہ اسلامیہ کالج کے ایک نہایت ہی خوبصورت مشاعرے میں شاہ جی نے کہا، یہاں تم غزل پڑھو۔ ایسی محفل کم کم منعقد ہوتی ہے۔ کوئی قابل ذکر شاعر ایسا نہیں تھا جو یہاں موجود نہیں تھا۔ اس مشاعرے میں ناصر کاظمی سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ ایسی ملاقات کم کم کسی سے ہوتی ہے۔ وہ بھی اس زمانے میں اس کالج میں ایف اے کا طالب علم تھا۔ میں نے اقبال کی مشہور غزل کی زمین "مقام ابھی اور گام ابھی" میں غزل کہی تھی۔ اچھی خاصی داد مل گئی تھی۔ دوسرے دن کالج میں شاہ صاحب نے مجھے علیحدہ داد دی۔ اللہ اللہ، اب ایسے استاد کہاں ملتے ہیں۔

مگر مجھے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا — میں گم ہو گیا۔ مجھ سے سب کچھ چھن گیا۔ دیال سنگھ کالج بھی، شاہ صاحب بھی، مولانا تاجور بھی — کئی سال کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارتا رہا۔ کئی سال طوفان کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ اس تمام مدت میں میری عابد صاحب سے ملاقات بھی نہ ہو سکی۔ ان کے مشورے کو فراموش نہیں کیا اور جب موقع ملتا مختلف اساتذہ کے کلام سے دل و دیدہ کو روشنی دیتا رہا۔ پھر یوسف ظفر کے ہمراہ گاہے گاہے حلقۂ ارباب ذوق کے جلسوں میں شریک ہو جاتا اور یوں رفتہ رفتہ مجھ میں اعتماد پیدا ہونے لگا۔ پڑھتا رہا اور اصلاح کا سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا — اس دوران کسی نہ کسی طرح میں نے منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ اس امتحان سے مقصود صرف فارسی پڑھنا تھا — ریلوے میں ملازمت حاصل کرنے کے بعد مجھے دوبارہ تعلیم کا سلسلہ شروع کرنے کا موقع ملا۔ اور میں ایک دن عابد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ البتہ مجھ میں غالباً تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے سلام کیا تو دو تین منٹ تک مجھے دیکھتے رہے، یا تو مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے جیسا کہ میں نے خیال کیا، یا پھر وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے ہوں گے کہ یہ آج کہاں سے آ گیا۔ پھر ان کے چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ہاتھ آگے بڑھایا اور کہا "او کے توں اجے جیوناں ایں"۔ میں نے مختصراً روداد بیان کی۔ تسلی دی۔ جب میں نے اپنے حاضر ہونے کا مقصد بیان کیا تو خوش ہوئے۔ اسی وقت مجھے داخلہ مل گیا — میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کس قدر اطمینان نصیب ہوا۔ معلوم ہوا کسی بڑی نعمت سے محروم کر دیا گیا تھا جو دوبارہ حاصل ہو گئی — دیال سنگھ کالج اسی طرح آباد تھا۔ اس طرح رنگین تھا مگر میرے پاس اب نہ وہ دل تھا نہ دماغ۔ اجاڑپن میں ابھی تندی باقی تھی۔ بھاگم بھاگ دفتر سے آتا، بھاگم بھاگ واپس چلا جاتا۔ کبھی دو آتا، کبھی ایک دو پیریڈ پڑھتا۔ شاہ صاحب سے فیض پانے کا موقع بھی بہت کم نصیب ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ بی اے کر لیا۔ پاکستان بن چکا تھا۔ دیال سنگھ کالج میں صرف تین مسلمان استاد تھے۔ بس وہ رہ گئے۔ عابد صاحب، مولانا تاجور اور عاشق محمد غوری۔ عابد صاحب پرنسپل تھے بلکہ ایک طرح سے کالج کے سب کچھ تھے۔ یہ زمانہ عابد صاحب کی زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ نہایت کامیاب روز و شب۔ دیال سنگھ کالج پہلے سے بھی زیادہ بارونق ہو گیا تھا۔ لاہور میں اب تک دو کالج ادبی حیثیت میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ ایک گورنمنٹ کالج دوسرا اسلامیہ کالج۔ ان دونوں کی ایک روشن شعری روایت تھی۔ پاکستان سے پہلے کے دیال سنگھ کالج نے غالباً صرف تین شاعر پیدا کئے تھے۔ قیوم نظر، اکبر لاہوری اور ملاح بلدیو راج

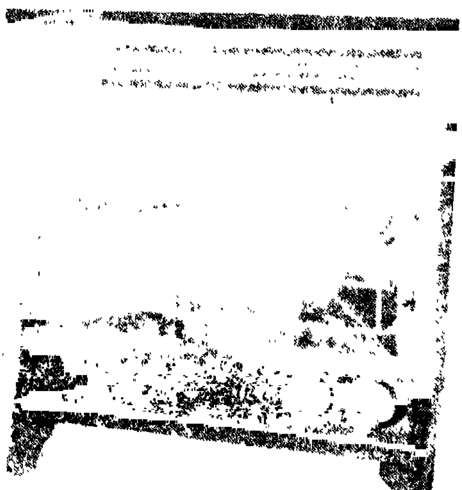

رومیو اینڈ جولیٹ کی نئی پیشکش
رومیو اینڈ جولیٹ
روزانہ استعمال کا نرم اور لطیف شیمپو
یہ ایک خاص فارمولے کے تحت بنایا گیا ہے۔
اس کا روزانہ استعمال، بالوں اور جلد کی بے ضرورت
چکنائی اور کثافت کو بغیر نقصان پہنچائے دھو دیتا
ہے اور بال قدرتی انداز میں نکھر آتے ہیں۔
اتنا معیاری شیمپو پہلے دستیاب نہ تھا۔
اس کا مناسب مقدار میں ایک استعمال ہی کافی ہے۔
ملائم، چمکدار اور دلکش
بالوں کا راز
رومیو اینڈ جولیٹ
روزانہ استعمال کا شیمپو
Romeo and Juliet
SHAMPOO

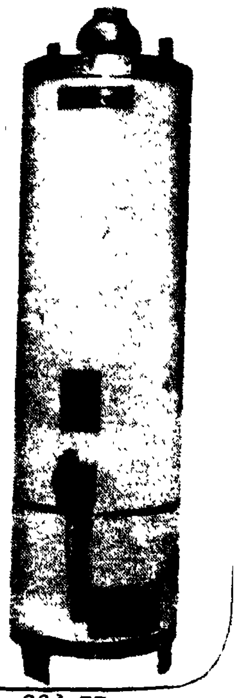
جدید طرزِ رہائش کے لئے
افادیت اور آسائش کے لئے



فائر کنگ کُکنگ رینج

نیا ماڈل - ۴ برنرز، اوون
آسان کنٹرول۔ گیس کے خرچ میں کفایت
بہترین تام چینی کی فنش





فائر کِنگ گیس ہیٹر

چھوٹے بڑے کمروں کو گرم رکھنے کے
لئے بے نظیر گیس کے خرچ میں کفایت
خوشنما اور پائیدار۔ گھروں،
دکانوں، ہوٹلوں کیلئے لاجواب

فائر کِنگ واٹر ہیٹر

باورچی خانے، غسلخانے وغیرہ میں گرم پانی کی کم خرچ مسلسل فراہمی
کے لئے بہترین، خوشنما اور پائیدار۔

تیار کردہ:
رائل گیس اپلائنسز
۳/۱۴۲۵ ڈرگ کالونی - کراچی ——— فون:- ۴۹۹۵۴

MASS--364/77



ماہنامہ

ناول سیریز | الفاظ | آرٹس

مگر اب دیال سنگھ کالج شعری مرکز بن گیا۔ کوئی نہ کوئی ادبی محفل یہاں برپا رہتی تھی۔ مشاعرے تو مہینے میں دو تین ضرور ہوتے تھے۔ لاہور سے باہر کا یا ہندوستان کا کوئی ادیب یا شاعر لاہور آتا تو اس کے اعزاز میں محفل ضرور منعقد ہوتی۔ دتاتریا کیفی، فراق گورکھپوری، اثر لکھنوی، ڈاکٹر عبدالودود ڈاکٹر مالک رام، آنند نرائن ملا۔ جگر مرادآبادی، یاس یگانہ چنگیزی، نیاز فتح پوری، آل احمد سرور، ڈاکٹر عندلیب شادانی اور کون نہیں تھا جو لاہور آتا اور دیال سنگھ کالج میں نہ آتا —— کالج میں دن رات شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ اساتذہ میں انجم رومانی تو خیر باقاعدہ شاعر تھا ہی اور بھی کئی خربوزے تھے جو خربوزوں کو دیکھ کر رنگ پکڑ گئے تھے۔ حتیٰ کہ دفتر کے کلرک تک شاعر ہو گئے تھے۔ رحمان مذنب ہیڈ کلرک تھے وہ نقاد بھی بن گئے، محقق بھی اور شاعر بھی —— مختصر یہ کہ دیال سنگھ کالج لاہور شہر کا لکھنؤ بن گیا تھا —— عابد صاحب اس برات کے دولھا تھے ——

میں نے ایم اے اردو اورنٹیل کالج سے کر لیا —— اب فارسی میں داخلے کا ارادہ کیا۔ میں اس زمانے میں موہنی روڈ کی ایک گلی میں دو کمروں کے ایک مختصر سے مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ شاہ صاحب کو سجاد رضوی کے ذریعہ معلوم ہوا تو کہا کالج ہوسٹل میں آجاؤ۔ تنہائی بھی ٹل جائے گی، کھانے وغیرہ کا بھی آرام ہو جائے گا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ فارسی ایم اے کے لئے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لے لیا جائے"۔ اندھا کیا چاہے۔ چنانچہ کالج سے ملحق رام موہن رائے ہاسٹل میں کمرہ مل گیا اور چین سے بسر ہونے لگی۔

اس زمانے میں مجھے شاہ صاحب سے حقیقی قربت نصیب ہوئی۔ ہفتے میں دو تین شامیں ان کی صحبت میں ان کے گھر گزرتیں۔ وہ اس زمانے میں پرنسپل کے سرکاری مکان میں سکونت پذیر تھے۔ یہ مکان ایمپرس روڈ پر مجیٹھا ہال کہ دیال سنگھ کالج کا دوسرا ہاسٹل تھا، کے احاطے میں تھا۔ ڈیوڑھی سے ملحق ایک کمرہ شاہ جی نے اپنے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ اس میں ان کا عظیم اور نادر کتب خانہ تھا۔ ایک کونے میں مسہری بچھی رہتی تھی، جس پر وہ بیٹھے رہتے۔ چند کرسیاں اور ایک میز مسہری کے قریب پڑی رہتی۔ ہر شام ارباب ذوق علم و ادب کے اس سرچشمے سے اپنی پیاس بجھانے آتے تھے —— لوگ آتے رہتے تھے، جاتے رہتے تھے۔ شاہ صاحب سب کی مشکل کشائی کرتے رہتے تھے۔ بلا مبالغہ اور بغیر کسی قسم کی بھی جانبداری کے اور بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ شاہ صاحب کو میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا عالم پایا۔ اتنا علم کسی اور کے سینے میں محسوس نہیں کیا۔ بڑا بڑا مدعی ان کے مقابلے میں بونا معلوم ہوتا تھا اور میں کسی ایسے صاحب علم کو نہیں جانتا جسے میں نے اس بارگاہ میں حاضری دیتے نہیں دیکھا۔ میں نے شاہ جی کو الٰہیات سے جنسیات تک کسی بھی موضوع پر بند نہیں پایا۔ معلومات کا ایک سمندر تھا جو ان کے اندر موجزن رہتا تھا۔ علم کے ساتھ اگر ذہانت اور ذوق سلیم نہ ہو تو ایسے صاحب علم کو ایک ایسا پتھر سمجھنا چاہئیے جو کسی بھی اور کسی کے بھی کام نہیں آتا۔ قدرت نے شاہ جی میں یہ تینوں صلاحیتیں بیک وقت جمع کر دی تھیں اور جیسی بہت کم لوگوں میں ہوتی ہیں۔ میں نام نہیں لوں گا لیکن میری باتیں پڑھنے والے ذرا توجہ کریں گے تو انھیں ایسے لوگ یاد آجائیں گے جو زبردست عالم یا محقق ہوتے ہیں مگر ذہانت اور ذوق سلیم کے فقدان یا کمی کے باعث ان کا علم خس و خاشاک سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ شاہ صاحب کا حافظہ حیرت انگیز تھا۔ یقیناً میں نے ایسا حافظہ نہیں دیکھا۔ جو چیز ایک مرتبہ پڑھ لی ممکن نہیں کہ پھر وہ اسے بھلا سکیں۔ لاکھوں شعر اردو اور فارسی کے انھیں ازبر تھے۔ اور جنھیں وہ اس قدر برمحل پڑھتے تھے کہ مخاطب کے اندر چکاچوند ہو جاتا تھا۔ شعر تو شعر نثر کے حوالے انھیں یوں یاد رہتے تھے کہ آدمی سن ہو جاتا تھا۔ فارسی، اردو انگریزی تینوں زبانیں انھوں نے یوں کھنگالی تھیں کہ اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ جس قدر جدید ادب میں غرق تھے اسی قدر کلاسیکی اور قدیم ادب کے شناور تھے۔ انگریزی اور دیگر مغربی ادب اور ادبی تحریکوں سے بحد کمال آشنا تھے اور فارسی کے ذریعے عربی سے شناسا تھے۔ یوں عربی سے نابلد نہیں تھے۔ اس طرح فرانسیسی سے بھی ناواقف نہ تھے —— عموماً تجربہ یہ ہے کہ بہت کم لوگ علم و فضل کے ساتھ ساتھ بحث و تمحیص میں طاق ہوں —— شاہ صاحب کا کمال یہ تھا کہ ان سے بڑا بڑا کج بحث کنی کتراتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو علم کے کوچے کا گدائے متکبر کہا کرتے تھے —— زبان پر آئی بات روک نہ سکتے تھے۔ غلط کو غلط ہی کہتے تھے، خواہ کوئی بھی ہو۔ صحیح کو صحیح ہی کہتے تھے۔ خواہ

کسی مبتدی سے متعلق ہو۔ اپنے ہم عصروں سے بحث کرکے بڑے خوش ہوتے تھے اور لاجواب کرکے بڑا سکون محسوس کرتے تھے۔ وہ جب کوئی رائے دیتے تھے تو اسے تسلیم کرانا بھی جانتے تھے، اور مقابل یا تو ان کا ہمنوا بن جاتا تھا یا لڑ پڑتا تھا یا زہر کا گھونٹ پی کر چپ ہو جاتا تھا۔ یہ چپ ہو جانا منافقانہ ہوتا تھا۔ اس لئے کہ ان کے پیٹھ پیچھے وہ زہر اگلتا تھا۔ یہی باعث تھا کہ لاہور میں تنہا انسان تھے۔ محفلوں یا جلسوں میں انھیں مدعو کرنا ایک مجبوری تھی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اکثر و بیشتر معاصرین انھیں ایک آنکھ دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ان سے ڈرتے تھے۔ سہمے رہتے تھے۔ لاہور میں شاعر دو دھڑوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک دھڑے کے سربراہ شمس العلماء تاجور نجیب آبادی تھے۔ دوسرے کے ڈاکٹر تاثیر۔ اول الذکر کی ساری سرگرمیاں اورینگ دو دو مشاعرے تک محدود تھیں۔ ہر چند کہ مولانا تاجور نے ادبی دنیا اور شاہکار ایسے موقر جریدے بھی جاری کئے ــ ایک ادارہ بھی قائم کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ قدیم و جدید اردو نثر اور اردو نظم کا ایک معیاری انتخاب متعدد جلدوں میں شائع کیا جائے۔ اس ادارے میں بہت سے نامی گرامی شاعر اور ادیب جمع کئے گئے۔ مولانا اس ادارے کے سربراہ تھے۔ سید عابد علی عابد، پروفیسر عبداللطیف ــ، سہا مجددی، آسی گونڈوی، یاس یگانہ چنگیزی، جگر مراد آبادی، سیماب اکبر آبادی اور کئی دوسرے ــــــ یہ ادارہ پنجاب کے مشہور و معروف ناشر عطر چند کپور کا تھا۔ جو مولانا کے بے حد عقیدت مند تھے۔ یہ بات عجیب و غریب تھی کہ مولانا کے عقیدت مندوں میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہندو اور سکھ تھے، بلکہ غیر مسلم شاعر اور ادیب مولانا ہی کے آستانے پر حاضر ہوتے تھے۔ اور مولانا بھی انہی کی حوصلہ افزائی زیادہ کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے اردو کو اگر واقعی فروغ دینا ہے تو ہندوؤں اور سکھوں کا دل بڑھانا لازمی ہے ــــ بہرحال لوگوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ وہ تو کہا کرتے تھے کہ مولانا ہندوؤں سے مالی منفعت حاصل کرتے ہیں اور شمس العلماء کا خطاب بھی انھیں غیر مسلموں کی کوششوں سے حاصل ہوا تھا۔ تنگ نظر مسلمانوں کو کبھی ان پر بڑے اعتراض تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مولانا فاضل دیوبند تھے۔ لاہور میں جب آئے ہیں تو صوم و صلوٰۃ کے پابند بھی تھے۔ مگر دیال سنگھ کالج میں ملازمت حاصل کرتے ہی ان کے روابط ہندوؤں سے بڑھنے لگے اور وہ مذہب سے دور سے دور تر ہوتے چلے گئے۔ بلکہ یہاں تک کہ ان کی صحبت میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ وہ اپنے ہم نشینوں اور شاگردوں کو بھی مذہبی تعصب کے خلاف ہموار کرتے رہتے تھے۔ مشاعرے میں بھی ان کے اکثر شاگرد ہندو ہوتے تھے۔ اودے سنگھ شائق، کرتار سنگھ بیدار، پرشوتم لال ضیا، میلا رام وفا، خوشتر گرامی، تلوک چند محروم، جوتی لال کاوش سرحدی ــــــ یہ نہایت وفادار لوگ تھے جو مولانا کے نام کی مالا جپتے تھے ــــ علاوہ ازیں مولانا کو انجمن سازی کا بھی بہت شوق تھا۔ دیگر ادبی انجمنوں سے قطع نظر حلقہ ارباب ذوق کی سرگرمیوں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ قدیم وضع کے انسان تھے۔ ان کی ساری تعلیم قدیم طریقے کی تھی۔ انگریزی وہ شاید برائے نام ہی جانتے تھے۔ مگر بلا کے زمانہ شناس تھے۔ نئی شاعری نے پُرزے نکالے تو مولانا نے اپنے دیگر معاصرین کی طرح اس کی ہرگز مخالفت نہیں کی بلکہ حوصلہ افزائی کی۔ اس زمانے میں شاعروں اور ناقدوں کا باقاعدہ ایک گروہ ایسا تھا جو بلینک ورس اور فری ورس کو قطعی شاعری ماننے کو تیار نہ تھا جیسے آج کل نثری نظم کو شاعری کے احاطے سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ آج کل تو چونکہ ادبی سرگرمیاں ہیں ہی نہیں۔ نئے ہوں یا پرانے لکھنے والے گوشوں میں سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ ادبی رسائل بھی کسی خاص جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کر رہے مگر وہ زمانہ تو بہت گہما گہمی کا تھا ــــــ راشد، میراجی، فیض، قیوم نظر اور یوسف ظفر لاہور میں نظم کہہ رہے تھے اور ڈاکٹر عندلیب شادانی ڈھاکہ میں بیٹھے ان کے خلاف محاذ بنا رہے تھے۔ وہ اس قسم کی نظموں کو پابند کرکے دکھا رہے تھے۔ کہ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے ملاحظہ فرمایا جائے کہ یہی باتیں پابند شاعری میں ہو سکتی ہیں۔ اس طرح اور بھی بہت سے نقاد کام کر رہے تھے۔ مگر مولانا تاجور اس انداز کے خلاف تھے۔ قیوم نظر ان کے شاگرد تھے۔ نظر تخلص مولانا نے ہی دیا تھا۔ بعد میں قیوم نظر عابد صاحب کے حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے تھے مگر نہ اس طرف سے احترام میں کمی آئی نہ اس طرف سے شفقت میں ــــ قیوم نظر حلقہ ارباب ذوق پر اس کے جنم ہی سے چھائے ہوئے تھے۔ وہ حلقے کے سب کچھ تھے اور حق تو یہ ہے کہ حلقہ ارباب ذوق بعد میں ایک ایسا دبستان

بن گیا کہ اپنی محدود سرگرمیوں اور بے سروسامانی کے باوجود ہندوستان گیر ترقی پسند تحریک کا ایک جاندار حریف اور مدمقابل ثابت ہوا یہ تیوم نظر ہی کی شبانہ روز تگ و دو کا حاصل تھا۔ قیوم نظر مولانا کو حلقہ ارباب ذوق میں لے جاتا۔ ان کی صدارت کراتا۔ میں نے حلقہ ارباب ذوق کا جو پہلا اجلاس دیکھا وہ ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے سامنے شیر محمد اختر کے مکان کے ایک کمرے میں منعقد ہوا تھا۔ مولانا اس کے صدر تھے۔

حلقہ ارباب ذوق لاہور میں بہت جلد مقبول ہو گیا۔ خصوصاً ان لوگوں کے لئے اس میں کشش زیادہ تھی۔ جو یا تو نئے لکھنے والے تھے یا ترقی پسند تحریک سے اتفاق نہ رکھتے تھے —— انھوں نے حلقہ کو ایک طرح سے کوئی سیاسی پلیٹ فارم سمجھا مگر یہاں آکر ان پر کھلا کہ ترقی پسندوں اور حلقے کے ادیبوں میں وہ تضاد نہیں جو دین اور لادینی میں ہوتا ہے —— یہ لوگ بہت مایوس ہوئے۔ پھر انھوں نے اس پر چھا جانے کی کوشش کی اور حلقے کے اصل شاعروں کو بھی بے دین اور سوشلسٹ کہنا شروع کیا۔ ان لوگوں میں پیش پیش آغا بیدار بخت اور شورش کاشمیری تھے —— جب ناکامی ہوئی تو انھوں نے اپنا ایک حلقہ بنا لیا۔ جس کا نام حلقہ ارباب علم رکھا —— اب حلقہ ارباب ذوق وائی ایم سی اے کی عمارت میں منتقل ہو چکا تھا۔ اوپر کی منزل میں ہال کے عقب بورڈ روم میں جلسے منعقد ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے نچلی منزل میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ اجلاس کا وقت بھی ایک ہوتا تھا۔ ایک عجب تناؤ رہتا تھا۔ دونوں حلقوں کے حواریوں میں —— شورش کشمیری بھی اس زمانے میں مولانا کی شاگردی کا دم بھرتے تھے اور آغا بیدار بخت بھی ان کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ انھوں نے مولانا کو کسی نہ کسی طرح اپنی طرف کھینچ لیا۔ اب مولانا مع مولانا علم الدین سالک کے حلقہ ارباب علم سے منسلک ہو گئے تھے اور حلقہ ارباب ذوق سے ایک طرح سے کنارہ کش ہو گئے حالانکہ ذہنی طور سے وہ اس محفل میں اجنبی تھے۔ حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ ادیب اور شاعر پاک ٹی ہاؤس کو رونق بخشتے تھے اور حلقہ ارباب علم سے متعلق ادیب چینیز لنچ ہوم میں کہ ٹی ہاؤس سے چند قدم کے فاصلے پر ہے مگر مولانا اور مولانا سالک وضع کے پابند تھے۔ انارکلی کے سرے پر نگینہ بیکری سے ہجرت کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اس زمانے میں کافی ہاؤس میں ادیب کم دانشور اور سیاست داں زیادہ ہوتے تھے۔ ادیبوں میں مولانا چراغ حسن حسرت، باری علیگ اور ساحر لدھیانوی خصوصاً قابل ذکر تھے۔ بعد کے آنے والوں میں ناصر کاظمی اپنی سیمابی طبیعت کے باعث گاہے گاہے ریاض قادر، عبدالمجید بھٹی، حمید نسیم اور محمد خلیل الرحمٰن کے ساتھ پایا جاتا تھا۔

بہرحال مولانا تاجور اس قسم کے گوناگوں مشاغل اور کارناموں سے اپنا سکہ منوانے کی کوشش کرتے رہے۔ تاہم ان کا اصل میدان بزم مشاعرہ ہوتا تھا۔ موخر الذکر دھڑے نے اپنا ایک نام بھی رکھا "زندہ دلان پنجاب" اس نام سے وہ پنجاب کے ادیبوں اور شاعروں کی برتری ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ کہا یہ جاتا تھا، کہ مولانا تاجور صوبائی تعصب کا شکار تھے حالانکہ خود ان کے دھڑے میں کئی کٹر قسم کے پنجابی تھے۔ تاہم یہ بات اس حد تک درست تھی کہ زبان کے معاملہ میں مولانا اپنے آپ کو مستند اور اہل پنجاب کو غیر مستند سمجھتے تھے۔ ورنہ پنجاب سے انھیں بھی اتنی ہی محبت تھی جتنی کسی پنجابی کو ہو سکتی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ میرے خلاف پراپیگنڈہ کرتے ہیں۔ ورنہ میں تو اپنے وطن میں گمنام تھا جو کچھ مجھے ملا ہے وہ پنجاب ہی میں ملا ہے۔ "زندہ دلان پنجاب" میں جو لوگ نمایاں تھے ان میں پطرس بخاری، ڈاکٹر تاثیر، مولانا عبدالمجید سالک، سید امتیاز علی تاج (کہ اصلاً دلی کے رہنے والے تھے اور یہ گھرانا اٹھارہ سو ستاون میں لاہور میں بحیثیت مہاجر آکر آباد ہوا تھا) صوفی تبسم، ابوالاثر حفیظ (موصوف زیادہ عرصہ ساتھ نہ دے سکے کہ خود اپنی ذات کو ایک ادارہ سمجھنے لگے تھے) اور پنڈت ہری چند اختر تھے —— ان دونوں دھڑوں میں سید عابد علی عابد کا نام کہیں نہیں ملتا۔ ان کی دونوں سے آشنائی تھی اور وہ دونوں حلقوں میں بے گانے سے سمجھے جاتے تھے۔ البتہ ڈاکٹر تاثیر سے ان کے ذاتی مراسم دوسروں کی نسبت زیادہ مستحکم تھے۔ ہو سکتا ہے اس کا باعث یہ ہو کہ دونوں صاحب علم تھے۔ ذہین و فطین بھی تھے اور انجمن آرا بھی۔ ڈاکٹر تاثیر نہایت بے قرار طبیعت کے انسان تھے اور بلا کے بذلہ سنج بھی۔ ان میں ... اس

بات یہ تھی کہ وہ کسی کھو کھلے یا نمائشی انسان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ شاہ صاحب کی طرح وہ بھی منہ پھٹ تھے۔ مگر اس کے ساتھ مصلحت اندیش بھی تھے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے تھے جنھیں بعض مصلحتوں کی بنا پر وہ خود بے نقاب کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ اس موقع پر وہ شاہ صاحب کو آگے کر دیتے تھے۔ اس عبارت سے کہ شاہ صاحب کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ تاثیر انھیں استعمال کر رہے ہیں۔ بعد میں جب انھیں اس بات کا احساس ہوتا تو کہتے آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ مگر پھر عین وقت پر جال میں آجاتے ـــــ مگر وہ ڈاکٹر تاثیر سے نہ خفا ہوتے نہ گلہ کرتے بلکہ لغزش پر خود ہنستے ـــــ گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے ایک نہایت نستعلیق قسم کے استاد تھے۔ انھیں اردو شاعری پر آگاہی کی بھی خوش فہمی تھی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ابھی تک ہے۔ نہایت مہذب، کیا باعتبار لباس اور کیا بلحاظ گفتگو۔ وہ کسی بھی محفل میں سب سے شائستہ انسان معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج کی بزم اقبال میں داغ پر ایک مضمون پڑھنے کا اعلان کیا۔ اب داغ تاثیر کی بھی کمزوری تھا اور عابد علی عابد کی بھی ـــــ پطرس بخاری ان دنوں کالج کے پرنسپل تھے۔ انھوں نے غالباً لطف حاصل کرنے کو شہر کے متعدد ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کیا۔ تاثیر اور عابد علی کو خصوصی دعوت دی، زبانی تاکید بھی کی ـــــ مضمون پڑھا گیا۔ پروفیسر صاحب کے شاگرد جن میں مظفر علی سید نمایاں تھے، بڑی تعداد میں جمع تھے جو نہایت خشوع و خضوع سے استفادہ کر رہے تھے۔ دیگر اہل علم بھی پورے انہماک سے توجہ کئے ہوئے تھے ـــــ تاثیر مرحوم بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ غالباً ذہن میں کچھ سوال جمع رہے تھے۔ شاہ صاحب ان کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ ان کے کان میں کھسر پھسر کرتے، شاہ جی مسکراتے ـــــ مضمون پر گفتگو شروع ہوئی، ہر طرف سے داد و تحسین کے ڈونگرے برسنے لگے ـــــ پطرس بخاری کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ تھی۔ تاثیر مرحوم اپنی ناک کو بار بار مروڑ رہے اور بے کل ہوئے جا رہے تھے۔ عابد صاحب نہایت سنجیدہ ہو رہے تھے۔ یہ کیفیت ان کی ہوتی تھی جب ان پر ناگواری سوار ہو جاتی تھی۔ آخر پروفیسر پطرس بخاری نے ڈاکٹر تاثیر کو گفتگو کی دعوت دی۔ انھوں نے نہایت ہوشمندی سے گیند عابد صاحب کی طرف لڑھکا دیا ـــــ عابد صاحب کا بند کھل گیا ـــــ مجلس میں سناٹا تھا ـــــ عابد صاحب گرج رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ پروفیسر صاحب نے داغ کو پڑھا ہی نہیں اور سنی سنائی باتیں مغربی تنقید کی روشنی میں لکھ دی ہیں۔ پروفیسر صاحب غریب کا یہ عالم کہ زمین میں دھنستے ہی چلے جا رہے تھے۔ تاثیر مارے خوشی کے پھٹے جا رہے تھے جب شاہ صاحب کا بارود ختم ہونے لگتا تو وہ چپکے سے اور فراہم کر دیتے ـــــ غرض کہ عجیب صورت حال تھی ـــــ اللہ اللہ کر کے محفل ختم ہوئی ـــــ جب سب لوگ چلے گئے تو پطرس بخاری اور ڈاکٹر تاثیر نے شاہ صاحب کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملادئے۔

گھر جاتے ہوئے عابد صاحب کو راستہ میں احساس ہوا کہ آج تاثیر کے ساتھ پطرس بخاری بھی انھیں استعمال کر گئے۔ اس احساس سے کچھ ملول ہوئے، کہنے لگے۔ "یار بری بات ہوگئی ـــــ غریب ہستی کا اس قدر کڑا احتساب نہیں ہونا چاہیے" ـــــ یہی رویہ اورنٹیل کالج کے علماء کے بارے میں رہا۔ اس کالج کے اساتذہ سب کے سب بڑے نامی گرامی تھے۔ مگر شاہ صاحب انھیں خاطر میں نہ لاتے تھے ـــــ کہا کرتے تھے کہ جس کے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا لفظ لکھا ہوا دیکھو، سمجھ لو کہ جاہل ہے سوائے تاثیر کے" ـــــ یہ تو اس زمانے کی بات ہے اگر آج شاہ جی ہوتے اور اورنٹیل کالج کو دیکھتے تو یقیناً یا اپنا سر پھوڑ لیتے یا ان کا۔ البتہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے لئے ان کے دل میں ایک نرم گوشہ تھا۔ اس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ عبادت صاحب میں انکساری ہے، وہ حفظ مراتب کی قدروں سے آراستہ ہیں اور عابد صاحب سے طالب علمانہ اور نیازمندانہ ملتے تھے۔ دوسرے سجاد باقر، وہ تو یوں بھی بے چارہ بڑا ہی غریب سا مسکین سا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی ان کے شاگرد تھے۔ مگر جب کوئی کہتا کہ "شاہ جی، وہ آپ کے ایک شاگرد ہیں نا ڈاکٹر وحید قریشی ـــــ تو وہیں بات کاٹ دیتے، خفا ہو جاتے، کہتے "اسے میں اپنا شاگرد ماننے سے انکار کرتا ہوں ـــــ وہ ڈاکٹر عبداللہ کا شاگرد ہے۔"

شاعری ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ کوئی بھی عالم ہو، کوئی بھی جگہ ہو شاعری ان کے ساتھ یوں رہتی کہ اگر مادی چیز ہوتی

ہ کہنا جیسے ان کا سایہ ہو یا یہ اس کے سایہ ہوں یا یہ ان کی ہمزاد تھی یا یہ اس کے ہمزاد تھے۔ شعر سننے کا بھی شوق تھا، سنانے کا بھی۔ جس جذب کی حالت میں سنتے سناتے تھے اسی محویت کے عالم میں تھے۔ سڑک پر جا رہے ہیں، بھیڑ بے تحاشا ہے۔ شاہ جی کو اچانک کوئی یاد آ جائے گا اور وہ بھول جائیں گے کہ وہ کہاں ہیں اور جھوم جھوم کر شعر سنانے لگیں گے۔ پھر اس شعر پر اکتفا نہیں کریں گے، اس کے ساتھ جتنے شعر مختلف شاعروں کے کوئی قدیم کوئی جدید انھیں یاد ہوں گے سناتے چلے جائیں گے یا پھر اس کے فنی محاسن پر گفتگو شروع کر دیں گے یا پھر چلتے رک جائیں گے اور فرمائش کریں گے "کوئی شعر سناؤ۔" اب ہر ایک کا ذہن تو ایسا رسا نہیں ہو سکتا جیسا ان کا تھا، پھر مذاق اڑانے یار کیسے شاعر ہو تم کہ تمھیں شعر یاد کرنا پڑتا ہے۔" میرا معاملہ تو بہت ہی دردناک ہوتا تھا۔ اس لیے کہ مجھے تو اپنا بھی شعر بہت ہی مشکل سے ہتا ہے ————

مشاعرے کا انھیں بہت شوق تھا۔ مشاعرے میں بڑے اہتمام سے شرکت کرتے تھے اور شاید ہی کسی کی دعوت کو مسترد کرتے تھے۔ مشاعرہ ہماک سے سنتے۔ میں نے انھیں دیکھا شاید ہی کسی کو دیکھا ہوگا۔ انھیں اس سے غرض نہیں ہوتی تھی کہ شاعر استاد ہے یا مبتدی —— انھیں صرف ے مطلب ہوتا تھا کہ شعر کیا ہے۔ اگر شعر ان کے مطابق نہیں ہوتا تو اس کو خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے سنتے رہتے تھے۔ نہ بدمزگی کا اظہار تھے نہ یہ ظاہر ہونے دیتے تھے کہ وہ اس شاعر کو ناپسند کر رہے ہیں۔ مگر جب شعر پسند خاطر ہوتا تھا تو پھر وہ بھول جاتے تھے کہ شاعر سے کوئی ذاتی رنجش بھی ہے۔ بس آپے سے باہر ہو جاتے تھے "آہا آہا واہ، کیا کہنے ہیں۔ پھر پڑھو۔ دوبارہ پڑھو"—— اور اگر کوئی ہی تیز شعر ہوتا تو میں نے کئی بار انھیں بیٹھے بیٹھے زانوؤں پر ہاتھ مارتے بلکہ گھٹنوں کے بل کھڑے ہو ہو کر "ہائے، کیا بات کہی، کبھی کبھی اس کے کسی چھپے ہوئے ہنر کا اعلان بھی کر دیتے تھے —— یہ صورت حال خود اپنے شعروں پر بھی ہوتی تھی۔ وہ خود جب شعر تھے تو چہرے پر ایک قسم کی خوشی اور کھلی ہوئی مسکراہٹ صاف محسوس ہوتی تھی۔ خوبصورت آدمی تھے اور بھی خوبصورت ہو جاتے تھے۔ ان کی آواز ـ خاص قسم کی نسوانیت تھی جو نہایت دل کش ہوتی تھی۔ جھوم جھوم کر حاضر شعرا میں سے کبھی کسی کو کبھی کسی کو مخاطب کرتے رہتے تھے۔ جو دکو پسند ہوتا تھا اس کی داد سامعین کے ساتھ مل کر خود بھی دیتے تھے۔ جب سامعین کہتے "واہ" تو خود بھی ان کی آواز میں آواز ہتے "واہ"—— اساتذہ یا پرانے شاعر تو خیر داد و بے داد کے عادی ہو ہی جاتے ہیں۔ مبتدیوں کا مسئلہ کچھ مختلف ہوتا ہے کہ عام طور سے پرانے اساتذہ گھاس نہیں ڈالتے۔ مگر شاہ جی کا یہ طریقہ تھا کہ جس طرح وہ کسی نامی گرامی شاعر کو داد دیتے اسی طرح بالکل نوآموز کو —— میں اپنے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ البتہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسلامیہ کالج کے جس مشاعرے کا ذکر میں نے نگو میں پہلے کہیں کیا ہے اس میں ناصر کاظمی کو عابد صاحب نے پہلی مرتبہ سنا تھا۔ وہ سال دوم کا طالب علم تھا۔ اس نے اپنی وہ پڑھی جو بعد میں بہت مشہور ہوئی۔ اس غزل کا یہ شعر جب اس نے پڑھا تھا تو شاہ صاحب نے بے اختیار باآواز بلند اتنی داد دی تھی زین محفل شاعر کے علاوہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

اے دوست ہم نے ترک تعلق کے باوجود   محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

سے کے بعد دیر تک ان پر ایک ایسا سرور طاری رہتا تھا گویا کسی مے خانے سے لوٹے ہوں۔ انھیں کئی اچھے اچھے شعر یاد ہو جاتے تھے جنھیں ستہ بھر اور بعد میں گھر پہنچ کر اپنے ساتھ لوٹنے والے کو نہ صرف سناتے تھے بلکہ ان کے بعض محاسن کا تجزیہ بھی کرتے تھے اور موقع ملتا تو سندیدہ غزل کی زمین میں غزل کہتے۔ اس معاملے میں نہ دوست دشمن کی تمیز کرتے، نہ بڑے چھوٹے پر دھیان دیتے —— مجھے بھی یہ فخر نھوں نے غزل سنی، اچھی لگی تو دوسرے دن اس زمین میں غزل کہہ کر لائے اور مجھے خاص طور پر یاد کیا اور پھر غزل سنائی۔ بعض اوقات معاملے میں اتنا آگے نکل جاتے تھے کہ دوسرا عرق عرق ہو جاتا تھا۔ ایک مشاعرے میں' میں نے غزل پڑھی۔

مطرب نے ایسی دھن میں الاپی مری غزل　　ہر گوشۂ خیال میں لَو دے اٹھے کنول

شاہ جی نے بے تحاشا داد دی، بہت پیار کیا۔ اگلے دن خود غزل کہہ کر سنائی، آخر میں کہا "مگر یار، تیرے مطلع اور اس شعر کا جواب نہیں ہو گا۔

وہ خوابِ نیم لحظہ، یہ بیداریٔ دوام　　قربت کی ساری عمر، جدائی کا ایک پل

ذہنی طور پر لکھنؤ کے دبستانِ شعر سے تعلق رکھتے تھے۔ لکھنؤ کا کوئی شاعر ایسا ہو گا جس میں انھیں عیب ہی عیب نظر آتے ہوں۔ گمنام سے گمنام، بدنام سے بدنام شاعر ان کے لئے کوئی نہ کوئی خیر کا پہلو ضرور رکھتا تھا۔ وہ اپنے ہم نشینوں، ارادت مندوں اور شاگردوں کو ہمیشہ تاکید کیا کرتے تھے کہ اگر فنِ شعر سیکھنا ہے تو لکھنؤ کو پڑھو۔ ہم لوگوں کو نہ امانت پسند آتا تھا نہ خواجہ وزیر، نہ رند نہ صبا، نہ امیر مینائی نہ دل لکھنوی۔ مگر شاہ جی ان میں سے کسی کی گستاخی پسند نہیں کرتے تھے —— وہ کہا کرتے تھے "کیا تم میر یا غالب غالب لگائے رکھتے ہو۔ کیا سب کچھ صرف یہی دو شاعر ہیں —— پھر یہ لوگ کسی کو کب راہ دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ کسی کو راہ دکھاتے بھی نہیں، دیوار بن جاتے ہیں۔" انھیں اپنے بہت سے معاصر پسند تھے۔ اصغر، جگر، فانی، آرزو، یگانہ —— غرض یہ کہ ان کے نزدیک مخلوق میں اگر کوئی طبقہ ایسا ہے جس کا احترام کیا جانا کسی بھی متوازن انسان کے لئے لازم ہے تو وہ شاعر ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ خود انھیں بہت سے شاعر عالم فاضل ضرور تسلیم کرتے تھے۔ مگر شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ یہ بات یہ لوگ ان کی عدم موجودگی میں عام طور سے کہا کرتے تھے، بعض انھیں لکھنؤ کے آخری دور سے وابستہ شاعر کہہ کر مسترد کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بعض اپنی دانست میں انصاف پسند ہوتے تھے۔ انھیں بیسویں صدی کا نواب مصطفٰی خاں شیفتہ کہا کرتے تھے۔ میں ایسے کئی حضرات کو جانتا ہوں جنھوں نے شاہ صاحب کی جوتیوں میں بیٹھ کر مصرع سیدھا کرنا سیکھا۔ ان کے روبرو ان کی مدح سرائی میں زمین آسمان کے قلابے ملائے مگر ان کی غیبت میں کہتے "عابد علی نقاد ہے۔ شاعر ذرا نرم ہی ہے۔" اور ان کے مرنے کے بعد ان کا نام شاعروں کی فہرست میں شامل کرتے ہچکچاتے ہیں۔ نصابی کتب میں ان کی غزلوں کی شمولیت پر معترض ہوتے ہیں —— مگر یہ تو اپنا اپنا مقام ہے۔ میں کیوں کسی کے چہرے سے پردہ اٹھاؤں اور کیوں معترض ہوں۔ عابد علی کا اپنا مرتبہ تھا۔ احسان فراموشی کی اپنی حیثیت ہے —— مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہ شعر کا عاشق تھا اور عاشق کے مقام کو عشق فروش یا ہوس کار کیا جان سکتا ہے —— دراصل وہ شاگردوں اور دوستوں کے معاملے میں بہت ہی بدنصیب انسان تھے —— وہ اس دور کے انسان نہیں تھے۔ انھیں ایک صدی پہلے پیدا ہونا چاہئیے تھا۔ اول تو کسی کو شاگرد کہتے ہی نہیں تھے۔ مگر جب، کسی کو شاگرد کہہ دیا کرتے تھے تو پھر اس کا احترام بھی کرتے تھے۔ انھیں معلوم ہوتا تھا، انھیں خبر ہو جایا کرتی تھی کہ فلاں شخص جسے وہ شاگرد عزیز سمجھتے رہے ہیں وہ ان سے واقعی کتنی محبت رکھتا ہے۔ اور ان کے بارے میں کیا رائے دے رہا ہے مگر ان کی زبان سے کبھی کوئی گلہ یا شکایت نہیں نکلتی تھی بلکہ جب وہ آجاتا یا آمنا سامنا ہو جاتا تو اس طرح ملتے جس طرح کسی عزیز شاگرد سے ملا جاتا ہے۔ یہ ظرف بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے۔ کم از کم مجھ میں نہیں ہے —— بعض ایسے خوش نصیب بھی تھے جنھوں نے ان کے تاریک دور میں انھیں اذیت پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی —— دراصل شاہ جی کی فطرت میں حسن پرستی تھی۔ وہ بلا کے حسن پرست تھے اور یہ بات ممکن نہیں کہ جو شخص اس فطرتِ سلیمہ کا حامل ہو وہ بغض و کینہ کی طرف کبھی میلان رکھے۔

شاعری کو عبادت جانتے تھے اور دنیا کا نازک ترین اور دشوار ترین فن سمجھتے تھے۔ اس شوق و جستجو میں انھوں نے زندہ زبانوں کو کھنگالا۔ اپنے اس عمل میں ہوتے ہوتے وہ اردو کے چند گنے چنے نقادوں میں شمار ہونے لگے۔ ان کی تنقیدی صلاحیتوں کے سوائے چند محروم ازل قسم کے لوگوں کے کوئی منکر نہیں رہا —— یوں انھوں نے ڈرامے، ریڈیائی فیچر اور کہانیاں بھی بے شمار لکھیں اور بڑی داد پائی۔ ترجمہ کرنے میں مولانا ظفر علی خاں کے بعد پنجاب میں ان سا ماہر کوئی دوسرا نہیں۔ یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ ایک دفعہ حکیم احمد شجاع نے کہا تھا کہ "عابد علی کی دو صلاحیتوں سے کوئی جاہل مطلق انسان ہی انکار کر سکتا ہے تنقید شعر اور ترجمہ۔" حصولِ علم کا یہ عالم تھا کہ وہ کمرہ

ے وہ اپنے گھر میں اپنے لئے مخصوص کر لیا کرتے تھے۔ اس میں سوائے کتابوں کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ بستر پر بھی کتابیں پڑی رہتی تھیں۔
رقت مطالعہ، گھر میں، گھر سے باہر، راہ چلتے —— میں نے کئی مرتبہ دیکھا کہ فٹ پاتھ پر چلے جا رہے ہیں اور کتاب پڑھ رہے ہیں۔ بارہا
وکر کھا کر گر پڑے مگر اپنی اس عادت سے باز نہیں آئے۔ جب کوئی ہمدردی کے طور پر کہتا، شاہ جی شہر میں آمد و رفت بہت بڑھ گئی ہے۔
تے غیر محفوظ ہو گئے ہیں، تو جواب دیتے "پھر کیا کیا جائے، راستہ بھی تو طے کرنا ہوتا ہے، کتاب نہ دیکھوں تو مکروہ چہرے دیکھنے پڑتے ہیں" کہا
ا "جناب، لاہور میں مکروہ چہروں کا کیا کام، ایک سے ایک گلاب کھلا ہوا ہے" کہتے "اول تو یہ محض خیالی اور رومانی باتیں ہیں، دوسرے
ا اگر کوئی واقعی اچھا چہرہ نظر آ جائے جب تو راستہ مزید سنگین ہو جائے گا۔ پھر تو چلنے کی بھی سکت نہیں رہے گی۔ جان کو روگ الگ لگ
ئے گا" —— مگر اس سب کے باوجود ان کا اپنا صرف ایک شوق تھا شعر اور شاعر۔ شعر سن کر جتنا خوش ہوتے تھے اتنا ہی
اعر سے مل کر خوش ہوتے تھے۔ یوں تو انھوں نے کبھی شاعر کی بحیثیت شاعر برائی نہیں کی البتہ بعض شاعر شخصی حیثیت میں انھیں سخت
پسند تھے۔ یوں لاہور کے شاعروں میں سے بعض انھیں خصوصاً عزیز تھے۔ مثلاً اپنے ہم عصروں میں سے فیض احمد فیض کہ شاعر بھی پسند تھے
آدمی بھی۔ اس طرح خوردوں میں سے سیف الدین سیف، یوسف ظفر، مختار صدیقی، قیوم نظر اور ناصر کاظمی اچھے لگتے تھے۔ احمد ندیم
می اور قتیل شفائی کا ذکر بھی پیار سے کرتے تھے۔ صوفی تبسم کے بارے میں کہا کرتے تھے "صوفی کو فارسی کہنی چاہئے" ابوالاثر حفیظ نہ
ثیت شاعر ان کے مطلب کے تھے نہ بحیثیت آدمی۔ اپنے زمانے کے غزل گو شاعروں میں سے فراق گورکھپوری اور یگانہ چنگیزی کے بڑے
اح تھے۔ فانی، جگر اور آرزو لکھنوی کا بھی احترام سے نام لیتے تھے۔

ادب کے علاوہ موسیقی سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ کلاسیکی موسیقی کے سخت رسیا تھے۔ نہایت ذوق و شوق سے سنتے تھے اور
یت برمحل اور برجستہ داد دیتے تھے۔ شاعری کی طرح موسیقی کے فن کے بڑے بڑے ماہر دنگ رہ جاتے تھے۔ خود ایک لے نہیں نکال
تے۔ نہایت بے سری اور بے رس آواز تھی۔ حیرت ہوتی تھی کہ گفتگو کے دوران آواز میں جو دلکشی ہوتی تھی وہ اس عالم میں کہاں غائب
جاتی تھی —— تاہم موسیقی ان کا بنیادی شوق نہیں تھا۔ شاید اس لئے کہ خود گا نہیں سکتے تھے۔ مصوری سے انھیں لگاؤ تو تھا، تصویریں
ادیکھتے تھے۔ اس فن پر گفتگو بھی جامع و مانع کرتے تھے۔ مگر پھر بھی ان کی دلچسپی کا حاصل سامان یہاں بھی نہیں تھا۔ کرکٹ سے بھی بڑا لگاؤ تھا
ن زمانے میں خود بھی کھیلتے تھے۔ دنیا بھر کے کرکٹ کے کھلاڑیوں کا تذکرہ ان سے سننے میں آتا تھا۔ جب کوئی میچ ہوتا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر
لٹ کے میدان کا رخ کرتے اور سارا وقت وہیں بیٹھے رہتے۔ دوستوں اور شاگردوں کو ساتھ لے کر جاتے، کھانا چائے وغیرہ بھی ساتھ
ا، اور بالکل بچوں کی طرح شور مچا مچا کر میچ دیکھتے تھے۔ بعد میں ریڈیو پر تبصرے کا رواج ہوا تو کالج سے چھٹی کر لیتے اور دن بھر اس
گم رہتے۔

مگر یار و دنیا بڑی ہی کمینی جگہ ہے —— کم از کم یہ معاشرہ جس میں، میں تم سانس لے رہے ہیں، انتہائی سنگدل، فن دشمن اور
ان کش معاشرہ ہے۔ یہاں کسی ایسے آدمی کو پنپنے کا موقع نہیں دیا جاتا جس میں کوئی صلاحیت ہو اور وہ اپنی صلاحیت کو بروئے کار
للانے کا سودا رکھتا ہو۔ یہاں تو موقع پرستوں، نمائش پسندوں، خوشامدیوں اور چاپلوسی میں مہارت رکھنے والوں کے سر پر تاج سجایا
اہے۔ اور جس کے سر میں کچھ کرنے کا جنون ہو اسے کچل دینا عین ثواب ہوتا ہے۔ سید عابد علی عابد اپنے زمانے کا بے مثال معلم، شاعر،
ر گر، نقاد، نقاد گر، محقق، محقق ساز، ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، مترجم، مصوری اور موسیقی کا شیدائی اور نقاد —— جب
ی اعتبار سے ایسے مقام پر آیا کہ اسے اور اس کے بال بچوں کو ذرا اطمینان نصیب ہونے لگا تو وہی لوگ جو اس کے احسانوں تلے
ے ہوئے تھے، جنھیں اس نے ہر طرح نوازا تھا، افعی بن گئے اژدھے بن گئے —— پاکستان بننے پر دیال سنگھ کالج اور دیال سنگھ

ٹرسٹ ان کے سپرد کر دیا گیا۔ انھوں نے خود ٹرسٹیوں کی ایک کمیٹی ترتیب دی۔ شیخ عبدالحق کہ ایک معنف تھے، کو ٹرسٹ کا چیرمین بنایا اور ایک ایسے شخص کو جو صرف بی اے پاس تھا اور متعدد بار انگریزی ایم اے کا امتحان دیتا تھا اور ناکام ہو جاتا تھا مگر دن رات پرنسپل عابد علی کی جوتیاں سیدھی کرتا رہتا تھا اور جسے بدلے میں پرنسپل عابد علی نے دیال سنگھ کالج میں لیکچرار لگا لیا تھا، اور یونیورسٹی سے خصوصی اجازت حاصل کی تھی اس شرط پر کہ ایم اے کرے گا۔ مگر جب وہ کسی طرح ایم اے نہ کر سکا تو ٹرسٹ کا سکریٹری نامزد کر دیا ——— ادھر کالج میں چودہ اگست انیس سو سینتالیس کو ان کے علاوہ صرف دو اور استاد تھے۔ سارا عملہ خود پرنسپل عابد علی نے بھرتی کیا۔ اس عملہ میں سے چند شروع شروع میں تو ممنونیت کا اظہار کرتے رہے مگر پھر بعض سازشی فطرت کے لوگوں کے باعث اندر ہی اندر بغیر کسی وجہ کے ایک محاذ بنا لیا ——— مجھے یہ بات کہتے ہوئے بڑا ہی دکھ اور افسوس ہے کہ ان میں ایک ایسا شاعر بھی تھا جس کی عابد علی نے ہمیشہ دلجوئی کی۔ اس کی زیادتیوں سے درگزر کیا، جسے ہر طرح کا اطمینان فراہم کرنے کی کوشش کی۔ مگر عابد علی کے خلاف سب سے زیادہ سرگرمی اسی نے دکھائی ——— ادھر ٹرسٹ کا نیا سکریٹری جو ایک ناکام طالب علم اور ناکام لیکچرار تھا اپنی بدسرشتی کو زیادہ دیر نہ دبا سکا۔ شیخ عبدالحق کو بھڑکا کر عابد علی کے درپئے آزار ہوا، اور طرح طرح سے پریشان کرنا شروع کیا۔ احتساب کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ تمام لوگ عابد علی ہی کی وجہ سے اس مقام پر متمکن تھے۔ چیرمین، سکریٹری اور بعض بدفطرت اساتذہ عابد علی کو وہاں مارنا چاہتے تھے جہاں پانی نہ ملے۔ یقیناً یہ ہماری قومی روایت ہے، محنت کش ——— کالج سے باہر دیال سنگھ ٹرسٹ، کالج کے اندر استادوں کی ایک جماعت ——— یہ دونوں گروہ اکثر و بیشتر صلاح مشورے سے بھی کام لیتے تھے اور متحدہ محاذ قائم کر رکھا تھا۔ بظاہر کھیل صرف اتنا تھا کہ یا تو عابد علی کالج چھوڑ جائے یا واپس اپنی پرانی اسامی پر آ جائے یا پھر ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دے۔ عابد علی سید زادہ تھا۔ وہ کسی کے سامنے جھکنے کو تیار نہ تھا۔ وہ ٹوٹ گیا مگر اس میں لچک پیدا نہیں ہوئی ——— مقدمے قائم ہو گئے، ایک نہیں کئی کئی۔ وہ عابد علی جسے ہر وقت ادب کی دھن سمائی رہتی تھی۔ جس کے ارد گرد ادیب اور شاعر رہتے تھے اب ہر وقت قانونی موشگافیوں میں الجھا رہتا۔ ہر شام وکیل اس کی صحبت میں رہتے ———

کہتے ہیں کہ جب برے دن آتے ہیں تو انسان سے ایسے ایسے کام سرانجام ہوتے ہیں جنھیں وہ بھلے دنوں میں حماقت سمجھتا ہے۔ شاہ جی کے بارے میں حسن پرستی کی داستانیں عام تھیں۔ حالانکہ ان میں سے بیشتر من گھڑت ہوتی تھیں۔ اور یہ کہانیاں بعض اوقات خود ان کی اپنی ساختہ ہوتی تھیں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ان کی ساری عشق پیشگی یا تو نظر تک محدود تھی یا باتوں تک ——— مگر ایسا ہوا کہ ایک خاتون واقعی ان کی زندگی میں درانہ داخل ہو گئیں۔ اور یوں کہ انھیں اپنی چھ پیاری پیاری بچیاں، منتوں مرادوں کا اکلوتا بیٹا (منوچہر کہ منو شاہ کہلاتا ہے) اور کڑے زمانے کی رفیق بیوی سب بھول گئے۔ گھر میں جھگڑے پھیل گئے۔ نتیجے کے طور پر بسا بسایا گھر اجڑ گیا۔ بیگم بلقیس عابد علی روٹھ گئیں۔ وہ اپنے بچوں کو لے کر اپنے بھائی سید سجاد کے گھر گجرات چلی گئیں۔ خانہ خالی را دیو می گیرد ——— نکاح پڑھایا گیا اور ایک نئی بیگم محمودہ عابد علی بن کر گھر والی بن گئیں۔ کہیں پڑھاتی تھیں ——— بظاہر شاہ جی اس نئی زندگی سے مطمئن سے نظر آتے تھے۔ دل کا حال خدا جانے ——— کچھ عرصہ یہ کھیل کھیلا جاتا رہا کہ متحدہ محاذ نے اپنی ریشہ دوانیاں گھر تک پھیلا دیں۔ نامعلوم وجوہ کی بنا پر گھر میں فساد شروع ہوا۔ چنگاری زبردست تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شعلے بھڑکنے لگے۔ محمودہ عابد علی اپنے اصل گھر واپس چلی گئیں۔ اگر بات یہیں تک رہ جاتی تو بھی خیر تھی مگر شر پسندوں نے محترم خاتون کو مزید ورغلانا شروع کیا اور ایک اور مقدمہ دائر ہو گیا ——— پروفیسر سید عابد علی عابد ایک ایک دن میں تین تین، چار چار عدالتوں میں پیشیاں بھگتنے پر مجبور ہو گیا ——— محفل محفل چرچے پھیل گئے۔ بعض لوگ یوں ناک بھوں چڑھاتے گویا یہ براہ راست متاثر ہو رہے ہیں۔ بعض لوگ یوں کنی کتراتے لگے گویا ان کے دامن پاک ہیں۔ ان میں شاگرد بھی تھے اور وہ بھی جو ان کی گاتے تھے۔ شاگردوں میں ایک سجاد رضوی نے کمال وفاداری کا ثبوت دیا اور نہایت استقامت کے ساتھ حق شاگردی ادا کیا۔

ایک دن اطلاع ملی کہ شاہ صاحب کو دل کا دورہ پڑ گیا ـــــ اس تاریک زمانے میں بھی جو چند لوگ آپ سے ارادت رکھتے تھے، پریشان ہو گئے ـــــ سیدھے ان کے گھر گئے۔ دیکھا تو شاہ صاحب ہر چند بستر پر دراز ہیں، سخت نڈھال ہیں مگر دیکھتے ہی مسکرا دیئے ـــــ خیریت معلوم کرنے پر خفیف سی آواز میں جواب دیا "کوئی بات نہیں، ابھی نہیں مروں گا۔ ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے" بہت دنوں صاحب فراش رہے ـــــ لوگوں کو چین نہیں آیا ـــــ عابد علی شاعر تھا، اس قسم کے دنیاوی معاملات کی تاب کب تک لا سکتا تھا ـــــ تھک گیا ـــــ حریف مزید طاقت پکڑ گئے ـــــ محمودہ عابد علی کہ عابد علی کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کرتی تھیں اور جنھوں نے سات بچوں کے باپ سے شادی کرنے میں کسی قسم کی گھبراہٹ محسوس نہیں کی تھی، اغیار کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ لوگوں نے محسوس کیا کہ پروفیسر عابد علی مقدمہ ہار جائیں گے اور عدالت کی طرف سے ان کی قرقی کے احکام نافذ ہو جائیں گے۔ یہ صورت حال سید عابد علی عابد کے لئے انتہائی نازک تھی۔ اس کا تو انھوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا ـــــ حالات ناگفتہ بہ ہو گئے تھے۔ دل کے دوروں کا وقفہ کم سے کم تر ہوتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر حیران تھے کہ یہ شخص زندہ کیونکر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مضبوط سے مضبوط تر انسان عموماً تیسرا حملہ برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر سید صاحب کو یقین تھا کہ ابھی موت انھیں شکست نہیں دے سکتی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے ابھی نہیں ابھی تو بڑے معرکے باقی ہیں ـــــ ادھر معلوم نہیں ان کی اصل رفیقہ حیات بیگم بلقیس عابد علی، جنھیں ہم سب آپا جی کہتے تھے، اپنے آپ کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ ممکن ہے کہ بچوں کی طرف سے حالات کا دباؤ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ ٹھہر نہ سکیں۔ ایک دن جو میں گیا تو استاد کے گھر میں چہل پہل پھر لوٹ آئی تھی۔ حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ آپا جی ڈیوڑھی میں ملیں، سلام کیا۔ انھوں نے اپنی روایتی شفقت سے جواب دیا۔ اس کے بعد کچھ میں جرأت نہ تھی کہ میں کوئی سوال کروں۔ نہ انھوں نے کوئی ضرورت محسوس کی۔ میں اندر گیا۔ شاہ جی حسب دستور مسہری پر نیم دراز حالت میں کتاب لئے بیٹھے تھے۔ مبارکباد دی، ہنس دیئے۔ کہنے لگے "دتس لوک پریشان ساد میں نوں تے پتا سی بہو جی (وہ اپنی ان بیگم کو بہو جی کہا کرتے تھے اور جانے والی کو ڈارلنگ) نے کتھے جانا اے (تم لوگ پریشان تھے۔ مجھے تو یہ پتہ تھا کہ بہو جی کہاں جائیں گی) پھر اپنے مقدمے کے بارے میں قیاسات کا ذکر کرنے لگے، کہنے لگے "میرے پاس ہے کیا سوائے کتابوں کے۔ بس اس طرف سے ذرا تشویش ہے۔" وہ یہ باتیں یوں کہہ رہے تھے جیسے کوئی اہمیت نہ ہو۔ مگر ان کے دل پر کیا گزر رہی تھی اس کا اندازہ کون لگا سکتا تھا۔ اس لئے کہ واقعی ان کی زندگی کی متاع بے بہا وہ عظیم ذخیرہ کتب تھا جسے انھوں نے معلوم نہیں کہ کس طرح جمع کیا تھا۔ وہ عمر بھر کرائے کے مکان میں رہے مگر کتابیں جمع کرنے کا شوق کسی حالت میں کم نہ ہوا۔

دوسرے یا تیسرے دن رات گئے وہ اور آپا جی میرے گھر بجویری محلے میں آئے اور بتایا کہ خبر یہ ہے کہ کل قرقی کا حکم جاری ہو جائے گا کسی نہ کسی طرح آج ہی میری لائبریری اپنے گھر منتقل کر لو۔" مختار نے یہ کام غیر متوقع طور پر راتوں رات سرانجام دیا۔ مگر آئی بلا ٹل گئی اور خدشات وہم ثابت ہوئے ـــــ اب شاہ صاحب کی زندگی اپنے اصل انداز میں بسر ہو رہی تھی مگر گھر کی حد تک۔ انھیں اپنے بچوں سے بہت پیار تھا، خصوصاً اپنی ایک بیٹی نزہت انھیں بہت پیاری تھی اور منو شاہ تو ان کی جان تھا۔ مگر عجیب شخص تھا کہ صندل کی [illegible] ہجر کی کلفتوں کا بیان۔ اس کا سینہ ایک ایسا نہ خانہ تھا جس میں معلوم نہیں کیا کیا چیز سمائی ہوئی تھی۔ وہ سراپا محبت تھے ان کے دل میں ہر ایک کے لئے محبت تھی، اور اولاد تو اولاد ہی ہوتی ہے۔ مگر اظہار کا طریقہ نہایت مبہم تھا۔ شاہ صاحب کے گھر میں پھر سے [illegible] نشست جمنے لگی۔ اگرچہ کالج کی زندگی اسی طرح بے چین تھی۔ لیکن یوں معلوم ہو رہا تھا کہ آپا جی کی آمد نے زندگی کو [illegible] میں تقسیم کر دیا ہے ـــــ گاہے گاہے حسب معمول مے نوشی کی محفل بھی جمتی ـــــ ان کے مزاج میں نفاست [illegible] شراب و شعر میں ان کا یہ مذاق بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ وہ بلا نوش نہیں تھے۔ جب تک [illegible] خوبصورت جام اور بہت ہی دلکش صراحی میز پر دھری ہوتی تھی [illegible]

جام بھر کر رکھ لیا۔ ایک دو چسکیاں لیں اور پھر گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ یہ بات میں نے شاہ صاحب میں دیکھی یا صوفی تبسم میں کہ دو چار گھونٹ پی کر دماغ میں گویا بجلی کے ہنڈے روشن ہو جاتے تھے۔ شاہ صاحب کہ شراب پی کر جس قدر خوبصورت اور ذہانت سے معمور گفتگو کرتے تھے، جی چاہتا تھا کہ یہ اسی عالم میں ہر وقت رہیں اور میں بیٹھا سنتا رہوں۔ ایک دریا تھا علم کا جو بڑے جوش و خروش سے رواں ہو جاتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو اس عالم میں دیکھا ہے۔ مگر ان میں سے اکثر تو رہی سہی آگہی بھی ختم کر لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے حسن میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ ان کے گورے رنگ میں سرخی دوڑ جاتی تھی۔ اس طرح آنکھوں میں ہلکے ہلکے ڈورے نمودار ہو جاتے تھے ــــ وہ تنہا شراب نہیں پیتے تھے۔ جب تک ایک دو جلیس نہ ہوں آلاتِ مے کشی الماری میں رہتے تھے۔ میں برسوں ان کی اس قسم کی محفلوں میں شریک رہا مگر انھوں نے کبھی مجھے دعوت نہ دی ــ صرف ایک دفعہ ایسا ہوا کہ پانچ چھ حضرات موجود تھے۔ ان میں قیوم نظر بھی تھا یہ تو یاد نہیں کہ اس بات کا موقع کیونکر پیدا ہوا کہ قیوم نظر نے کہا "شاہ جی! آج اگر شہرت کو پلا دیں تو مان جاؤں" شاہ جی کہنے لگے "قیوم مجھے اعتماد ہے کہ شہرت میرا کہنا نہیں ٹال سکتا۔ تو مجھے دانہ نہ ڈال" قیوم نظر بڑا شرارتی انسان ہے۔ وہ شاہ صاحب کا قریب ترین شاگرد ہے۔ شاہ صاحب اس کی بات عموماً رد نہیں کرتے تھے۔ اس نے پھر چیلنج کیا۔ شاہ صاحب سرور کی کیفیت میں تھے۔ میری طرف مڑے اور کہا "شہرت بخاری لاج رکھنے والی بات ہے" میں قیوم صاحب پر حیران تھا کہ یہ شخص جس نے عمر بھر سگریٹ یا پان تک کو خود ہاتھ نہیں لگایا اور جس نے خود میرے ساتھ ہمیشہ بہی خواہوں والا سلوک رکھا، یہ آج اسے کیا ہو گیا۔ مگر وہ حسبِ عادت قہقہے لگا رہا تھا اور شاہ صاحب کو اکسا رہا تھا ــــ میں نے نہایت عاجزی کے ساتھ انکار کیا۔ اب ان کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا اور میں انکار کرنے کی قوت میں مسلسل کمی محسوس کر رہا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ "اچھا ایک چمچہ پی لے" ــــ یہاں بھی کامیابی نہ ہوئی تو پانی کے جگ میں سے ایک گلاس بھرا کہا "اچھا چل پانی تو پی لے" میں نے گلاس تھاما۔ کہا "ٹھہر جا" یہ کہہ کر ایک چمچہ اس بھرے ہوئے پانی کے گلاس میں ڈال دیا اور کہا "ایک گھونٹ پی لے" میں اب انکار نہ کر سکا اور میں نے ایک گھونٹ پی لیا۔ شاہ صاحب سمجھے، وہ کامیاب ہو گئے، کہا "شاباش" پھر چپ ہو گئے۔ پھر مجھے مخاطب کر کے کہا "میرا خیال ہے تو نے امتحان پاس کر لیا۔ یوں مجھے افسوس ہے کہ میں نے تیرے ساتھ زبردستی کی۔ یہ سب کچھ میری منشا کے خلاف ہوا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تو اس ناہنجار چیز سے محفوظ رہا ہے۔ مجھے یہ بھی خوشی ہے کہ تو اس معاملے میں اپنے ارادے میں مضبوط ہے" خود ان کی قوتِ ارادی اتنی مضبوط تھی کہ جب تائب ہوتے تو ایسے گویا کبھی دیکھی بھی نہ تھی۔

غرض یہ کہ شاہ صاحب کی گھریلو زندگی سکھ چین سے بسر ہو رہی تھی۔ میں اس زمانے میں فارسی ایم اے کر رہا تھا۔ ہمارے ساتھ جو طالبات تھیں ان میں ایک نہایت معمولی ناک نقشے اور سانولی سی طالبہ بھی تھی۔ وہ خاصی سمٹی سمٹائی سی لڑکی تھی۔ چوبیس پچیس برس کی عمر ہو گی۔ سخن کم گو اور کم آمیز ــــ تمام لڑکے لڑکیاں آپس میں باتیں بھی کرتے تھے، ہنستے بولتے بھی تھے مگر وہ الگ الگ سی رہا کرتی ــــ یوں تو ہر طالب علم خواہ لڑکا ہو یا لڑکی لیکچر کے دوران مبہوت سا بیٹھا شاہ صاحب کو تکا کرتا تھا۔ شاہ صاحب میں ایک معشوقیت تھی جو یا تو لیکچر کے دوران ابھرتی تھی یا مے نوشی کے وقت ــــ مگر محبوب پر عجب سی محویت طاری ہو جاتی تھی۔ کچھ مدت کے بعد ہم جماعتوں نے اپنے طور پر محسوس کرنا شروع کیا۔ پھر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ پھر جیسے سب کو یقین آ گیا کہ شاہ صاحب محبوب کی جذباتی زندگی میں ہلچل پیدا کر چکے ہیں۔ لوگوں کے ہاتھ تو شوشہ آنا چاہیے۔ بس پھر رائی کا پہاڑ بن جاتا ہے ــ افواہ پھیلتے پھیلتے خبر بن گئی۔ اول اول غیر مصدقہ ــ پھر اس کی تصدیق ہونی شروع ہو گئی ــــ کسی نے یہ خبر نما افواہ شاہ صاحب کے گھر تک پہنچا دی۔ وہاں پھر آگ سلگنی شروع ہوئی۔ پھر یہ خبریں ملنی شروع ہوئیں کہ ادھر سے الزام لگتے ادھر سے صفائی ہوتی۔ بھلا چاہنے والوں نے آپا جی کو سمجھایا کہ آپ سنجیدہ نہ ہوں ــــ یونہی شرارت کر رہے ہیں لوگ۔ وہ کہتیں، مجھ سے زیادہ عابد شاہ کو کون جانتا ہے۔ اس کی قبر کے پاس سے بھی عورت گزر جائے گی تو یہ زندہ ہو جائے گا۔"

ایک دن یہ اطلاع ملی کہ آج فیصلہ کن جنگ ہو گئی ــــــ شاہ صاحب نے اس افواہ سے برأت کی ہر دلیل دی۔ جب بات نہیں بنی تو اعلان کیا کہ "اب تک تو کچھ نہیں تھا، اب میں اس سے شادی کر کے دکھاؤں گا ــــــ" بس ــ آپا جی تو آگ بگولا ہو گئیں۔ پھر گجرات کے لئے رخت سفر باندھا ــــــ شاہ صاحب کا گھر پھر ڈھنڈار ہو گیا۔ چند ماہ بعد معلوم ہوا کہ محبوب صدیقی، بیگم محبوب عابد علی ہو گئیں ــــــ مجھے اس خبر سے صدمہ سا ہوا۔ حالانکہ میرا اس سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا مگر مجھے شاہ صاحب پر، آپا جی پر اور بچیوں اور بچے پر بڑا ہی ترس آیا۔

پھر دیال سنگھ کالج کا متحدہ محاذ کامیاب ہو گیا۔ پرنسپل سید عابد علی عابد برخواست کر دئے گئے۔ پرنسپل کا مکان بھی خالی کرا لیا گیا ــــــ شاہ صاحب کی زندگی کا اصل زوال شروع ہو گیا ــــــ شاہ صاحب احباب سے دور ہوتے چلے گئے ــــــ پہلے انھیں ایک مکان گلبرگ کے قریب ایک قدیم آبادی میں ملا۔ پھر ساگر روڈ لاہور چھاؤنی میں منتقل ہو گئے۔ بے روزگاری علیحدہ، ترقی اردو بورڈ سے شروع سے کسی نہ کسی حیثیت سے متعلق تھے۔ انھوں نے اس ادارے کی تعمیر میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ مگر لوگ ان سے خوفزدہ رہتے تھے۔ وہ انھیں آگے نہیں آنے دیتے تھے کہ کہیں پیچھے نہ رہ جائیں۔ اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کا یہی بہترین طریقہ ہوتا ہے۔ اب شاہ جی کا صرف یہ کام تھا کہ بورڈ کی انتظامیہ انھیں کوئی کام دے دیتی اور وہ گھر پر ہی اسے کرتے، معاوضہ مل جاتا۔

اب وہی پروفیسر سید عابد علی عابد کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ جس کی موجودگی میں لوگ بات کرتے ہچکچاتے تھے، بجھ کر رہ گیا۔ میں نے شاہ صاحب کو ہمیشہ نہایت خوش لباس پایا اور بہترین سگریٹ یا پائپ استعمال کرتے دیکھا تھا اب وہ قینچی کے سگریٹ پیتے۔ ان کے کپڑے نہ صرف میلے میلے سے رہتے بلکہ میری ان نامراد آنکھوں نے انھیں خستگی کی حالت میں بھی دیکھا ــــــ ایک دن حاضر ہوا تو باتوں باتوں میں کہنے لگے "یار میں نے نہ تیری بیوی کو دیکھا نہ بچے دیکھے۔ کسی دن لے کر آنا ان سب کو" پھر کہنے لگے "ان کی دعوت ہونی چاہئیے اس اتوار کو، دوپہر کو تم سب آنا" اچانک میری نظر جو پڑی تو میں سن سے رہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کا پاجامہ گھٹنے پر سے پھٹا ہوا تھا ــــ اور میں سوچنے لگا۔ کیا گردش ہے جس میں یہ شخص برسوں سے پس رہا ہے مگر حوصلہ نہیں ہارتا ــــــ دیر تک مجھ میں بولنے کی سکت نہ تھی۔ آخر میں نے کہا "شاہ جی، بہو تو آپ کی بیمار ہے۔ البتہ پوتا پوتی کو ضرور لاؤں گا۔ مگر کھانے کے وقت نہیں" اتوار کو میں علی جی اور معصومہ کو لے کر حاضر ہوا۔ یہ دونوں چھوٹے چھوٹے تھے۔ خوش ہوئے۔ اپنے پاس بیٹھا لیا۔ پیار کیا پھر بیگم کو آواز دی "ڈارلنگ ذرا باہر آؤ" وہ آئیں تو بچوں کا

تعارف کرایا، پھر کہا "انھیں چائے پلادو۔" جب وہ چائے کا انتظام کرنے اندر گئیں تو شاہ صاحب خود بھی اٹھ کر اندر چلے گئے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد واپس آئے۔ پانچ پانچ کے دو نوٹ ان کے ہاتھ میں تھے۔ بچوں کو دئے۔ سر پر ہاتھ پھیرا، پھر کہا "آج کل اپنا حال ذرا ایسا ہی ہے۔" وہ یہ کہہ رہے تھے اور جیسے شرما رہے تھے ـــــ میں اپنی جگہ زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ میں نے یہ کیا حماقت کی، بھلا انھیں کیوں لے آیا۔ معلوم نہیں کہاں سے یہ دس روپے لے کر آئے ہیں۔ اس قسم کے وضعدار اور غیرت مند لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے۔ مجھے فخر ہے کہ انھوں نے مجھ جیسے بے حیثیت انسان کو اتنی شفقت دی، اتنا اعتماد دیا کہ سوچتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں۔ مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے میری کسی فرمائش کو رد کیا ہو یا ٹالا ہو۔ دل کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ بستر پر پڑے رہتے تھے۔ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ چلنا پھرنا تو درکنار بیٹھنا بھی نہیں ہے۔ میں نے حلقہ ارباب ذوق کے ایک اجلاس میں ان کی صدارت کا اعلان کیا ہوا تھا۔ ہفتے کی شام حاضر ہوا تو باتوں باتوں میں صدارت کا ذکر آیا تو کہنے لگے "ضرور چلوں گا، ڈاکٹر لوگ تو ڈراتے ہی رہتے ہیں۔ تم ضرور وقت سے گھنٹہ بھر پہلے آجانا۔" اور اس پر اصرار کیا۔ میں دوسرے دن چلا گیا۔ شاہ جی اٹھے، شیروانی پہنی، تانگے پر میرے ساتھ وائی ایم سی اے آئے۔ اوپر کی منزل میں اجلاس تھا۔ کہا "کرسی لاؤ" اس میں بیٹھے کہا "مل جل کر اٹھالو اور مجھے لے چلو۔" واپس بھی کرسی میں بیٹھ کر آئے ـــــ کیا کسی کو ایسا استاد نصیب ہے۔ میں بھی استاد ہوں۔ میں کسی شاگرد کی نازبرداری یوں نہ کروں گا۔

ایک دن گیا تو اکیلے بیٹھے تھے کہا "بروقت آئے ہو۔ میں ہسپتال جانے والا تھا۔ محبوب کی ہاتھ کی انگلی پر کینسر ہو گیا ہے۔ کل اس کا آپریشن ہوگا۔" وہ کچھ پریشان پریشان سے تھے، کہنے لگے "احمق عورت ہے عشق بھی کیا تو کس سے۔ میں بھلا اسے کیا دے سکتا ہوں۔" شاہ صاحب کی ڈارلنگ کی انگلی کاٹ دی گئی۔ یہ موذی مرض کوئی ٹھہر جاتا ہے۔ یہ تو سفر کرتا ہے۔ پھر کہنی تک قطع کر دیا گیا ـــ بازو کٹ گیا ـــــ شاہ صاحب مزید پریشان رہنے لگے۔

ایک دن سہ پہر کے وقت موری اور بھاٹی دروازے کے درمیان فٹ پاتھ پر چلے جا رہے تھے، کتاب ہاتھ میں تھی، مطالعہ جاری تھا۔ میں وہاں سے گزر رہا تھا۔ میں نے دیکھا تو سائیکل سے اتر کر ان سے ملا۔ کہا "پریشان ہوں محبوب کا مرض بڑھتا جا رہا ہے بازو کٹ جانے کا، خیر چھوڑو، آؤ کہیں چائے پئیں۔" بھاٹی دروازے کے باہر ایک چائے خانے میں بیٹھ گئے۔ چائے پی۔ دیر تک پیاری پیاری باتیں کرتے رہے پھر ہسپتال چلے گئے ـــــ کئی ہفتے گزر گئے ـــــ مجھے موقع ہی نہ ملا کہ میں شاہ صاحب کے آستانے پر حاضری کا شرف حاصل کرتا ـــــ ایک دن خواہ مخواہ طبیعت کچھ اداس اداس سی، کچھ اکھڑی اکھڑی سی محسوس ہو رہی تھی۔ کالج کے بعد گھر گیا۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ کھانا کھا کر دھوپ میں لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے غنودگی طاری ہو گئی۔ ہڑبڑا کر آنکھ کھل گئی۔ معلوم ہوا شاہ صاحب نے گلی میں سے آواز دی ہے۔ دوڑ کر دیوار پر گیا۔ نیچے گلی میں جھانکا، کوئی بھی نہیں تھا، سمجھا خواب ہوگا ـــــ پھر لیٹ گیا۔ پھر آنکھ لگ گئی۔ چند منٹ بعد آنکھ کھلی، محسوس ہوا کافور کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ مجھے کافور کی خوشبو سے بہت خوف آتا ہے۔ میں گھبرا گیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اٹھ بیٹھا، نیچے آگیا۔ شام ہوئی ٹی ہاؤس چلا گیا۔ مگر دل پریشان تھا۔ وجہ معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ دوسرے دن دوپہر کو کالج کے لان میں یوسف جمال انصاری مرحوم کے پاس بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ایک طالب علم آیا کہا "سر آپ کے استاد عابد صاحب کا انتقال ہو گیا۔" اس پیغام نے مجھ پر کیسی بجلی گرائی ـــــ میں نے آسمان کیسے گرتا دیکھا اور زمین کو کس طرح شق ہوتا محسوس کیا، اس کے بیان کی تاب اور سکت مجھ میں اب تک نہیں۔ جب میں نے ابا کے بارے میں ایسی خبر سنی تھی تب بھی میری کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ اس کیفیت کو بیان کے مرحلے تک پہنچانے میں مجھے تیس برس سے زیادہ مدت لگی ہے اور اب بھی میں مطمئن نہیں ہوں۔ شاہ جی بھی تو میرے ابا ہی کی طرح تھے۔ انھوں نے ہمیشہ مجھے یہی احساس دلایا۔ وہ میرے دکھ سکھ میں اس طرح شریک رہے جیسے اگر میرے ابا ہوتے تو ہوتے۔

ان کے فیض کے دروازے مجھ پر کبھی بند نہیں ہوئے ۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے حالات اور کچھ اپنی صلاحیت کے باعث میں ان سے وہ کچھ حاصل نہ کر سکا جو مجھے کرنا چاہیئے تھا ـــــ پھر بھی مجھے اتنا یاد ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے میرا دماغ سن سا ہو گیا، میری آنکھیں بے نور ہو گئیں اور میرے کان بند ہو گئے ـــــ انصاری صاحب کی آواز نے گویا مجھے ایک اندھے کنویں سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ وہ کہہ رہے تھے بڑا ظلم ہو گیا ـــــ عابد صاحب کے بعد اب کیا رہ گیا۔ افسوس، ایسے لوگ تو اب پیدا ہی نہیں ہوتے۔ لیکن انسان کیسا بے بس ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے　　　　آج وہ کل ہماری باری ہے

میں نے خبر لانے والے کی طرف دیکھے بغیر اس سے سوال کیا "کیا ہوا تھا شاہ جی کو؟" کہنے لگے انجکشن غلط لگ گیا تھا، زہر پھیل گیا۔ کولھا دیکھتے ہی دیکھتے گویا گل گیا۔ رات آپریشن ہوا دن چڑھے انتقال کر گئے۔

میں لشتم پشتم گھر پہنچا ـــــ ابھی سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ قضا کے ترکش کے تیر کے ایک اور ہدف کی خبر مجھے سنادی گئی۔ رہا سہا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔ نوید میرا بھانجا آیا اور بتایا کہ اس کے چچا اور میری پھوپھی کا چھوٹا بیٹا سعدی وضو کرنے بیٹھا اور وہیں سے آخری سفر کر گیا۔

پھوپھی اماں کے نو بچوں میں سے چار موت کی آغوش سے بچ نکلے تھے۔ ان میں سے ایک سعدی تھا۔ بچپن ہی میں بیمار رہنا شروع ہو گیا تھا۔ اسے کوئی نہ کوئی عارضہ رہتا تھا۔ کسی نے کہا نام بدل دو۔ چنانچہ سید ساجد حسین سے سید سعدی کر دیا گیا مگر یہ تو ایک ٹوٹکا ہوتا ہے علاج تو نہیں۔ وہ کبھی صحت مند ہو جاتا کبھی پھر پڑ جاتا۔ اسی مدوجزر میں اس نے ایم اے کیا، شادی ہوئی۔ دو لڑکے دو لڑکیاں بھی ہوئیں۔ اماں کے بعد میری زندگی کا بیشتر وقت اسی گھر میں بسر ہوتا تھا۔ پھر اسی گھر میں آیا بیا ہی گئیں۔ پھوپھی اماں اور پھوپھا ابا بھی میری ہر ممکن دلجوئی کرتے۔ اگر میں خود ہی اکل کھرا ہوں تو اس میں ان کا کیا قصور۔ تاہم مجھے اس گھر کے لوگ باقی خاندان سے زیادہ عزیز رہے ـــــ سعدی کی اس اچانک خبر نے دیر تک مجھے دہشت زدہ رکھا۔ وہ انتہائی نیک، پرہیز گار، عبادت گزار اور مرنجاں مرنج انسان تھا۔ میرا یقین ہے کہ وہ جیسا معصوم پیدا ہوا تھا ویسا ہی معصوم اٹھ گیا ـــــ ایسے انسان کی موت کسی بھی گھرانے کے زیاں کا باعث ہوتی ہے۔

اب میرے لئے یہ فیصلہ ممکن نہیں تھا کہ میں پہلے کہاں جاؤں۔ شاہ جی کو سلام کرنے کہ سعدی سے ملنے، فرخندہ سے کہا "تم ہی چلی جاؤ، مجھ میں تو ہمت نہیں ہے۔ مجھ سے تو ہلا بھی نہیں جارہا" اس کا کمال یہ ہے کہ یوں تو وہ نری عورت ہے مگر جب کبھی کوئی پریشانی آپڑتی ہے تو مرد بن جاتی ہے ـــــ میری صورت حال اس سے قطعی متضاد ہوتی ہے۔ یوں تو میں ویسے بھی کو نسا ایسا مرد ہوں مگر موت کی خبر تو مجھے عورت سے بھی کئی درجے کمزور بنا دیتی ہے۔ میں جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہوں۔ میں موت سے سخت پریشان رہتا ہوں ــ میرا جی چاہتا ہے کہیں مل جائے تو ہاتھ پاؤں توڑ کر اس کی باچھیں چیر دوں اور آنکھوں میں سلائی پھیر دوں۔ اس نے میرا کلیجہ کتنی بار چبایا ہے۔ اور کس کس طرح مجھے اٹھا اٹھا کر پٹخنیاں دی ہیں۔ میں اس سے ڈرتا نہیں مگر اس کا بدترین دشمن ہوں۔

بہت دیر کے بعد آخر کار فرخندہ کو فاروق گنج پھوپھی اماں کے گھر روانہ کیا اور خود شاہ جی کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ تھوڑی دور چل کر ہمت ہار دی۔ جی نہیں مانتا تھا کہ شاہ جی کے گھر جاؤں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اس صورتِ حال کا مقابلہ کر سکوں کہ میں شاہ جی کے پاس جاؤں اور شاہ جی مسکرا کر میرے سلام کا جواب نہ دیں۔ مجھے اپنے پاس پلنگ پر نہ بٹھائیں، مجھ سے باتیں نہ کریں اور آنکھیں بند کئے قبلہ رو پڑے سوتے رہیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو کہ شہرت آیا ہے ـــــ اور میں لوٹنے کے لئے مڑا، چند قدم چلا، پھر واپسی کا ارادہ بدل دیا، پھر چلا ـــــ ساگر روڈ لاہور چھاؤنی کے موڑ پر کھڑا ہو گیا ـــــ شاہ جی کا مکان دکھائی دے رہا تھا۔ بہت سے لوگ

جمع تھے ـــــ قدموں نے پھر جواب دے دیا، کھڑا رہا، کھڑا رہا ـــــ ایک شخص کو دیکھا کہ اس طرف سے جہاں میں کھڑا تھا آ رہا ہے۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ قریب آیا تو کوئی ایسا تھا جسے میں نہیں جانتا تھا مگر میں نے آگے بڑھ کر اس سے سوال کیا "کیا عابد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے؟" جواب دیا "ہاں" چلنے لگا۔ میں نے پھر سوال کیا "کب لے جائیں گے؟" کہنے لگا "چار بجے کا وقت دیا ہے مگر مشکل معلوم ہوتا ہے" ـــــ "کیوں؟" ـــــ "ان کا بیٹا آ گیا تھا وہ انھیں اپنے مکان پر لے گیا۔ ان کی پہلی بیوی بھی ہیں نا۔ ان کے بچے ہیں۔ بچوں نے حق جتایا۔ یہ دوسری بیوی ہیں، بے اولاد ہیں، بیمار ہیں۔ ان کا زور کیا چلے" ـــــ وہ چلا گیا ـــــ اور میں سوچنے لگا عورت عابد علی کی کمزوری تھی مگر انھوں نے کسی عورت پر حق نہیں جتایا تھا ـــــ تین شادیاں کیں، جس نے جب تک رہنا چاہا رہی، جب جانا چاہا ان کے پاس سے چلی گئیں۔ عابد صاحب نے اسے نہیں روکا۔ انھوں نے اپنے بچوں پر حق نہیں جتایا۔ ان میں سے جس کا جی چاہا ان کے پاس رہا، جس کا جی چاہا ماں کے پاس چلا گیا ـــــ منو شاہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا، انھیں دل و جان سے عزیز تھا۔ اس کا جب کوئی کام ہوتا آ جاتا۔ جب جی چاہتا چلا جاتا۔ وہ ہم لوگوں سے کبھی کبھار اس کی جدائی کا دکھ بیان کرتے تو اداس سے ہو جاتے تھے مگر خود اس سے کبھی نہیں کہا کہ "منو شاہ تو میرے ساتھ رہ، میرا بھی تو کچھ حق ہے" ـــــ مگر آج عابد علی مر گیا تو اس کا مردہ یوں کھینچا تانی میں خراب ہو رہا ہے۔ میں آگے نہیں بڑھا اور رکشہ لے سیدھا فاروق گنج چلا گیا۔

سعدی کی جوانمرگی نے سارے خاندان اور سارے محلے کو بے حال کر رکھا تھا۔ میں بھی سوگواروں میں گم ہو گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے پھر شاہ جی یاد آنے لگے۔ میں بغیر کسی کو بتائے پھر نکلا۔ مومن پورے پہنچا۔ یہاں سینکڑوں سوگوار جمع تھے۔ میں کچھ فاصلے پر رک گیا۔ شام ہو گئی تھی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں ان کے مداحین اور دوستوں سے علیحدہ ایک نیم تاریک گوشے میں کھڑا رہا۔ معلوم نہیں کیوں میرا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ میں لوگوں میں جا کھڑا ہوں ـــــ دیر تک کھڑا رہا ـــــ شاہ جی کا جنازہ نہیں آ رہا تھا۔ میری ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ شدید کشمکش میں مبتلا تھا۔ آخر کار میری ازلی بزدلی مجھ پر حاوی ہو گئی ـــــ اور یہ سوال ہر طرف سے، میرے کانوں میں پڑنے لگے "کیا تو واقعی شاہ جی کا جنازہ دیکھ سکے گا؟" میں اس سوال کو نظر انداز کرتا رہا، کرتا رہا مگر کب تک، اور پھر میرے دل نے جواب دیا نہیں ـــــ اور میں تیز تیز قدم بڑھاتا وہاں سے لوٹ آیا۔

شاہ جی مر گئے ـــــ سب کو مرنا ہے۔ مگر شاہ جی کی موت کے ساتھ اس مقولے کی صداقت پر ایمان مضبوط ہو گیا کہ "ایک عالِم کی موت ایک عالَم کی موت ہوتی ہے"۔ اب اس شہر میں کوئی شخص ایسا نہیں کہ جس سے آپ کسی مشکل میں دستگیری حاصل کر سکیں۔ جس کے لیے کوئی ادبی مسئلہ مسئلہ نہیں تھا۔ جو ایک مینار تھا روشنی کا مینار۔ جس نے معلوم نہیں کس کس کے دل و دماغ کو جگمگایا ـــــ وہ ایک مستند عالم، ایک قابل اعتماد استاد، ایک وفادار دوست اور بقا نقوی کے قول کے مطابق "سید کی بنیادی پہچان یہ ہے کہ نبھانے کا ہنر جانتا ہو" ـــــ لاہور کے ایک معتبر سید خانوادے کا چشم و چراغ، اوائل عملداری انگریز میں ایک معتبر شخص جگراؤں ضلع لدھیانہ کے سید رجب علی شاہ کا پوتا۔ خود حسین و جمیل، حسن پرست، منس مکھ، بذلہ سنج، حاضر دماغ، حاضر جواب، خوش لباس، خوش اخلاق، شعر و موسیقی کا رسیا، تحقیق و تنقید کا رہنما ـــــ خوددار ایسا کہ شاید ہی کوئی یہ دعویٰ کر سکے کہ عابد علی اس کا احسان مند تھا، شفیق اتنا کہ شاید ہی کوئی ملنے جلنے والا ایسا ہو جس پر اس نے کسی نہ کسی طور پر احسان نہ کیا ہو۔ اور پھر احسان کر کے بھلا نہ دیا ہو ـــــ سید عابد علی عابد مشاعرے کی جان اور ادبی مجلسوں کی روح تھا۔ وہ لاہور کی آبرو تھا ـــــ لاہور اس کے بغیر کیسا اجڑ گیا، اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

●

●

نظمیں

اخترالایمان

متاعِ رائیگاں

یہ دردِ زندگی کس کی امانت ہے کسے دے دوں
کوئی وارث نہیں اس کا، متاعِ رائیگاں ہے یہ
مسیحا اب نہ آئیں گے یہی نشتر رگِ جاں میں
خلش بنتا رہے گا، میری سانسوں میں نہاں ہے یہ
خدایا ہم سے پہلے لوگ بھی جو اس زمیں پر تھے
یونہی پامال ہوتے تھے، جو اس کے بعد آئیں گے
امیدِ صبح کے خنجر سے زخمی ہو کے جائیں گے
(کہاں جا کر رُکے گا قافلہ ان سوگواروں کا)
یہ پھر بھی تیرے بندے ہیں تری ہی حمد گائیں گے
انھیں آنکھیں تو دی ہیں بصارت بھی انھیں دیدے
تجھے سب ڈھونڈتے ہیں اس طرح اندھے ہیں سب جیسے
اسی کورے ورق پر کچھ عبارت بھی انھیں دیدے
کھڑا ہے منہ کیے مشرق کی جانب، کوئی مغرب کی
(مری تصویریں ان چھپتے رنگوں کی ایسی کیا ضرورت تھی)

خدایا بخش دے ان بے گناہوں کے گناہوں کو
یہ معنی ڈھونڈتے ہیں کشمکش میں رات اور دن کی
حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں سال اور سن کی
یہ سب مجبور ہیں ان پر درِ توبہ کھُلا رکھنا
یہ دنیا خوف اور لالچ پہ جس کی نیو رکھی ہے
اسی مٹی سے پھوٹے ہیں اسی دھرتی کے پالے ہیں
اجالا بھی یہی ہیں اس زمیں کا اور ظلمت کا
یہی شہ کار ہیں تیرا، یہی پاؤں کے چھالے ہیں
(یہ سب کے سب لباسِ فاخرہ میں میلی بھیڑیں ہیں)
الٰہ العالمیں ان کی خطا سے درگزر کرنا
بہت معذور ہیں یہ خود نگر اپنی جبلّت سے
مقدّر ان کا ہے شام و سحر کو روز سر کرنا
مساعی ان کی سیم و زر کے ڈھیروں میں بدل دینا
ترے پاس آئیں موتی کے محل محنت کا پھل دینا

اختر الایمان

گریز

رابطہ جسم و جاں میں کتنا ہے
رشتہ اس دلستاں سے کیسا ہے

کیا ہے وہ، زہر ہے کہ آبِ حیات
بارہا جس کو پی کے دیکھا ہے

کیوں نہیں لکھتے اُن حقائق پر
جن کا دامن لہو سے بھیگا ہے

یہ ہے اور ایسی ڈھیر سی باتیں
جن سے گذرے، چھوا ہے، چکھا ہے

ہم فراموش کرتے رہتے ہیں
آپ ہی خود سے ڈرتے رہتے ہیں

تادیب

دوسروں کو سدھارنے مت جاؤ
اپنی اصلاح پر نظر رکھو

لوگ کیا کر رہے ہیں چھوڑ دو انھیں
اپنے افعال کی خبر رکھو

سرزنش اپنی خوب کرتے رہو
ایک شہدا جہاں میں کم ہوگا!

اختر الایمان

لطیفہ

یہ سوچتے ہی رہے ہم کہ زندگی کیا ہے
کوئی صحیفہ ہے پروردگار کا لکھا

کوئی معمہ ہے یا صرف الفت وراحت
جمال گاہ کہ مقتل ہے آرزوؤں کا

کوئی حبیبہ ہے، قحبہ ہے، کون ہے، کیا ہے؟
کوئی لطیفہ ہے سننے کا یا سنانے کا

جواب پانے کی باری جب اپنی آئے گی
تو کیا تماشہ ہے اُس وقت ہم نہ ہوں گے یہاں!



ایک کیفیت

وحی اُترتی تھی جیسے پیمبروں کے لئے
ترا خیال مرے ذہن پر اُترتا ہے
ہر اک سمت اُجالا سا پھیل جاتا ہے
خود اپنے آپ پہ یہ بھی گماں گذرتا ہے
زمین ہوں میں سمندر کی تہ سے اُبھرا ہوں

سلیم احمد

اب

وہ ایک لمحہ جو "اب" نہیں، ہے گذر چکا ہے
وہ ایک لمحہ جو اب نہیں ہے
ہے آنے والا
گزر چکا ہے جو ایک لمحہ وہ میں نہیں ہوں
ہے آنے والا جو ایک لمحہ وہ تو نہیں ہے
کہ ایک لمحہ ہیں دونوں ہم تم
وہ ایک لمحہ جو صرف "اب" ہے
یہی ازل ہے یہی ابد ہے

شکر

شکر کرو
اے ہم نفسو
ہم مُردہ ہیں
پر آنکھیں اب بھی زندہ ہیں

میرا ہم سفر

ہم دونوں ہمراہی ہیں
ہم دونوں میں منزل اور زنجیر کا رشتہ ہے
میں زندہ ہوں
وہ مُردہ ہے



انجم اعظمی

رنگ سہانے



پھولوں کے اس موسم میں
پیش پیش ہیں ہر منظر میں
پیلے ہرے گلابی رنگ
رنگ سہانے سپنوں جیسے
کیسا سکھ دے جاتے ہیں

گھر کے اندر
پیار کے دکھ ہیں، ساون جیسی رم جھم ہے
ایک بلا ہے دیر سے دروازے کے باہر
(دستک دیتی رہتی ہے)
شہر بہت آسیب زدہ ہے
بازاروں میں
رک رک کر اک شور و غوغا
چپ چپ آدم زاد ہیں جیسے
سہمے ہوئے پرندے ہوں
میرا جیون
پیار کا موسم، پیار ہے اپنے لوگوں سے
سہمے ہوئے پرندوں سے
کچھ ایسا ہو
دروازے کی بلا ٹلے
سب روپ مٹیں اندیشوں کے

پنکھ پکھیرو
کھل کر چہکیں، باہر نکلیں
سنّاٹے کے جنگل سے
من بھیتر بھی لہراتے ہوں
رنگ سہانے پھولوں کے

رنگوں نے پھر اس کی یاد دلائی ہے
اس لڑکی کے ہونٹ گلابی
آنکھیں کنول کٹورے ہیں
لوچ بدن کا جیسے ڈاری
لچک رہی ہو پھولوں کی
اس موسم میں
کتنے بانکے
آشا رت کی کھوج لگانے نکلیں گے
اس کو پا کر
(رت بدلی تو اس کو کھو کر)
اپنے آپ کو پا لیں گے

انجم اعظمی

ذوقِ نمو

ایک بچی جو راتوں کو
تاروں سے باتیں کرے
ایک لڑکا جو جگنو پکڑ کر
جلتی بجھتی ہوئی اپنی مٹھی کو حیرت سے دیکھے
ایک عورت
جو باہوں کا حلقہ بنائے
کسی کے لئے منتظر ہو
جسم اور روح کی ساری انگڑائیاں اس کی باہوں میں ہوں
ایک عاشق
شب و روز سنتا ہو جو دل پہ دستک کسی کی
ایک مردِ قلندر
گزرتے ہوئے وقت کے تیز آتش فشانی
دہانے پہ بیٹھا ہوا
پھول چنتا ہو امید کے

سارے کردار میرے ہی کردار ہیں
جو خوشی اور غم کی تپسیا سے کندن ہوتے ہیں
سارے چہرے
جو معصومیت سے دمکتے ہیں
میرا ہی چہرہ ہیں اور ان میں ہر ایک کے
کاسۂ سر میں میرا ہی ذوقِ نمو ہے

پت جھڑ

مدورا پی کر

میں گھوم آیا ہوں نگر نگر

جینے مرنے میں ایک ہی جیسی لذت ہے

پیلے پتوں کے

ڈھیر پڑے ہیں رستوں میں

جیسے لینت میں

سرسوں پھول رہی ہوگی

مرے قدم یہاں رک جاتے ہیں

ہنستے گل مہر کے سرخ پھول

جب اپنی طرف بلاتے ہیں

سرشار صدیقی

تنسیخ

جو لمحہ گزرے
وہ نکہتوں کی طرح سے
پھر پھول کا کوئی پیرہن نہ پائے
جو گھر کو چھوڑے
وہ پھر خدا کی زمیں پہ
میری طرح سے کوئی وطن نہ پائے

یہ وقت کا ایسا فیصلہ ہے
جو گلستاں میں
سند ہوا ہے
مگر —— یہی فیصلہ
تو کل ایک پھول کے ہاتھ
رد ہوا ہے

وہ ایک لمحہ
جو اس کو چھو کر گزر گیا تھا
ابد ہوا ہے

دل دریا

لوگوں نے کہا
اس در سے کبھی
کوئی نا امید نہیں لوٹا
کوئی خالی ہاتھ نہیں آیا

میں بھی لوگوں کے ساتھ چلا
چہرے پر گردِ ملال لئے
اک پُر امید خیال لئے
اک خالی دستِ سوال لئے

جب قافلہ اس در پر پہنچا
میں اس گھر کو پہچان گیا
پھر خالی ہاتھ ہی لوٹ آیا

اس در سے مجھے کیا ملنا تھا
وہ گھر تو مرا ہی اپنا تھا

سرشار صدیقی

انا

میں اپنے شیطان
اپنے دشمن کی
صحتِ جسم وجاں کی خاطر
خلوصِ دل سے
دعائیں کرتا رہا ہوں
لوگو !
کہ میں ہی تو ہوں
خود اپنا شیطان !
اپنا دشمن !!

ویرانے

لیکن میں نے
آج سے پہلے
خشک سمندر کب دیکھے تھے ؟
آج ان آنکھوں میں جھانکا
تو صحراؤں کی پہنائی میں
گرد کا اک طوفان اٹھا تھا
اور بگولے ناچ رہے تھے

مہمان

دستک پر
بستر سے اٹھ کر
جب میں نے دروازہ کھولا
دروازے پر
میں خود ہی تھا
آنے والا

سرشار صدیقی

دھوپ گھڑی

کبھی دن نکلے، کبھی شام ڈھلے
کبھی سایہ میرے آگے ہو
کبھی پیچھے ہو
کبھی پاؤں تلے

یہ وقت بھی کس کا دوست ہوا
کبھی تھم جائے
کبھی ساتھ چلے
کبھی شبنم شبنم میرا بدن
کبھی سورج سورج انگ جلے

دن سخت تھا لیکن ختم ہوا
جگ بیت گیا
میں وقت کی بازی جیت گیا

اب سر پہ کھڑی ہے
رات کڑی
میں فرض کا قرض اتار آیا
یہ کس کی عمر ملی تھی مجھے
یہ کس کی عمر گزار آیا
مرا منہ چھوٹا
مری بات بڑی
میں دھوپ گھڑی



فاصلہ

خود آگہی کی کھلی فضا میں
سکون ہوگا
طمانیت کا سرور ہوگا
مجھے یقیں ہے ضرور ہوگا

مگر یہ خود ناشناسیوں کا جو کرب ہے
اس سے کس طرح سے نجات پاؤں
نجات پاؤں اگر
تو عرفانِ ذات پاؤں

احمد ظفر

انتہائے الم کا پہلا خواب

پرانے گھر کی شکستہ دیوار سو رہی ہے
اور اس لمحے نئی فصیلوں پہ سر سجائے ہوؤں کی خوشبو سے کہہ رہے ہیں
کہ زندگی کی عدم سرائے گھنے اندھیرے کی نامہ بر ہے
تو کس لئے ہم گھنے اندھیرے میں مرنے والوں کے نام پوچھیں

ادھر وہ چہرہ تھا جس سے سورج کا پھول چپ چاپ کھل رہا تھا
ادھر یہ آنکھیں جو چپ کے غاروں کا حرف آخر بنی ہوئی ہیں
وہ سمت کی بے ارادہ مشعل جو کالی شاخوں کو زرد رنگوں میں دھو رہی تھی ـــــــ بجھی ہوئی ہے
پرانے گھر کے شکستہ در پہ کوئی پرندہ بہار کے خواب دیکھتا ہے

ہوا چلی تو نگار خانے بھی نقش حیرت بنے ہوئے ہیں
کسی کی آنکھوں کے دائروں میں سسکتے آنسو
کسی کے ہونٹوں پہ زخم تالاب ہیں لہو کے
وہ چاہتیں جو فنا کے جنگل میں جگنوؤں کی قطار بن کر
خدا کا بے نام سا تصور بنی ہوئی تھیں
کھنڈر کھنڈر میں سسک رہی ہیں

وہ جسم جو شاخ شاخ پھولوں سے لد گیا تھا
کسی الاؤ کی راکھ بن کر فضا میں تحلیل ہو رہا ہے
اندھیرے دریا میں خواہش مرگ کا سفینہ
ازل سے شاید بھٹک رہا ہے
ابد یہی ہے بریدہ سر خوفناک لاشیں
بقا کا ہر راز جن کے پیچھے خمیدہ سر ہے
پرانے گھر کے کواڑ آنکھوں کو بند کر کے سمٹ رہے ہیں
پرانا گھر خشت خشت جیسے بکھر رہا ہے
نئی فصیلوں پہ جلنے والے چراغ چپ چاپ دیکھتے ہیں

احمد ظفر

دن کا کالا سورج

آسماں درد کی صد رنگ بساط !
اور زمیں موت کی پرواز کا پروانہ ہے
گردشِ دہر کے مجبور زمانے والے
چلتے رہتے ہیں کہ راہیں کسی مقتول کی آنتوں کی طرح
پھیلتی بڑھتی چلی جاتی ہیں تا حدِ نظر
تو مرا خواب نہ مہتاب نہ صحرا نہ سراب
مردہ چہروں کی نمائش کسی آئینے میں
حرفِ تقدیر سرِ شام لکھا جاتا ہے

منزلِ شب ہے وہی میری مسافت ہے وہی
وقت پگھلے ہوئے سورج کا وہ دریا جس میں
پیاس کا زرد سفینہ کسی پتے کی طرح
کانپتا رہتا ہے چپ چاپ، وہ لمحہ جس کو
زخم آواز ستاروں کی زباں کہتی ہے

دھوپ نکلی بھی تو مینار کے رنگوں کو نگل جائے گی
بارشِ غم سے شجر جسم کا جل جائے گا
نقش بنتے ہوئے مٹتے ہی چلے جائیں گے
نقشِ تکرار فنا کی کوئی تصویر جو بے نام بھی ہے

میں تجھے درد کی دیوار کے اس پار کہاں تک دیکھوں
ریزہ ریزہ میرے احساس کا آئینہ ہے
تو جسے پلکوں سے اس شہرِ خموشاں میں چنے گی، کب تک
جس کے ہر موڑ پہ نفرت کی دکاں ملتی ہے
روحِ انساں کے لئے وقت وہی شیش محل
نارسائی کے جہنم کے سوا کچھ بھی نہیں

گلِ دوپہر

جون کے مہینے میں
خون میں پسینے میں
پھول کھلتے رہتے ہیں
زخم سلتے رہتے ہیں
دھوپ گرد حدّت میں
دوپہر کی شدّت میں
سوز وہ سفینے میں
غم کے آبگینے میں
تو دکھائی دیتی ہے

تو ہے دور کی آواز
میں شجر کی خاموشی
تیرے پاس آیا تھا
میں کہ ایک سایا تھا
ہے کہیں وہ سرگوشی
ذہن کے دفینے میں

کس صدی کی باتیں ہیں
اب یہ سوچتا ہوں میں
آئینے کے چہرے پر
زنگ دیکھتا ہوں میں
ہر بدلتے موسم میں
جیسے مر رہا ہوں میں
مسکن پھر بھی تیرا ہے
لخت لخت سینے میں
دل کے ہر نگینے میں

قمر جمیل

مائیکل انجیلو کی ایک رات

آدم کی پہلی آواز
ان پتھروں میں اب بھی
چمک رہی ہے جنھیں پہلی
بار میں نے اپنی سرزمین
میں دیکھا —— میری سرزمین
ان برفاب جسموں سے آباد ہے
جن جسموں میں خوبصورت
آنکھیں نئی جنّت کی سفیر ہیں
فیڈیاس —— میں تجھے
ایک نئے انسان کا چہرا
دکھاتا ہوں —— اس چہرے پر
انسانیت کا گریس ہے اور
عظمتِ آدم کی وہ تصویر ہے
جو ہمیشہ میری زمین پر چمکتی
رہے گی —— میں آدم کو
فطرت سے عظیم سمجھتا ہوں،
میری راتوں میں پتھر چمکتے
ہیں —— اور میرے دن
مرمر کی راتوں سے زیادہ روشن ہیں
یہ دیکھو یہ آدم ہے جس پر روشنی
داہنے کاندھے سے نیچے گر رہی ہے
روشندان کا دروازہ بند نہ کرو،
ابھی آدم کو اپنی زمین کے لئے اِس
روشنی کی ضرورت ہے —— مجھ میں یہ
آدم زندہ ہے —— اور میری زمین
پر اب بھی وہ سایہ موجود ہے جس
سائے میں اَن گنت راتیں، اَن گنت
رنگ اور اَن گنت چہرے موجود ہیں
اس اندھیرے میں رفائیل ہی نہیں
روڈن اور ہنری مور بھی گھوم رہے ہیں
اپنے اپنے مجسّموں کے ساتھ، —— مگر میں
اب ایک نئے آدم کا مجسمہ بناؤں گا
جس آدم کے چہرے پر اپنی زمین کی مٹی کے
ساتھ اپنی زمین کا سورج بھی چمکے گا
کاش میں اس نئے سورج کا
مجسّمہ بنا سکوں

عبیداللہ علیم

اِک پَل



سب چھاؤں دھوپ کی آنکھیں ہیں کچھ جلی ہوئی کچھ بجھی ہوئی
اِدھر اُدھر بس ایک دیا اور چپ چادر سی تنی ہوئی

باطن، ظاہر، ظاہر، باطن اصل میں ایک ہی لمحہ ہے
کچھ ہونے والا ہو گزرا، کچھ ہونے والا ہونا ہے

عکس بھی زندہ اور ہماری آوازیں بھی زندہ ہیں
اس مرنے سے کیا ہوتا ہے آگے ہم پائندہ ہیں

پیچھے کتنا رستا چھوڑا، آگے کتنا رستا ہے
سمے میں بہتے آئے ہیں اور سمے میں بہتے رہنا ہے

اِس سمے کے چھ پل بیت گئے اس سمے کا اک پل باقی ہے
بس یہ اک پل جو بیت گیا تو پھر ہستی آفاقی ہے

محسن احسان

جو سراپا ہے غزل

میرا جی چاہتا ہے
نظم لکھوں
اک حسین نظم لکھوں
اس کے لئے
اس کی زلفوں کے لئے
اس کی آنکھوں کے لئے
اس کے اندازِ تکلم کے لئے
جو مری روح کی تسکین کا سامان بنا
اس کے ہر زاویۂ جسم کی خاطر
جو مرے جسم کی تزئین کی پہچان بنا
میں مگر سوچتا ہوں
جو سراپا ہے غزل
اس کے لئے کیا لکھوں
جو سمندر ہے اسے کس طرح دریا لکھوں
اور دریا کو جو لکھوں بھی تو قطرہ لکھوں
اور قطرے کو سمیٹوں بھی تو نقطہ لکھوں

کردار

دیکھو،
ہم سب ایک سفید کنول پر
ٹیک لگائے تیر رہے ہیں
اور محسوس یہ کرتے ہیں کہ ہم نے خود کو
نافِ زمین سے مضبوطی سے باندھ رکھا ہے
ظاہراً ہر خواہش کو ہم نے دار پہ الٹا لٹکایا ہے
اپنی ہر اک یاد کو ہم نے قتل کیا ہے
تاکہ دل میں
کوئی تمنا سر نہ اٹھانے پائے
ذہن میں کوئی بات نئی در آتی ہے
تو ہم اس پر
خود اپنے ہی ہاتھوں سے چونا کر دیتے ہیں
کوئی روزنِ تازہ ہوا کے جھانکنے کو گر کھلتا ہے
تو خود کیچڑ سے بھر دیتے ہیں



سحر انصاری

ایک نظم
ایک شاعرہ کے لئے

محبت، جب پہلی پہلی حیرت
اور پہلی پہلی مسرت
کے تجربوں کے بل پر
ایک KNOW - HOW بن جاتی ہے
تو بے ساختگی بھی دانستہ ہنرمندی
اور معصومیت بھی کاریگری لگتی ہے

یوں لگتا ہے کہ ہم نے جتنے بھی لفظ کسی سے کہے ہیں
وہ تو کسی تمثیل نگار نے اپنے کسی اداکار سے
کسی اسٹیج پر کہلوائے تھے

اور جتنے لفظ بھی کسی نے سنے ہیں
وہ تو یوں سنے گئے تھے کہ خلوص کا ٹکٹ خرید کر
آنے والے سامعین کو کچھ نہ کچھ سننا ہی ہوتا ہے

جب گڑیا کے گالوں کی سرخی،
آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ
کو دیکھ کر جی نہیں بہلتا
بلکہ TENSION اور جلن کے مارے
بار بار
باربی چوریٹ کی ٹکیوں، وٹامن کی شیشیوں

اور ہیموگلوبن کی ضرورت
کے نسخوں پر نظر پڑتی ہے
تو شاید سوچنا پڑ جاتا ہے
کہ گڈے گڑیا کے کھیل کا دعوت نامہ
سول میرج کے سرٹیفکٹ میں کیسے بدل جاتا ہے

پھولوں سے لدی کار میں آنے والی
ایک شب کی شہزادی
سہاگ پڑے کے حصار سے نکل کر
کیسے ڈیزل کے دھوئیں، پسینے کی بدبو
اور اجنبی سانسوں کے بھبکوں سے
بھری ہوئی بس میں آنے جانے کو زندگی کی
سب سے بڑی سہولت سمجھنے لگتی ہے

اور سوچتی ہے: کچھ اور سوچنا گناہ ہے
(کہو ساری سہولتیں اللہ کے لئے ہیں)

رفاقت کی میز پر بیٹھے بیٹھے
جب دونوں کے عکس میز کی چمکدار سطح میں
اترتے چلے جاتے ہیں تو ضرورتوں کا بیرا

آکر میز صاف کرتے کرتے جذبوں کی طشتری میں
منافقتوں کا کیش میمو رکھ دیتا ہے
اور آنکھوں میں کھو جانے والی آنکھیں
اور سچائیوں کا یقین دلانے والے سارے لمس
گھبرا کر یوں ضرورتوں کی طرف لوٹ آتے ہیں
جیسے قیدی
حاضری کی ایک آواز پر
سب کچھ چھوڑ کر ”یس حاضر“ ہو جاتے ہیں

تب ٹھکانا بھی سرائے کا معلوم ہوتا ہے
بستر بھی کرائے کا معلوم ہوتا ہے
اور اس پر ہونے والی ساری محبتیں
اور محبتوں کے سارے اعمال
قسطوں پر خریدا ہوا ریفریجریٹر معلوم ہوتے ہیں
جس کے ایک حصّے میں برف پانی بن رہا ہے
دوسرے حصّے میں گوشت کو سڑنے سے بچایا جا رہا ہے
اور ایک خانے کو پھلوں کی تازگی اور سبزیوں کی
شادابی کا محافظ بنا دیا گیا ہے
کچھ دوراندیش مائیں اپنے پستان بھی فریج میں رکھ دیتی ہیں
اور جنریشن گیپ کا نوحہ کرنے والی نسل سوچتی ہے
ہمارا کیا ہم تو COW & GATE سے دودھ بخشوا لیں گے

ریفریجریٹر کا دروازہ جتنی بار کھلتا ہے
بنک کے اوور ڈرافٹ کے ریمائنڈر کی طرح کھلتا ہے
تو پھر محبتیں بوجھ، بوسے خوشامد
اور پھر آغوش، اداکاری، رمز، حاوی ہے

پیڑ سے ٹوٹا ہوا پپیتا
یہ سمجھتا ہے کہ میں نے کھانے والے پر احسان کیا
کھانے والا سوچتا ہے: اگر میں نہ کھاتا تو
یہ یونہی پڑے پڑے سڑ جاتا
غذا سے ہمدردی کریں کہ پیٹ سے
یوں بھی شکم سیروں سے ہمدردی کم ہی ہوتی ہے

اور احسان در احسان کا سلسلہ چلتا رہتا ہے
کوئی کہتا ہے:
”دستِ تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے“
کوئی کہتا ہے:
”وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے“
کوئی کہتا ہے:
”جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو“
کوئی اور کہتا ہے:
تو بھی چالاک ہے محبت میں
اور اس درجہ میں بھی سادہ نہیں
واعظ کہتا ہے: باطل، باطل، سب باطل

کاہے کو بیاہی بدیس، بابُل مورا
چا چا چا
کاہے کو بیاہی بدیس
چا چا چا
اور سب سے بڑا یقین جو نکاح نامے
کے سکوت میں چھپا ہوتا ہے
الزام تراشی، پچھتاوے اور بڑبولے پن پہ اتر آتا ہے

"شادی کریں گے نا؟"
یہ سرگوشی بے اعتبار ہاتوں
اور بے اختیار ہاتھوں کو ترسنے لگتی ہے
جیسے اناطول فرانس اسّی سال کی عمر میں بھی
بچوں کی طرح "لالی پاپ" کھانا چاہتا تھا
لیکن وقت کے راستے پر واپسی کا سگنل کوئی نہیں
پچھتاوا
دکھاوا
پچھتاوا
INTERIOR DECORATION
ABC OF BEAUTY
HOME & HEALTH
سے گزر کر
PLAY BOY
اور پھر "جرأت مندی" کے راستے
سامنے آتے ہیں
جیسے جیب خرچ کو ترسنے والا بچہ
اِدھر اُدھر دیکھ کر
ایک دن باپ کی جیب سے پیسے چرا لیتا ہے

نباہ بھی تو جھوٹ ہے
سمجھوتا بھی تو منافقت ہے
یہ بجلی کی ایک ہی رو تو ہے
جو ہیٹر کو گرم اور فریج کو ٹھنڈا رکھتی ہے
شعور کی رو بھی
اظہار کے لئے اپنے اپنے وجود ڈھونڈ لیتی ہے

گردھر ناگر کا نام جپنے والے ہونٹوں میں
چرس کا سگریٹ لرزنے لگتا ہے
لائٹر کی روشنی میں چہرہ کتنا بے باک
اور آنکھیں کتنی حقیقت پسند بن جاتی ہیں

اور پریم رس کے پیالے میں
شمپین کی لہر جاگنے لگتی ہے
پھر زبانوں کا ذائقہ
کسیلے پن، کڑواہٹ، متلاہٹ میں بدل جاتا ہے

NAUSEA
سارتر
سمونے دا بوار
A DUTIFUL DAUGHTER
مارلن منرو
کامیو
سلویا پلاتھ
سنڈریلا
نہیں، کوئی MASK بھی مسخ شدہ خدوخال کو
نہیں سنبھال سکتا
شخصیت کی گرتی ہوئی دیوار کو کوئی ہاتھ سہارا
نہیں دے سکتا

کس سے لڑیں
کس سے بغاوت کریں؟
سب دلال ہیں
مگر طوائفیں بھی تو ہیں؟
کس کو الزام دیں
فارمولوں، حکیمانہ مقولوں اور فلسفوں سے

اکیلے بستر کی کروٹیں آسودہ نہیں ہو سکتیں

کس سے لڑیں
کس سے بغاوت کریں؟
اپنے آپ سے
معاشرت سے
کائنات سے
ALIENATION سے؟
یا ان سب اجزا سے بنے ہوئے
ایک ROBOT سے؟
جس نے کہا تھا:
"تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟"
اور جو کہتا ہے:
"مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"
کوئی اور بھی تو کہہ گیا ہے:
چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق
اور ایک انقلابی نے یہ بھی تو کہا ہے:
"طبقاتی معاشرے کی محبت بھی طبقاتی ہوتی ہے"

یہ بندر اور بندریا
غار میں کب گئے اور غار سے کب نکل آئے؟
ماسکو، ہنوئی، نیویارک!
پیرس، لندن، پیکنگ!
کیا کوئی شہر اس کا جواب دے سکتا ہے
کیا کوئی شہر اس کا جواب دے سکتا ہے

سیّد احمد شمیم

جھیل، ہونٹ اور جلتی لکیریں

جھیل گہری جھیل
تیرے شانت نرمل پانیوں میں
کنکری پھینکی ہے کس نے ــــ؟
دائرہ در دائرہ،
موجیں اٹھی ہیں:
ایک جگ سے سوکھے پیاسے
ہونٹ اپنے
مٹتے بنتے دائروں کو
چومتے ہیں:
جسم کے اندھے کنوؤں میں
روشنی کی
مضطرب جلتی لکیریں
دوڑتی ہیں:
لمحہ لمحہ ریشہ ریشہ
جل رہا ہے
جھیل گہری جھیل،
مجھ کو اپنے اندر تو سمو لے ــــ

حسن اکبر کمال

جل پریاں

سب کہتے تھے
سات سمندر پار جزیرہ جل پریوں کا ہے
جل پریوں کے خوابوں نے کچھ ایسا جادو پھونکا

چھوڑ دیا گھر بار
مسافر جا پہنچا
سات سمندر پار
جہاں جل پریاں تھیں
مہکی ہوئی سانسوں میں میٹھے گیت سناتی
نئے نئے انداز دکھاتی
رگ رگ میں اک آگ لگاتی جل پریاں
ان کے ساتھ مسافر نے
ایک سہانے خواب کی صورت
بارہ برس گزار دئیے



پھر گھر کی یاد نے
دھیرے دھیرے دل پر دستک دی
سات سمندر چیر کے جب وہ
اپنے دیس میں آیا
اس کی آنکھیں
اپنے گھر کا منظر دیکھ کے
جیسے بن گئیں پتھر
اس نے دیکھیں
اپنے دیس کی دوشیزائیں
بنی ہوئی جل پریاں

حسن اکبر کمال

کینسر وارڈ

زرد خاکستری بام و در کی
یہ تابوت جیسی عمارت
جسے نوحہ گر سوگواروں کی مانند
گھیرے ہوئے پیڑ ہیں
جن کے پھیلے ہوئے سائے
ہیں جیسے پرچھائیاں موت کے شہپروں کی
سرِ شام ہی
موت کے سرمئی اور خنک سائے
آغوش میں اس عمارت کو لے لیتے ہیں
زندگی کی حرارت، مسرّت سے اور روشنی سے
بھرے شہر میں
یہ عمارت کچھ ایسے ہے
جیسے کسی پرکشش جسم میں
کوئی مکروہ ناسور اندر ہی اندر لہو چاٹ کر پل رہا ہو

یہاں بھی ہیں انسان ہم جیسے اور سب ہماری طرح
زندہ رہنے کے ہیں آرزو مند بھی
ان کا قاتل مگر
ان کے اندر چھپا ہے
اور ان کا لہو چاٹ کر جی رہا ہے
سُبک گام اور بے وفا زندگی
ان کی خاکستری، نیم جاں کپکپاتی ہوئی انگلیوں سے
بہت دھیرے دھیرے
کسی ریشمی اور ملائم، چمکدار کپڑے کی صورت
پھسلتی چلی جا رہی ہے
ان کی بے نور ہوتی ہوئی
خوف سے پھیلتی زرد آنکھیں
عزیزوں کے چہروں پہ امید کی روشنی ڈھونڈتی ہیں
مگر سارے چہرے تو ان کے لئے آئینے بن گئے ہیں

دریچے کبھی استعارے بھی تھے
روشنی، زندگی اور تازہ ہوا کے
مگر اب
دریچوں کی جانب اٹھیں اُن مریضوں کی آنکھیں
تو ان دھندلے شیشوں کے باہر
بلاؤں کی صورت
نظر ان کو آتی ہے خود اپنی دہشت مجسم
ہیں کیسے اذیت گرفتہ مکیں
زندہ لاشوں کے اس مقبرے کے
ہماری طرح ہے انھیں بھی محبت
خزانے لٹاتی ہوئی
جگمگاتی ہوئی زندگی اور دنیا سے بھی
اپنے پیاروں سے بھی
اور یہ دلرُبا، بے وفا زندگی
ان کی بے جان ہوتی ہوئی
زرد پڑتی ہوئی انگلیوں سے
کسی ریشمی اور ملائم، چمکدار کپڑے کی صورت
پھسلتی چلی جا رہی ہے
انھیں راکھ کا ڈھیر کرتی
رگ و پے سے اک روشنی سی نکلتی چلی جا رہی ہے
کہیں کوئی ہے؟
کون ہے؟
جو چراغوں سے چھنتی ہوئی روشنی
پھر انھیں بخش دے

اور جو ہے
جس کی قدرت میں
بجھتے چراغوں کا مقسوم ہے
فیصلہ اُس کا
اُس کے سوا کس کو معلوم ہے؟

انور شعور



کیوں آنکھ بے چراغ

کیوں آنکھ بے چراغ ہے اے بدنما سے داغ
گو زندگی کی لوح پہ تُو ایک نقطہ ہے
نقطے سے حرف، حرف سے لفظ اور لفظ سے
جملے وجود پاتے ہیں
افسانے کے لئے
عریانیوں کو آئینہ پہنانے کے لئے
ہے زندگی کی لوح پہ ایک بدنما سا داغ
تیرے بغیر حرف کہ تُو حرف کے بغیر

افتخار عارف

ایک اُداس شام کے نام

اک سورج ہے جو شام ڈھلے مجھے پُرسہ دینے آتا ہے
ان لوگوں کا جو کسی موڑ پر ملنے تھے اور ملے ہیں
ان پھولوں کا جو کسی شاخ پر کھلنے تھے اور کھلے ہیں
ایک دریا ہے جو جنم جنم کی پیاس بجھانے آتا ہے
اور انگارے برساتا ہے
اک خوشبو ہے جو بستی بستی میرا پیچھا کرتی ہے
اور اپنے جی کی بات بتاتے ڈرتی ہے
اور یہ سورج اور یہ خوشبو اور یہ دریا میری آن بان کے بیری ہیں
سب میری جان کے بیری ہیں

پیش لفظ

خداوندا! مجھے توفیق دے
میں ایسے زندہ لفظ لکھوں جو نہ لکھوں میں
تو دنیا بانجھ ہو جائے
مگر پھر سوچتا ہوں
اتنے زندہ لفظ لکھے جا رہے ہیں اور
لکھے جا چکے ہیں میں ہی لکھ لوں گا تو
کیا ہو جائے گا
کیا یہ پرانا آدمی پھر سے نیا ہو جائے گا
یا دوسرا ہو جائے گا



شاہدہ حسن

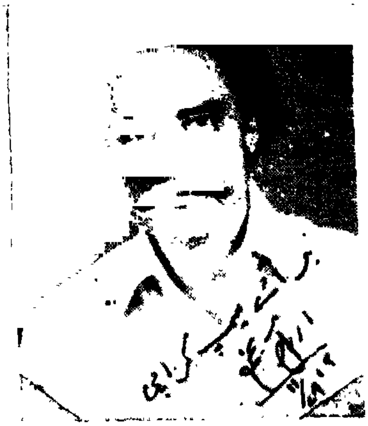
اے شب ماہ مجھے جینے دے

ڈس نہ اب
میری رگ و پے کی چمک
اے شب ماہ مجھے جینے دے
اک ستارہ جو کھلے ساون میں
میری مٹی نے اگایا تھا کبھی
میرے آنچل میں سرِ شام کہیں ڈوب چکا
تو نے اے چاند!
مری شاخِ خزاں دیدہ پر
منعکس ہو کے پکارا ہی کیوں؟
روشنی، جاتی ہوئی ساعت کی
ایک پل قطرۂ شبنم بن کر
کیا مری پیاس بجھا سکتی تھی؟
بوند سے بوند کا رشتہ کیا ہے؟
لہر سے لہر کا ناتا کیا ہے
دیکھ! سب زہر مرا
خون کی خوشبو سے الگ
خشک بے آب کٹوروں میں دھرا رکھا ہے

بہانہ

جب کبھی رات سے اک تارۂ نم ناک نے کی
کوئی سرگوشی سی
صورتِ زخم کھلی
مجھ میں آہٹ تیری

ارمان نجمی



تکمیل کی آرزو

جب بھی گزرا ہوں کنج املتاس سے
ایک خوشبو نے روکا ہے رستہ مرا
مجھ سے دامن چھڑا کر کہاں جاؤ گے
میں رواں ایک اک قطرۂ خوں میں ہوں
کیسے ٹوٹے گا میرا سہانا فسوں
ایک خوابِ شکستہ کی حسرت ہوں میں
نامرادی کی زندہ امانت ہوں میں
وہ اسی رُت میں مجھ کو ملی تو ملی بھی کہاں
سرحدِ مرگ کے پاس پھر آرزو رائیگاں
اُس کی راہوں میں تھیں موت کی وادیاں
اُس کے مرنے کا منظر مجھے یاد ہے
ایک لرزش لبوں پر بکھرتی ہوئی
روشنی تیرگی میں اترتی ہوئی
تھرتھراہٹ میں ڈوبا ہُوا جسم و جاں
کانپتی اُنگلیاں پھیلتی پتلیاں
ڈوبتی ساعتوں کے کڑے دردتک
اُس کا حاصل تھی اک خواب کی جستجو
اُس کے بے خواب سینے میں زندہ رہی
مرتے مرتے بھی تکمیل کی آرزو

اے ابد کے خزانے اُسے کیا دیا

بے خبر کنارا

ندی کا سوکھا ہوا کنارا
جو نامرادی کا بوجھ اُٹھائے
دہکتے سورج کا تازیانہ
سلگتے سینے پہ سہ رہا ہے
گھنے شجر کی نہ ٹھنڈی چھاؤں
نہ دوب کی سبز سبز چادر
چھپائے کون اُس کی ننگی چھاتی
پیاس کی آگ میں سلگتا
ندی کا آتش بجاں کنارا
سہانے لمحے کا منتظر ہے
کہ ابر کی کالی پالکی میں
سنور کے آئے گی رُت کی دُلہن
تھرکتی بڑھتی اُچھلتی گاتی
ندی کنارے سے آ ملے گی
مگر کنارے کو کیا خبر ہے
کہ اب ندی رُخ بدل چکی ہے

ایوب خاور

گیلری میں ایک تصویر

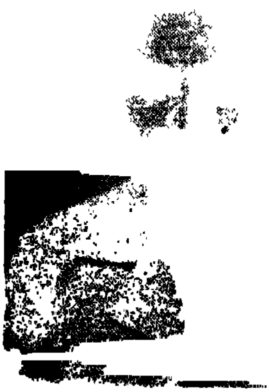
موسموں کی سارباں ٹھنڈی ہوا یہ جانتی ہے
دوپہر کی دھوپ میں سیبوں کی نیندیں
صبح کاذب کی مقدس دھند کی مانند
کتنی گہری، کتنی ہلکی اور پراسرار ہوتی ہیں
دوپہر کی نیند میں ڈوبے ہوئے گھر جانتے ہیں
بے خبر دنیا کے ادھر آسماں
اور جاگنے کے وہم میں گم لڑکیاں
کتنی گہری، کتنی ہلکی اور پراسرار ہوتی ہیں

مگر وہ سیب
جو تصویر کے چوکور کاغذ میں
شکستِ خواب کے منظر کی صورت سو رہا ہے
اس کے اندر
جاگنے کے وہم میں گم ایک لڑکی
جس طرح آتش فشاں خاموش مگر پراسرار
اور سر پر شہد کی مکھی
نہ جانے کون کس کو ڈس رہا ہے
پھر بھی یوں لگتا ہے جیسے
سیب کی شاداب نیندوں کی ہلاکت کے لئے
سازش کا چھتہ، شہد کی مکھی بناتی جا رہی ہے
اور لڑکی
جاگتے رہنے کے موذی وہم میں گم
شہد کی مکھی کی سازش بُن رہی ہے
اور فرشتوں کی طرح بے عیب موسم کے مساموں سے
منافق عمر کا سیال بہتا جا رہا ہے
زندگی اپنے عناصر سے لپٹ کر رو رہی ہے
عالم رقصِ اناالحق کا مقدر ڈھو رہی ہے

جلیل ہاشمی

صحرا اور سمندر کے درمیان

کیا تم آسمانوں پر دھوپ کا صحرا اور
بادلوں کا سمندر دیکھ سکتی ہو
صحرا اور سمندر میں سفر کرنے کے لئے
کشتی اور سائبان کی ضرورت ہوتی ہے
لیکن مجھے نہ کشتی چاہئے نہ سائبان
کہ مجھ پر TEEN - AGE کا پاگل موسم گزر چکا ہے
اب میرے پاس پڑھنے کے لئے کتابیں بھی ہیں
اور الجھنے کے لئے مسئلے بھی ——— لیکن تم
صرف کتابوں اور مسئلوں میں، خود کو مصروف
نہیں رکھ سکتیں
مجھے خبر ہے ہمارے شہر میں دکھ انجانے واہمے
کی طرح ہماری روح میں بس جاتا ہے
پھر بھی تم اداس مت رہا کرو
مجھے اداس لڑکیاں ہنسنے والی لڑکیوں سے
بھی زیادہ بری لگتی ہیں
تم سوچا بھی مت کرو
تمہاری سوچیں تمہاری بیوقوف سہیلیاں ہیں
جو تمھیں سوائے الجھاوے کے
کچھ نہیں دے سکتیں
تم مجھ پر اعتماد کرسکتی ہو
میں تمہارا دوست بھی ہوں اور وکیل بھی
تم اپنا کیس مجھے بتاؤ
میں تمھیں صحیح مشورہ دوں گا
اور بالکل مفت



صفدر سلیم سیال

سالِ رفتہ کی آخری نظم

سالِ رواں کا آخری لمحہ
سالِ نو کی پہلی گھڑی کو
اپنی جان کا تحفہ دے کر
رخصت ہونے والا ہے
لان کے سارے پیڑوں کے بادامی پتے
جان کی بازی ہار چکے ہیں
جن کے پیچھے چکنے چکنے پات کھڑے ہیں
اِن آنکھوں نے ایسے کتنے زمانے دیکھے ہیں
کتنی صبحیں، کتنی شامیں
ہر موسم کی زد میں آئیں
ہر موسم نے صبحوں، شاموں کے رخساروں پر
اک زخمِ سفر تحریر کیا ہے
سرد ہوا یا آگ بگولہ لو کے جھکڑ
سمتِ سفر جب طے کرتے ہیں
زخمی آنکھیں
ٹکر ٹکر ہر موڑ کو دیکھتی رہ جاتی ہیں
ایسے زمانے لوک زباں پر لا نہیں سکتا
زخمِ سفر بھی چھپا نہیں سکتا
میں نے آج یہ سوچا ہے کہ اپنی آنکھیں
ارضِ وطن کو
سالِ نو کے موقع پر تقسیم کروں



لیکن میری شرط یہی ہے
میری آنکھیں ایسے اندھے شخص کو دینا
جس کے جسم پہ میرے سر کا سایہ نہ ہو
میری سوچ کا عکس نہ ہو
تاکہ اب تک جو کچھ میں نے سوچا ہے
وہ نہ سوچے!
جو کچھ میں نے دیکھا ہے
وہ نہ دیکھے!!

علی عبّاس اُمید

خزاں چہرہ نظم

تم نہ خوابوں کی طرح میرے لہو میں اُترو

نور و نکہت سے بنے جسم محبّت لے کر
بارہا میرے قریب آئے مرے دل سے ملے
جاگتے لہجوں کی پُر کیف و شگفتہ تاثیر
کلمۂ حق کی طرح دل میں اُترتی ہی گئی،
ان کی معصوم جسارت کی دلآویز کلی
میرے پہلو میں ہر اک آن بکھرتی ہی گئی
ان کی خوشبو سے شرابور ہوا ذہن مگر
شاخِ تنہائی پہ بس یاس کا غنچہ ہی کھلا
لاکھ کوشش پہ بھی ماحول کا دامن نہ سِلا

دوش پر تند ہواؤں کے روش تا بہ روش
برگِ آوارہ سی رقصاں رہی جینے کی اُمنگ
آرزو سبز تھی پھر زرد ہوئی دن کی طرح
ہر نئی صبح نے بدلا نیا اُمید کا رنگ

میرے احساس کی دھرتی پہ کسی موسم میں
آگ اُگلتے ہوئے لمحات کے لشکر گزرے
اور کبھی خون سی جمنے لگی ماحول کی برف
روز و شب پھر بھی نہ قاتل نہ مسیحا ٹھہرے

نیم خوابیدہ تمنّاؤں کے روشن چہرے
جانے کیوں وقت کے مانند ہی بوجھل بوجھل
نارسائی کا گلہ کرتے رہے، بجھتے رہے
اور مرجھا گئی پھول سے دل کی کونپل

اب تو احساس کی وادی میں خزاں کی رُت ہے
شاخ بے برگ، روش سبزہ سے محروم ہوئی
ذہن کے بند دریچوں پہ نسیمِ جذبات
بے دھیانی میں چلی آئی تو مغموم ہوئی
راکھ کا ڈھیر متاعِ دلِ مرحوم ہوئی
زندگی آج فقط شعلوں کی پرچھائیں ہے
اور میں زخم بہ جاں، نوحہ بہ لب، گریہ کناں
ہر نئی صبح کے دروازہ پہ دستک دے کر
چھیڑتا رہتا ہوں لمحوں کے لئے نغمۂ جاں
اور پھر شام کے طاقوں میں بہ نامِ سورج
شمع کی طرح سجا دیتا ہوں تحریر و بیاں

تم کہ معصوم ہو نادیدہ خیالوں کی طرح
تم نہ خوابوں کی طرح میرے لہو میں اُترو

عشرت آفریں

بارھواں جنم دن

اے تہہ خانوں میں پلنے والی شہزادی
تیرے حاکم باپ کا حکم تھا
"ایک زمانے تک تجھ پر دنیا کا سایہ نہ پڑے"
سورج ، چاند ستارے ، رنگ
اور موسم کے افسوں سے تجھے بچایا جائے
پچھلے پہر کا چاند نہ تجھے دکھایا جائے
تجھے سویرے
پانچ طرح کے پھولوں میں تولا جاتا تھا
لیکن
تہہ خانوں میں پلنے والی لڑکی
آج تری نگراں یہ کنیزیں حیراں ہیں
تیرے برابر کے پلڑے میں
رنگ برنگے پھولوں کا انبار لگا ہے
پھر بھی تیرے بدن کا پلڑا جھکا ہوا ہے
ساری کنیزیں حیراں ہیں اور لرزاں ہیں
آج تو ان سے
موسم اور جذبات کی باتیں
دھرتی اور آکاش کی باتیں
چاند اور پانی
رنگ اور خوشبو
لذّت اور احساس کی باتیں کرتی ہے
تیری یہ نگراں کنیزیں اور زیادہ حیراں ہیں
شاید ان کو یاد نہیں کہ
آج تیرے جیون کا بارھواں برس لگا ہے

حوّا کی بیٹی کا پہلا دکھ

راتوں کو
جب ہمسائے کے گھر سے
بچے کے رونے کی آوازیں آتی ہیں
تو مری آنکھیں بھیگنے لگتی ہیں
اور میرے اندر اک بھوکا احساس ہڑکنے لگتا ہے
تب میری مریمیت اس کو بہلاتی ہے
اور میرے اندر کی سارہ
ان پیاسی آشاؤں کے لئے
کہیں ساگر ڈھونڈنے جاتی ہے
مجھے اپنی ماں یاد آتی ہے

محمد ذاکر نسیم



درخت اور بارش

اپنے سرسبز و شاداب درخت کاٹ دو
موسم کی بارش ہونے والی ہے
اس بارش میں
موتی برسیں یا پکھراج
مجھے کچھ نہیں ملے گا
اِس سے پہلی بارش میں
اِس نے اپنے صحن کا درخت
گھنے سائے کی امید میں کاٹ دیا تھا
اُس بارش میں مَن برسا تھا
لیکن وہ درخت سوکھ گیا

برگد کا پیڑ

رات کے آخری لمحے اور تیری یاد
میں سوچتا ہوں
رادھا کل سَتی ہو گئی
مگر حقارت و نفرت، ہجر و وصال
محبّت زندہ باد
رحمدلی، سنگدلی، شرافت، پاکیزگی اور عصمت دا
ہرن اور برگد کا پیڑ
بہتر کیا ہے ؟
لوگ محبت کریں کہ ڈریں !

محمودیہ غازیہ

نئے لمحوں کی خوشبو

سازو آہنگ کی اس محفل میں
نغمہ و لے کی صدا جانے دو
چھوڑو تسبیح کے دانوں کا شمار
بند دروازوں کے پیچھے دیکھو
اس اندھیرے میں
نئی چاہ کی خوشبو دیکھو
آنکھیں کھولو
پھر زمین چیر رہے ہوں گے کسان
اپنے ہی خون میں نہائیں گے یہ مزدور نئے
دھوپ اور چھاؤں میں اللہ ہے
مزدوروں کے ساتھ
دھوپ اور چھاؤں میں اللہ ہے
کسانوں کے بھی ساتھ
یہ جو دستار ہے مکّاری کا سمبل
پھینکو!
یہ لبادہ ہے نئے مکر کا جال
تم اسے پھینک بھی آؤ
مزدوروں کی مانند اٹھو
مٹی میں ملو
محنت کا ثمر بن کر جیو

جب گلاب واپس آئے گا

صرف ایک سرخ چہرے کے لئے

جس نے مجھے جلا کر راکھ کر دیا

وہ سرخ چہرا کب قریب آئے گا، اور جواب دے گا

اس کو جس کے شعلے اپنی چمک کھو بیٹھے ہیں

وہاں جہاں ناکام چاہنے والے ملتے ہیں

آہوں کا تبادلہ کرتے ہیں

بغیر آنسوؤں کے زرد صحبتوں میں

جہاں خوشی بھولی جا چکی ہے اور

امید نڈھال ہے

ایڈرینارچ
ظہیر پراچہ



آغاز

جاگتی آنکھوں
زخموں سے داغ داغ پلستر میں لپٹ کر زندہ رہنا
اور وہ بھی اس وقت جب برف زمین پر سفید تہیں بچھا رہی ہو
ایک کڑا مرحلہ ہے
کہ تب کسی فیصلے کی توسیع ممکن ہے نہ کچھ اور :
مکڑی کے جسم میں تاگے کی بُنت
جالے کے پہلے عنصر یا روشن کل کا علم
یا پھر باورچی خانے میں ماچس کی تیلی کے آتشیں مستقبل کا احساس
کچھ بھی تو ممکن نہیں مگر رفتہ رفتہ ——— انچوں میں
میں اپنی زندگی کو ضبط تحریر میں لا رہی ہوں ، لمحہ بہ لمحہ ، لفظ بہ لفظ
بس میں ایک ضعیفہ کی برہمی کا مشاہدہ ہو یا
سیپوں پر بنی لکیروں کا شمار
آئس کیوب میں ہوا سے بنی لکیروں کی گنتی
یا پھر ناموجودگی کی موجودگی کا تصور
یہ نظم یا ہماری زندگیاں

(۲)

برابر والے کمرے میں ایک شخص سو رہا ہے

ہم اس کے خواب ہیں
اس لئے کہ چھاتیاں عورتوں کی چھاتیاں ہیں اور سر عورتوں کے سر ہیں
اور کہ ہم شکار کے پرندوں کے بدن رکھتی ہیں
مگر جب ہم تمباکو نوشی میں یا اس گفتگو میں مصروف ہو گئیں کہ زندگی کیسے بتائی جائے
تب وہ بڑبڑا کر کروٹ بدلتا ہے
برابر والے کمرے میں محو خواب شخص کے خوابوں میں ایک نیورو سرجن داخل ہوتی ہے
اور اس کے ذہن کی چیر پھاڑ شروع کر دیتی ہے
وہ اپنے کام میں مگن ہے
وہ نرس کی طرح مہربان نظر نہیں آتی
بلکہ اس کا چہرہ مادام کیوری کی طرح روکھا لیکن پاکیزہ ہے
وہ ہم میں سے نہیں یا ممکن ہے ہم میں سے ہی کوئی ہو

برابر والے کمرے میں ایک شخص سو رہا ہے
اس نے تمام دن کالے تالاب کے کنارے کھڑے ہو کر پتھر پھینکنے میں گزارا ہے
تاکہ اس کی کالک قائم رہے
اس کے خوابوں کے ہالے کے باہر ہم ہاتھوں میں ہاتھ دئے ٹھوکریں کھاتے ہوئے
پہاڑوں پر چڑھ رہی ہیں
ٹھوکریں کھا کر ایک دوسرے کی راہنمائی کرتے ہوئے
ہم داغدار آتش فشاں پر چڑھ رہی ہیں



قلیوں رہنے دو

اصغر ندیم سید

عام سے عاشق کا گیت

میرے میٹھے گلاب
مجھ سے محبت نہ کرو
جیسے اپنے سائے سے کرتی ہو
کہ سائے شام کو فنا ہو جاتے ہیں
اور میں تمہیں صبح صادق تک لے جانا چاہتا ہوں

چاولوں کی طرح بھی نہ چاہو
جنھیں ایک دفعہ کھانے کے بعد جی اوب جاتا ہے
ظالم انگریزوں کی طرح بھی نہ چاہو
کہ وہ جلدی ہی ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں
شہد کی طرح بھی نہیں!
میٹھا تو ہوتا ہے لیکن محبت عام سا ہے

اور نہ ہی کالی مرچوں جیسی محبت کرو
جو پیٹ میں آگ لگا دیتی ہیں
مجھے خوبصورت خواب کی طرح چاہو
اس طرح میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکوں گا
تمہاری زندگی کی رات کی امید دن میں
اگر میں بھوکا رہ گیا
تھوڑے پیسوں کی طرح ہمیشہ میرے ساتھ زمین پر رہے
اور نظم سفر کے لئے
ایک وفادار کامریڈ

تکئے جیسی محبت بھی نہ کرو
جس پر ہم گھنٹوں ایک ساتھ رات کو سو تو سکتے ہیں
لیکن صبح ایک دوسرے سے ملنے کی حاجت کم ہو جاتی ہے

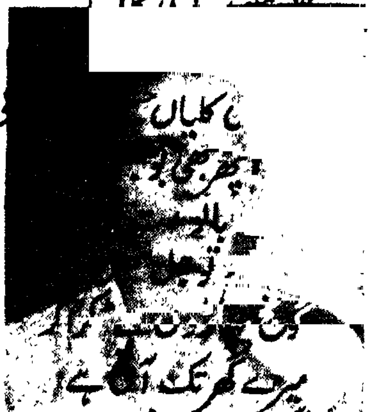
کالا باش دریا کی طرح
جو پانی گراتے وقت گھٹا ہوا ہوتا ہے
میرگشار کے لئے مہمیز بن جاتا ہے

نگار صہبائی

[illegible]

گیت تیاگ

چونک پڑے ہیں سوئے ہوئے تھے
اوڑھ کے تارے چادریا
پچھلی رات کو کس نے آ کر
[illegible]



[illegible] کلیاں [illegible]
[illegible]
میرے گھر تک [illegible] ہے
★ گیت سنانے والا چپ ہے
چوری ہو گئی بانسریا

[illegible]
دھوپ [illegible]
اندھیارے [illegible]
ہولے ہولے [illegible]
پل کے [illegible]
میں [illegible]
بیتے [illegible]
من میں [illegible]
روپ میں [illegible] ہیں ساوریا

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
رات [illegible] کنگنا
کیسی باتیں کرتے ہو

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

★ [illegible] کے طفیے۔

نگار صہبائی

گیت

رین باٹ پہ جھل مل جھل مل
دور تلک کیوں دیپ جلے
کون گیا تھا پیا ملن کو
دھند بھرے پیڑوں کے تلے

پاپ اور پن کے بیچ تھے کتنے
دیپ تو جلتا بجھتا تھا
بند انگیا کے کھول دیے تھے
پران کا درپن دھندلا تھا
اک پل نے جو تجھے دیا تھا
دوجے پل نے چھین لیا
بن میں جا کر سو گئی ندیا
سپنے کیوں لگتے ہیں بھلے

کون سی چنری دی تھی سجن نے
انگ پہ کیا کیا رنگ سجے
دھوئے تھے کس ہنستے جل میں
بن مہندی کے پاؤں رچے
جب دو آنگن ملتے ہیں تو
گھر کی شوبھا بڑھتی ہے
سورج اور دیوار ہیں جیون
چھایا دونوں اور ڈھلے



پُروا کی ساڑی پہ ٹنک کر
پھول وہ کام دکھاتا ہے
تن چوکھٹ پہ بیٹھا خود کو
من کیا کیا سمجھاتا ہے
آنے جانے والے جھونکے
دیکھ کے اس کو ہنستے ہیں
پر ہنسنے والے کیا جانیں
لہر چلے تو ناؤ چلے

☆

نگار صہبائی

گیت

گونج ہواؤں سے رستی ہے
میرے پاس بھی بنسی تھی
مٹ گیا میں تو امر ہے وہ پل
جب میں نے لے سیکھی تھی

سانجھ کی بیلا جاتے جاتے
کر کے کیا جنجال گئی
چنتے چنتے ادھ کھلی کلیاں
پلّو میں سب ڈال گئی
بہتا پانی نہار رہا تھا
اس کی پوجا کیسی تھی
پروا جس کے نام کا دیپک
سر پہ رکھ کے چلتی تھی

رات ستاروں پر سوئی تھی
تو کس گھائل من میں تھا
اجڑے بن میں آگ لگی تھی
ملن ٹھکانا جل نہ سکا
چھایا میری سورج میرا
بادل کو کیا سوجھی تھی
وہی سگندھ ہے روح میں اب تک
تو نے چوٹی گوندھی تھی

پیڑ گرا کر بور سے پہلے
خوش ہے کتنا لکڑہارا
دھرتی میں سب اتر گئے پھل
کیا جانے یہ بے چارا
دھرتی سب کی جنم دیا ہے
آدم کی کیا شکتی تھی
دیر تھی بھگون کے کہنے کی
ورنہ دھرتی کس کی تھی

٭

۱۴ سیپ کراچی

نگار صہبائی

گیت

بیتے جیون کی گلیوں سے آنے لگی
کیسی کوئل پکار
من کے آنگن میں چھم چھم پڑے ہے پھوار

باڑھ ساگر میں آنے لگی جوت کی
کس کے مہندی لگی آتما کھل گئی
ہنستی رت مجھ سے کہہ کے گئی بار بار
اب تو ترسو گے سننے سریلی پکار
کوئی آیا نہ ہو میرے من کے دوار
رک گئی ہے بہار

رات چادر ستاروں کی اوڑھے ہوئے
کیا دبے پاؤں گزری ہے انگنائی سے
میرے گیتوں میں پھر سے وہی لے اتار
[illegible] سرہانا بنے ایک بار
[illegible] گیتوں میں پائل کے بجتے ستار
[illegible] انتظار

[illegible] میں مکھڑا تو سندر لگا
[illegible] آگیا ہو نہ آنچل ترا
[illegible] کر سیج دیکھیں آر پار
[illegible] کے ہوتے ہیں نیناں [illegible]
تن کی مٹی سے برتن بنائے کمہار
نین ساگر کے پار

گیت

ہرے ہرے ری رات
سیب، کھِلے انجیر، آلوچے ...، سیّاں سکھی کا ساتھ
[illegible]

ساگر کے نیلے پانی [illegible] جوت
باڑی بنواڑی میں مہکے باس بتی کی روت [1]
سُرخ [illegible]
کرنوں کی [illegible]
جھیلیں، [illegible] ... [illegible]

گندھ سگندھ سے چمپا چھولے، پھولے ہار سنگھار
رُوپ [illegible] ... [illegible]
[illegible]

ندی کنارے [illegible]
سُکھ کنجن میں نین کنول دو، سکل ... سیجیت سبھاؤ
مٹی، گوبر [illegible]
راج [illegible]
سپنوں کے [illegible]

بادل، برکھا، مور
بندھن سنگ سُہاگ کے سندھن پنچھی، پیڑ، جزیرے
سیپ کے پران میں موتی منکے ... دھیان کے گیان میں ہیرے
گُر کا سمندر روح کے اندر ناری کے گُن ناتھ

ہرے ہرے ری رات

[1] پہیری

ناصر شہزاد

گیت

پہلے مکھ اِس جانب موڑ　　پھر سرسوں کی گندل توڑ
　　پہلے مکھ اِس جانب موڑ

کل چوپال میں رات ڈھلے　　کون ملے، برگد کے تلے
جم گیا ندیوں کا پانی　　تھم گئی وقت کی طغیانی
شرماہٹ، گھبراہٹ چھوڑ　　پھر سرسوں کی گندل توڑ

کیسری، کاہی، چمپا وتی　　تجھ پہ سجیں ملبوس سبھی
رنگ کے جھلا، رس کے ریچ ۱　　لاگ، لگن پھولوں کی سیج
جوگ، جتن سے جیون جوڑ　　پھر سرسوں کی گندل توڑ

سرخ چٹانیں، بھوری ریت　　نیلا ساگر، سرد، بیچیت
کلیاں، کانٹے، گنڈ، کریر　　تیرا میرا ایک سریر
من کی شوبھا تن پر اوڑھ　　پھر سرسوں کی گندل توڑ

۱ [illegible] اردو (از انگریزی)

ناصر شہزاد



گیت

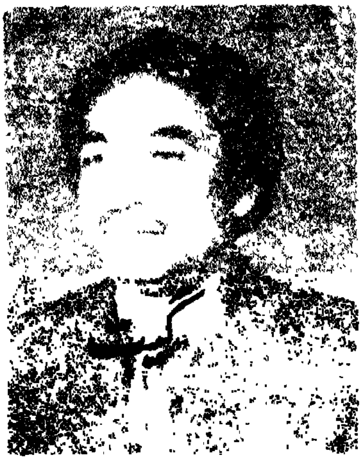
تو رادھا اپنے رام کی   جیسے مال سدا اُس نام کی
تو رادھا اپنے رام کی

تیرے کشٹ نے کنٹھ کو جیتا ہے   تیری گتیا، پیا کی کویتا ہے
تیرا دھوبن چوکھا اور چوکا   تیرا تن سندھن کھلتے جوکا
تیرے بھیتر بھگتی شام کی   تو رادھا اپنے رام کی

تیرا کاشی، کاہن کا گاؤں   تیرے تیرتھ، پریتم کے پاؤں
تیرا گوکل کھیتیاں کھلواڑے   جمناتٹ تال اور تلواڑے
تیرے دھیرج دھج بسرام کی   تو رادھا اپنے رام کی

تیرے سنگ سہاگ کی رکھوالی   تیری مرگ نیین اکھیاں کالی
تیری باہوں کے لمبے گھیرے   موہن سے جنم جگ کے پھیرے
تیرے مکھ پوجا پرنام کی   تو رادھا اپنے رام کی
جیسے مال سدا اُس نام کی

ناصر شہزاد



گیت

تمرے رنگ رنگے مورے نین — آوت ناہیں تم بن چین
تمرے رنگ رنگے مورے نین

گورا سونا سرسوں کا — تم سے پیار ہے برسوں کا
کھیتوں میں نتھرا پانی — مکھ گورا، چندری دھانی
سیج پہ کانٹے بکھری رین — تمرے رنگ رنگے مورے نین

چاند جٹاؤں پر دمکے — پھلواری میں چمپا مہکے
آنگن میں ناگ چلا جائے — ڈیوڑھی میں چھپا کھاٹ بچھائے
منوا کرے رک رک کر بین — تمرے رنگ رنگے مورے نین

گلی میں برہن بھٹکے نس — کنویں پہ ڈھولک کھیلے تابش
ندی کے تٹ کو بجرن کا شور — انکھیاں ہیں ان کی جیسے چور
تم سوامی، تم سنگت سین — تمرے رنگ رنگے مورے نین

سلیم کوثر

گیت

تمہیں جانا تھا
تم چلے گئے
وہ موسم بھی
اب نہیں رہے
خالی رستے تکنے والی آنکھیں ہیں
اب کوئی [illegible] سے کوئی [illegible]
پہروں سوچ میں [illegible] رہنا
راہ [illegible]
کسی [illegible] روک کے پوچھے
تجھ کو پوچھا کرنا
وہ دن بھی اب تو
خواب ہوئے
بعد تمہارے
جانے اب ہوتے
تنہا جلتے بجھتے والی راتوں میں
اب کوئی تم سے کوئی نہیں
یادوں کی دہلیز پہ آ کر
سر رکھ کر سو جانا
خود سے تیری باتیں کرنا
نیند میں چلتے رہنا
اب باتیں کرنا
بھول گئے
ہم سینے [illegible]
بھول گئے
یادوں کا سناٹا ہے اور راتوں میں
اب کوئی نہیں ہے کوئی نہیں

سلیم کوثر

گیت

[illegible] آنگن میں دریا ہے
دریا میں کچھ موجیں ہیں
اور موجوں میں آنکھیں ہیں
پلک جھپک نہ پائیں
تیری یاد دلائیں
ساحل ساحل جگمگ کرتی ریت ہولے اُچھے
دُور کہیں تاروں کی کشتی ڈوب ڈوب کر اُبھرے
ایک سمندر ایسا ہے جو دریا میں آ نکلے
دریا میں اک دُنیا ہے
دُنیا میں تصویریں ہیں
تصویروں میں آنکھیں ہیں — پلک جھپک نہ پائیں
تیری یاد دلائیں
جھل مل کرتے پانی پہ کچھ دیپ سے جلتے جائیں
ہرے بھرے پیڑوں سے لپٹے بادل دھوپ نہائیں
تیز ہوائیں دریا کو موسم کے بھید بتائیں
دریا میں اک صحرا ہے
صحرا میں دیواریں ہیں
دیواروں میں آنکھیں ہیں
پلک جھپک نہ پائیں — تیری یاد دلائیں



پانی کی لہروں میں بھیگتے رہتے تھے دو سائے
موسم کے دُکھ اس سے پوچھو جو تنہا رہ جائے
اک سایہ بچھڑا تو اب دریا میں کون نہائے
دریا میں اک رستہ ہے
رستے میں آوازیں ہیں
آوازوں میں آنکھیں ہیں
پلک جھپک نہ پائیں
تیری یاد دلائیں

مضامین



خواب اور حقیقت کا شاعر

احمد ہمدانی

شاعری انسانی رشتوں کے درمیان اظہار پاتی ہے اور انسانی رشتے مخصوص تصوّرِ حیات کی بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں۔ روایتی معاشرہ زندگی کا ایک ماورائی تصور رکھتا تھا اور تمام انسانی رشتے اسی ماورائی تصور پر قائم تھے لیکن جب روسو نے ان تمام رشتوں کو زنجیریں قرار دے کر ان سے آزادی کا نعرہ لگایا تو انسانی رشتوں میں ایک انتشار نے جنم لیا۔ انتشار کے اس عالم میں انسانی رشتوں کی اس تشکیلِ نو کی ذمّہ داری کو محسوس کیا اور تشکیلِ نو کے عمل میں ماورائی سے زیادہ زمینی جہت کو اہمیت دی۔ روایتی اور غیر روایتی میں بس یہی فرق ہے کہ ایک کی جہت ماورائی ہے اور ایک کی زمینی، ایک طرف سکون کو اہمیت ہے اور دوسری طرف حرکت و تغیر کو۔ ایک کی شناخت تنظیم ہے دوسرے کی انتشار۔ اب اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ غیر روایتی یا جدید کی شناخت انتشار ہے تو امید فاضلی جدید شاعر نہیں ہے۔ وہ انتشار کی فضا میں سانس تو لے رہا ہے مگر اس کا وجود تنظیم کے ذائقہ سے نابلد نہیں ہے۔ وہ انتشار کو منزل نہیں بلکہ سفر ہی کا ایک مرحلہ جانتا ہے۔ اور اس کا یہی احساس اس کو بہت سے جدید شاعروں سے ممتاز کر دیتا ہے۔

کوئی ذرا امید سے پوچھے اس کو آخر کیا دکھ ہے　　ساتھ لئے کچھ زخمی نیندیں رات گئے گھر آتا ہے

یہ زخمی نیندیں، اسے انتشار کے بے برگ و گیاہ بیاباں سے نہیں تو کہاں سے ملی ہیں، وہ انتشار کے معاشرے کا آدمی ہے لیکن فراق کی طرح اس کا دکھ یہ ہے کہ وہ گلے گلے انتشار میں دھنس کر بھی تنظیم کے ذائقہ کو نہیں بھلا سکا۔ تنظیم کے ذائقہ کو نہ بھلانا اس کے لئے بھی ایک نیک فال ہے اور اس کی شاعری کے لئے بھی اچھا شگون۔ وہ حالات سے آنکھیں چرانے کے بجائے ان سے مقابلہ کرنے کا قائل ہے اور اس کی اسی خصوصیت نے اس کی شاعری میں ایک حوصلہ مندی پیدا کر دی ہے۔

جو تیر اندھی ہوا نے چلائے تھے کل رات　　نہ ہوتے ہم تو نہ جانے کدھر گئے ہوتے

وہ مسلسل اندھی ہوا کے تیر کھا رہا ہے لیکن خوش ہے کہ ان تیروں سے بہت سے دوسرے لوگ بچے ہوئے ہیں۔ یہ زمانے سے سینہ سپر ہونے کا عمل ہے جو کہ زندگی کے صحت مند رویہ [illegible] ہے۔ امید دکھوں کو تبرک کی طرح تقسیم بھی نہیں کرتا بلکہ جو کچھ اس پر گزرتی ہے خود سہہ لیتا ہے۔ میں اس کو تقریباً چالیس سال سے جانتا [illegible] وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے دکھوں پر روتا بسورتا کبھی نہیں پھرتا۔ اس پر بڑے [illegible] کڑے وقت آئے لیکن اس نے کبھی حوصلہ کا دامن نہیں چھوڑا اور اپنی وضع میں کبھی فرق نہیں آنے دیا۔

اسے شاعری سے شغف ہی نہیں بلکہ عشق ہے ... نے کیا کیا ستم ... سامنے مگر ایک لمحے کو بھی خیال خمر اور اظہار صداقت سے غافل نہیں ہونے دیا ... غرض ہر لمحہ تقاضائے شعر ... اچھا شعر سن کر اس کی آنکھوں میں جو چمک اور چہرے پر ... نظر آتی ہیں وہ دراصل شاعری ہے اس کی وابستگی ... شاعری سے اس بے پناہ لگن نے اس میں سہار کی ایک ایسی قوت ... پیدا کر دی ہے جس سے اس کی شاعری ... ہے اس کے یہاں حوصلہ مندی کی یہ آواز صرف برائے شاعری نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی سے پھوٹی ہے۔ ... اور مزا بھی۔

[illegible]

[illegible]

کی صورت گری کرتا ہے تو دراصل اپنی ہی صورت گری کرتا ہے ... [illegible]

میں حرف حرف میں اُترا ہوں روشنی کی طرح ۔۔۔ سو کائنات کا چہرہ نظر بھی آتا ہے

وہ کائنات میں خود کو اور خود میں کائنات کو دیکھنے کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ جدید عہد کا ترجمان اور جدید احساس کا حامل ہوتے ہوئے بھی ایسا جدید نہیں جو انتشار اور افراط و تفریط کی صورت حال سے مغلوب ہو کر خوف، دہشت اور شکستگی کے لامتناہی اندھیروں میں گم ہو جائے۔ ... بے نیاز ہو کر اندھیرے میں دیئے جلانا اس کا شیوہ ہے۔ اور یہ شیوہ اسے انسانی تہذیب کی روایت سے ملا ہے۔ وہ اپنے ماضی کا احترام اور اپنے عہد کا سامنا کرنا جانتا ہے۔ اور یہی خصوصیت اس کی شاعری کو دوسروں کے لئے بامعنی اور اہم بناتی ہے۔ وہ ... ذات کو کائنات سے الگ کر کے نہیں دیکھتا۔ اس رشتہ ہمدمی کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے جو اشیاء و مناظر اور انسان ... قدم قدم پر نظر آتا ہے۔

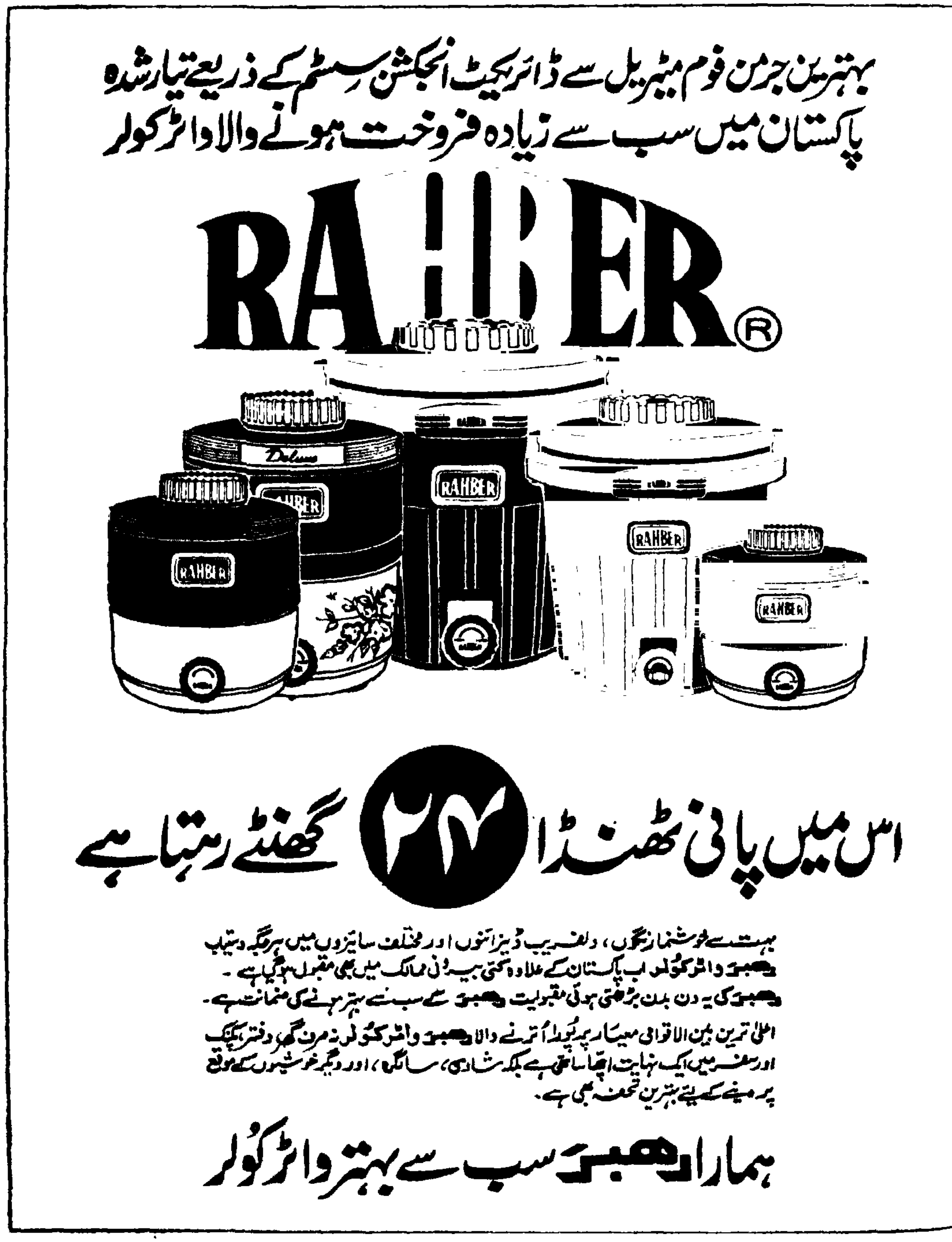
اپنی فضا سے اپنے زمانوں سے کٹ گیا ۔۔۔ پتھر خدا بنا تو چٹانوں سے کٹ گیا

... ۔۔۔ اب سوچتا ہوں کیا مرے شانوں سے کٹ گیا

... پھرتے ہیں ... اٹھائے ہوئے ... ۔۔۔ شاید زمیں کا ربط خزانوں سے کٹ گیا

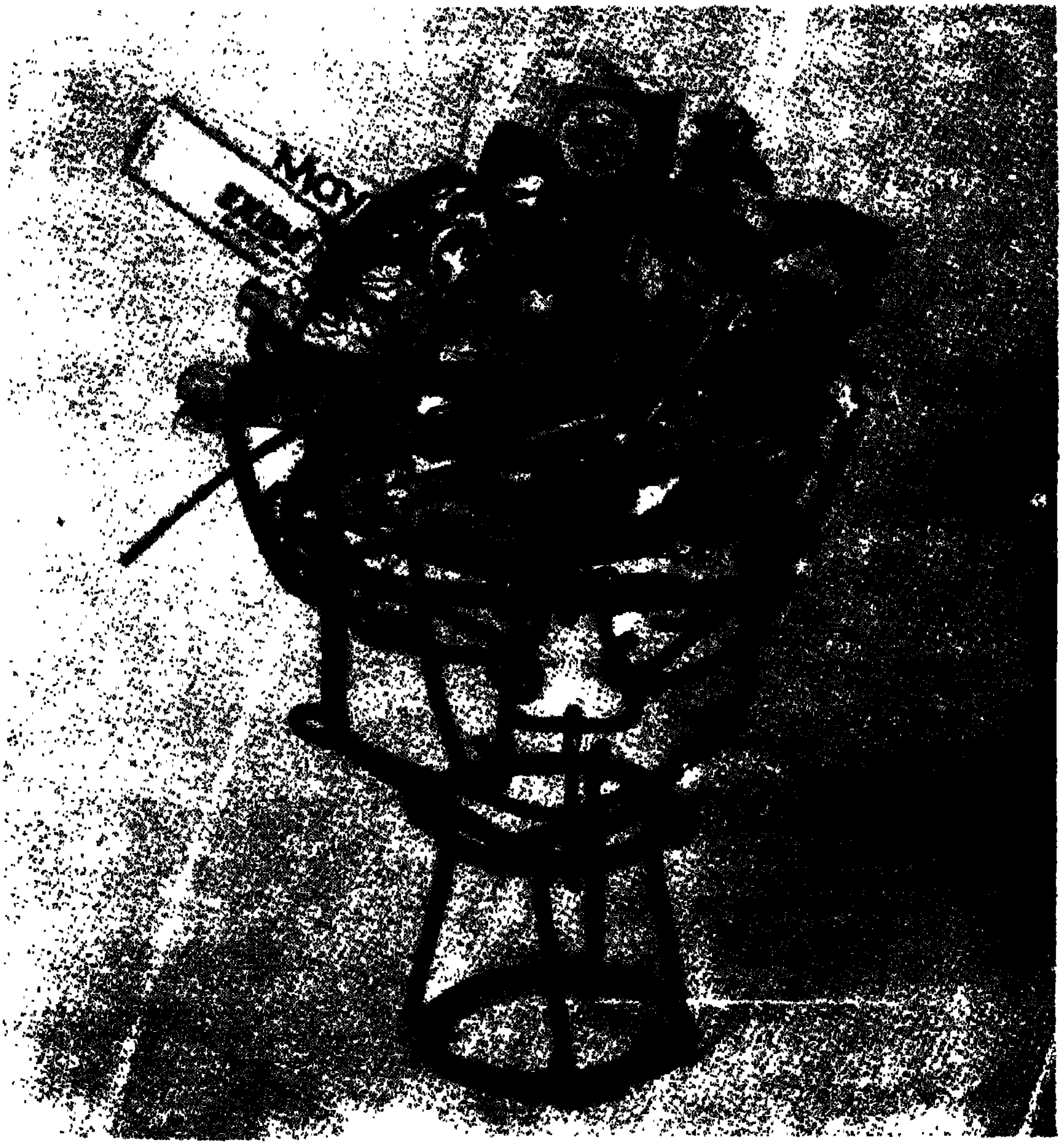
مل کر جدا ہوا تھا کوئی اور اس کے بعد
ہر ایک لمحہ اپنے زمانوں سے کٹ گیا
یادوں کی گھنی چھاؤں بھی رخصت ہوئی گھر سے
اِک اور سفر کے لئے لوٹ آؤ سفر سے
اُسے خبر بھی نہیں جس کو ہم نے چاہا ہے
تمام عمر ہواؤں میں جال پھینکا ہے
سب اپنی پیاس بجھانے کی کوششوں میں رہے
کوئی نہ سمجھا سمندر کی تشنگی کیا ہے
خود اپنے دکھ کے سمندر کو چکھ رہا ہوں میں
جو زہر مجھ میں بھرا ہے مجھی کو پینا ہے
ملی ہے مجھ کو وہیں حرف زندہ کی صورت
جہاں مجھے مرے پھیلاؤ نے سمیٹا ہے

پھیلاؤ میں سمٹنے کا عمل ہی زندگی کو بامعنی بناتا ہے اور اسی معنویت سے شاعری پیدا ہوتی ہے۔ فنی مسائل ہمیشہ تصورِ حیات سے پیدا ہوتے ہیں، اور جب ہم روایتی اور غیر روایتی فن میں تمیز کرتے ہیں تو ہم دراصل روایتی اور غیر روایتی تصوراتِ حیات کے مابین امتیاز کی وضاحت کرتے ہیں۔ فن دنیائے معلوم کی وہ دولتِ بیدار ہے جس کی تعریف جہانِ معلوم کی اشیا کی طرح ممکن نہیں۔ چنانچہ شاعری کے بارے میں جتنی بھی تعریفیں بیان کی جاتی ہیں وہ سب معلوم کے زُمرے میں آتی ہیں حالانکہ شاعری نامعلوم کی چیز ہے۔ اب اس نامعلوم کے زمرے میں روایتی اور غیر روایتی کا فرق کرنا ایک غیر منطقی عمل ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ نامعلوم کی یہ دولتِ بیدار اپنا اظہار معلوم میں کرتی ہے۔ معلوم جو لمحہ لمحہ تغیر پذیر ہے اور ہر تغیر اپنے ساتھ کچھ تصورات لاتا ہے جو پچھلے تصورات سے مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ بدلتے ہوئے حالات اور بدلتے ہوئے تصورات میں تمیز کرنا ممکن ہے اور انہی حالات و تصورات کے حوالے سے تعبیر و تشریح میں فرق ہوتا ہے لیکن شاعری بجنسہٖ ہر تعریف سے ماورا ہے لیکن حالات و تصورات کے درمیان اس کی شناخت اور اثر انگیزی کے معیار بنائے جا سکتے ہیں اور بنائے جاتے رہے ہیں۔ شناخت اور اثر انگیزی کے یہی معیار، روایتی اور غیر روایتی شاعری میں امتیاز پیدا کرتے ہیں، چنانچہ جب ہم میرؔ اور فراقؔ کی شاعری میں فرق کرتے ہیں تو یہ شاعری کا فرق نہیں بلکہ ان معیارات کا فرق ہے جو زندگی کے مختلف تصورات کی وجہ سے میرؔ اور فراقؔ کے زمانوں میں تشکیل پاتے ہیں۔ امیدؔ بھی فراقؔ کے عہد کا شاعر ہے۔ اور اس کی شاعری بھی اس کے شعوری یا غیر شعوری تصورِ حیات ہی سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ زندگی کی حقیقت کو اس کے خوابوں اور زندگی کے خوابوں کو اُن کی حقیقت میں سموتا رہتا ہے اور شاید خواب و حقیقت کے سمونے کے عمل کا نام شاعری ہے۔



بہترین جرمن فوم میٹیریل سے ڈائریکیٹ انجکشن سسٹم کے ذریعے تیار شدہ
پاکستان میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والا واٹر کولر
RAHBER®
Deluxe
RAHBER
اس میں پانی ٹھنڈا ۲۴ گھنٹے رہتا ہے
بہت سے خوشنما رنگوں، دلفریب ڈیزائنوں اور مختلف سائزوں میں ہر جگہ دستیاب رہبر واٹر کولر اب پاکستان کے علاوہ کئی بیرونی ممالک میں بھی مقبول ہو گیا ہے۔
رہبر کی یہ دن بدن بڑھتی ہوئی مقبولیت رہبر کے سب سے بہتر ہونے کی ضمانت ہے۔
اعلیٰ ترین بین الاقوامی معیار پر پورا اترنے والا رہبر واٹر کولر نہ صرف گھر، دفتر، پکنک اور سفر میں ایک نہایت اچھا ساتھی ہے بلکہ شادی، سالگرہ، اور دیگر خوشیوں کے موقع پر دینے کے لیے بہترین تحفہ بھی ہے۔
ہمارا رہبر سب سے بہتر واٹر کولر
manhattan international


Tuk is
a Happy
sound
Be Happy
HAPPY
biscuits
HAPPY
HAPPY
HAPPY
MNJ





مغرب میں احیائے علوم

ڈاکٹر انور سدید

سولھویں صدی عیسوی میں یورپ نے تخلیقی سطح پر جس کلبلاہٹ کا اظہار کیا تھا وہ بالآخر مغرب کی ایک عظیم تحریک احیاء العلوم کی صورت میں سامنے آیا۔ اس تحریک کی تخلیقی سرگرمی کا اظہار سب سے پہلے اٹلی میں ہوا۔ پھر فرانس اور جرمنی اس کے زیر اثر آئے آخر میں انگلستان نے اس کے اثرات کو ملکہ الزبتھ کے عہد میں قبول کیا۔ تو اس تحریک کی روح یورپی زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کر گئی۔ اس تحریک نے چونکہ روم اور یونان کے موفون خزینوں کو نئی معنویت دی تھی اور اس نئی معنویت سے بہت سی اقوام نے یکساں استفادہ کیا تھا اس لئے بیشتر مفکرین نے اسے نشاۃ ثانیہ کا نام دیا اور اسے ایک باقاعدہ تحریک تسلیم کرنے کے بجائے ایک قسم کی تخلیقی فضا سے تعبیر کیا[1] جو پورے یورپ پر چھائی ہوئی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نشاۃ ثانیہ کے اثرات زندگی کے کسی ایک شعبے تک محدود نہیں بلکہ یہ ابال اجتماعی نوعیت کا تھا جس نے یورپ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ چھاپہ خانہ کی ایجاد[2] بارود کی دریافت اور مقناطیسی گھڑی کی ایجاد نے زندگی کے سابقہ دھارے کو ایک نئے رخ پر ڈال دیا تھا۔ اس زمانے میں واسکوڈے گاما نے ہندوستان پہنچنے کا نیا بحری راستہ تلاش کیا[3] حکمت ارسطو کے مطابق زمین مرکز کائنات تھی اور انسان اشرف المخلوقات تھا۔ کوپرنیکس نے اس وسیع کائنات میں زمین کو محض ایک ذرہ قرار دیا جو اپنی روشنی سورج سے مستعار لیتا تھا اور اسی کے گرد حرکت کر رہا تھا۔ کائنات کے اس نئے تصور نے انسان سے بلند و برتر ہونے کا اعزاز چھین لیا اور اس کے سابقہ نظریات کی کایا پلٹ دی۔ اور کولمبس نے امریکہ کا نیا براعظم دریافت کر لیا۔ گلیلو نے ارسطو کی منطق عقلی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کائنات کے بارے میں بعض مذہبی نظریات پر شدید ضرب لگائی گلیلو نے عملی تجربے کو استدلال کی اساس بنا کر سائنس کی دنیا میں بھی انقلاب بپا کر دیا۔ کلیسا میں مروج بداخلاقیوں اور بداعمالیوں نے مارٹن لوتھر کو بغاوت پر اکسایا[4] اور کلیسا کی خود ساختہ حاکمیت کو شکست دی۔ اہم بات یہ ہے کہ اس زمانے میں زراعت کے کار سست رفتار کے مقابلے میں تجارت کے عمل تیز رفتار کو فروغ حاصل ہوا اور متوسط طبقے پر مشتمل ایک ایسا معاشرہ وجود میں آنے لگا جس کے سابقہ اعتقادات کو متذکرہ اسباب نے متزلزل کر دیا تھا۔ تغیر کی یہ سب قوتیں بیک وقت یورپ بھر میں عمل پیرا

ص۱ ڈاکٹر وزیر آغا تخلیقی عمل۔ صفحہ ۱۳۶ ڈاکٹر جمیل جالبی ارسطو سے ایلیٹ تک۔ صفحہ ۲۰ ص۲ جے۔بی۔ پریسٹلے۔ لٹریچر اینڈ ماڈرن مین صفحہ ۳ ص۳ ہاڈسن۔ مین کرنٹس آف انگلش لٹریچر صفحہ ۰ ص۴ کزامیاں۔ اے ہسٹری آف انگلش لٹریچر صفحہ ۲۱۱

تھیں۔ ان کے پیچھے صدیوں کا سناٹا اور جمود کی فضا تھی جس پر کسی تحرک قوت نے کبھی اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تاہم عملی تقلیب کے تین اہم عناصر یعنی مذہب، فلسفہ اور سائنس نئے نظریات سے متصادم تھے اور ایک نئی معنویت کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک اپنی انفرادی سطح پر جامد فضا کا مہر سکوت شکستہ کرنے پر آمادہ تھا۔ اس سارے ماحول کے پس پشت فعال اور خلاق شخصیتوں کی اتنی بڑی تعداد مصروف عمل تھی کہ ساری فضا برق زدہ نظر آتی ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں کسی نہ کسی تحریک کا بیج پھلتا پھولتا دکھائی دیتا ہے۔ مختلف علوم کی یہ تحریکیں چونکہ بیک وقت رونما ہوئیں اور ان کی بدولت معاشرہ کُلیۃً منقلب ہوا اس لئے ان کے اجتماعی عمل کو نشاۃ ثانیہ کا نام دیا گیا۔ اہم بات یہ ہے کہ فلسفہ سائنس اور مذہب کے نئے نظریات نے سب سے زیادہ ادب کو متاثر کیا۔ چنانچہ عقیدے کی تنگ خیالی پر ادب و فلسفہ کی آزادہ خیالی نے فوقیت حاصل کی۔ اجتماعی سطح پر قومیت کا اور شخصی سطح پر انفرادیت کی نمو کا رجحان پیدا ہوا۔ ان سب کے تخلیقی اظہار کیلئے ہر ملک نے اپنی قومی زبان کو متمول بنانے اور اسے ابلاغ عامہ کا بنیادی وسیلہ بنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ وہ معنویت جو سولہویں صدی کے متنوع تغیرات کا بدیہی نتیجہ تھی جب نکھر کر سامنے آئی تو اس کے ساتھ زبان اور ادب بھی منقلب ہوئے اور اسلوب کا نیا انداز بھی وجود میں آیا۔ اور اس نے اپنے عہد کے علاوہ مستقبل پر بھی اتنے روشن نقوش ثبت کئے کہ اسے تحریک احیاء العلوم کہنے میں کوئی امر مانع نظر نہیں آتا۔

چودھویں صدی کے وسط میں جب قسطنطنیہ کا سقوط ہوا[۱] تو یونانی مفکرین اور ان کی تصانیف یورپ میں بکھر گئیں۔ یہ ایک عہد کا خاتمہ تھا تو ایک اور نئے دور کا آغاز بھی تھا۔ چنانچہ اس نشاۃ ثانیہ کا پہلا سورج اطالیہ کی سرزمین سے ابھرا اور ریحان رافیل، مائیکل اینجلو اور لیونارڈو ڈاونچی جیسے عہد کی روح کو اس طرح جزو حیات بنایا کہ اس کا عکس ان کے زندۂ جاوید فنی شاہکاروں سے منعکس ہونے لگا۔ میکیاولی نے بدنام زمانہ کتاب "پرنس" لکھی[۲] اور اس کے گرد منافقت کا کالا تاگہ لپیٹ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب نے اخلاقیات کا جو مضبوط ڈھانچہ تعمیر کیا تھا اس کتاب نے اس کی تمام قدروں کو توڑ دیا۔ اطالیہ میں احیاء العلوم کی شمع برداری کا فریضہ زیادہ تر مصوروں اور مجسمہ سازوں نے سرانجام دیا تھا۔ لیکن فرانس میں یہ پرچم ادیبوں نے تھاما۔ رابیلے اور مانتین اسی لحاظ سے بے حد شہرت رکھتے ہیں کہ انہوں نے احیاء العلوم کی تحریک کی افزائش میں ہراول دستے کا کام کیا۔ اور فرانس کے داخلی انتشار، سیاسی خلفشار، مذہبی اختلافات اور قتل و غارت گری کے باوصف فرانس کی ایک ایسی تصویر مرتب کی جس سے ایک بچے کی معصومیت مترشح ہوتی ہے اور قاری بے اختیار فرانس سے پیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ رابیلے کی زبان نسبتاً مشکل ہے نیز اسے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بھی ممکن نہیں[۳] اس لئے اس کی شہرت زیادہ تر فرانس تک ہی محدود ہے۔ اس کے برعکس مانتین کی عطا یہ ہے کہ اس نے ادب کو دیوان خانے کی سنجیدہ گفتگو کا موضوع بنا دیا اور اپنے خیال افروز انشائیوں سے فرد کو خود انکشافی اور خود تنقیدی کی شگفتہ راہ سجھائی اور یوں مانتین نے دنیا کو قرون وسطیٰ کی تاریکیوں سے نکال کر انشائیہ کی چاندنی میں غسل ماہتابی کرنے کا موقعہ عطا کر دیا۔

اسی زمانے میں انگلستان سے ولیم گروسن[۴]، تھامس لین ایکر[۵] اور جان کولیٹ[۶] یونان کے جلاوطنوں سے یونانی زبان سیکھنے کے لئے اٹلی گئے واپسی پر انہوں نے آکسفورڈ میں یونانی زبان کی تدریس شروع کر دی[۷]۔ اراسمس[۸] جس نے بعد میں یوٹوپیا[۹] کے مصنف تھامس مور[۱۰]

۱۔ باؤسٹن۔ مین کرنٹس آف انگلش لٹریچر صفحہ ۲۵
۲۔ جے۔ بی۔ پریسٹلے۔ لٹریچر اینڈ ویسٹرن مین صفحہ ۱۵
۳۔ لگوئی اے شارٹ ہسٹری آف انگلش لٹریچر صفحہ ۲۳
۴۔ WILLIAM GROCYN
۵۔ THOMAS LINACRE
۶۔ JOHN COLET
۷۔ گزامیاں ہسٹری آف انگلش لٹریچر
۸۔ ERASMUS
۹۔ UTOPIA
۱۰۔ THOMAS MORE

کے دل میں ادب کی شمع روشن کی انہیں لوگوں سے یونانی زبان پڑھنے کے لئے یورپ سے انگلستان آیا تھا یونانی علوم چونکہ پہلے عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوئے اور پھر لاطینی کی وساطت سے انگریزوں تک پہنچے۔ اس لئے لاطینی زبان کو کلاسک کا درجہ حاصل ہو گیا اور یہ سکولوں اور کالجوں میں باقاعدہ پڑھائی جانے لگی اس زبان میں ادب تخلیق کرنا وجہ افتخار بن گیا۔

بلاشبہ اس عہد کے نامور ادیب دانتے نے طربیۂ خداوندی لاطینی زبان میں لکھی تھی[۱] تاہم وہ نئے قومی تقاضوں کی تکمیل کے لئے نئی زبان تخلیق کرنے سے غافل نہیں تھا۔ چنانچہ احیاء العلوم کی تحریک کو مقبول بنانے میں دانتے کی انفرادی عطا یہ ہے کہ اس نے آفاقی ادب کے لئے ممتاز اور شائستہ زبان استعمال کرنے کی طرح ڈالی اور ایک متحدہ قومی زبان رائج کرنے پر زور دیا۔ دانتے نے اعلیٰ درجے کی شاعری کے لئے یونان اور روم کی شاعری کو مثالی قرار دیا اور یوں اس نے انگریزی روایت کا رشتہ اس سرچشمے کے ساتھ جوڑ دیا جس کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوئے۔ دوسری طرف دیسی زبان کے فروغ سے لاطینی زبان کی مقبولیت کم ہونے لگی اور نشاۃ ثانیہ کی ہواؤں نے اس کا درخت جڑ سے اکھاڑ پھینکا[۲]

ازمنۂ وسطیٰ میں کلیسا کی مضبوط بندشوں نے یورپ کی ہیئت اجتماعیہ قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ جب یہ بندھن ٹوٹ گئے اور فرد آزاد ہو گیا تو اس کی توجہ سب سے پہلے اپنے ملک اور اپنی ذات کی طرف مبذول ہوئی۔ ہسپانوی آرمیڈا کی شکست اس دور کا ایک بے حد اہم واقعہ ہے۔ اس واقعے نے انگریز قوم کو فتح کے نشے سے ہی سرشار نہیں کیا بلکہ ان کے ذہن سے ایک دائمی خوف کا اثر زائل اور کھوئے ہوئے اعتماد ذات کو بحال کر دیا۔ چنانچہ انگریزوں کے ہاں قومیت کا ایک نیا مگر مضبوط جذبہ ابھرنے لگا اور وہ ہر شعبۂ حیات میں مسابقت حاصل کرنے کے لئے تگ ودو میں مصروف ہو گئے۔ قومی جذبے کی اس تیز آنچ نے تحریک احیاء العلوم میں محرک قوت کا کردار سرانجام دیا اور اس کو فروغ ان ادبا نے دیا جو آزاد خیالی آزادہ فکری اور جرأت اظہار میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور جنہیں عرف عام میں "ہیومنسٹ[۳]" کہا جاتا ہے۔

ان ادبا نے اپنے ملک میں لوک ادب کو ملکی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی اور اس کیلئے کسی غیر ملکی زبان کا سہارا لینے کے بجائے دیسی زبان کو ہی اظہار کا وسیلہ بنایا چنانچہ ادب کو جو بالعموم خواص کی سرگرمی تصور ہوتا تھا۔ ان ادبا نے عوام کی روح میں اتارنے کی کوشش کی اور ایک خالص ادبی تحریک کی بناء ڈالی جسے عمرانی تحریک[۴] کا نام دیا جاتا ہے۔

تحریک احیاء العلوم کے وسیع تناظر میں عمرانی تحریک بظاہر ایک چھوٹا سا شاخچہ نظر آتا ہے تاہم اس کی اہمیت اور قدر وقیمت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ تحریک احیاء العلوم اس کے تذکرے کے بغیر اپنا پورا مفہوم واضح نہیں کر سکتی۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد قدامت کی روایات کو توڑنا اور نامور مصنفین کے کلاسیکی کارناموں کے ساتھ رشتہ قائم کرنا تھا[۵] طباعت کے فروغ نے نشر واشاعت کو بہت آسان بنا دیا تھا[۶] اور اب فرد دانش کے ان خزینوں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بے تاب تھا جن کی تخلیق کا سہرا ماضی کے سربرآوردہ یونانی مصنفین کے سر تھا۔ چنانچہ جب اٹلی میں ہومر۔ سوفوکلیس۔ افلاطون، ارسطو، سائیسرو اور ہورس وغیرہ کی کتابوں کے نسخے دریافت ہوئے تو انگلستان کے علمی وادبی حلقوں میں ایک محشر مسرت بپا ہو گیا۔ چنانچہ سولہویں صدی کے ربع اول میں انگریزی حجابہ خلانے صرف یونانی مسودوں کو شائع کرنے میں مصروف رہے اور اس سیلاب دانش نے عوام اور خواص کو متاثر کیا اور حد یہ ہے کہ احیاء العلوم کی جو لہر مردوں میں ابھری تھی اس سے خواتین بھی یکساں استفادہ کر رہی تھیں۔ ملکہ الزبتھ روزانہ یونانی عہد نامے کا مطالعہ کرتی تھی اور لیڈی جین گرے نے اس زبان میں عمدہ مہارت حاصل کر لی تھی۔

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ارسطو سے ایلیٹ تک صفحہ ۲۴

۲۔ کزامیاں۔ اے ہسٹری آف انگلش لٹریچر صفحہ ۱۹۲

۳۔ HUMANIST

۴۔ HUMANIST MOVEMENT

۵۔ ہڈسن۔ مین کرنٹس آف انگلش لٹریچر صفحہ ۵۷

اس تحریک کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اس کے ادبا نے تخلیقات کے لئے تو ملکی زبان کو استعمال کرنے پر زور دیا لیکن اصنافِ سخن کے لئے شائستگی اور نفاست کے لئے رومیوں کے مروجہ معیار قائم رکھنے کی کاوش کی۔ چنانچہ اس زمانے میں یونان کے تہذیبی آثار کچھ زیادہ مقبولِ نظر نہیں آتے۔ ارسطو کے دو الفاظ جو عہد میں زیادہ بحث و نظر کا موضوع بنے۔ "نقل" اور "آفاقیت"۔ ہیں لیکن ان کی تشریحات اور توضیحات میں روم کے ادیب ہوریس کے نظریات کی تقلید زیادہ ہوئی چنانچہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے میں نشاۃ ثانیہ کے ادیبوں پر یونان کی بہ نسبت روم کی روح زیادہ سوار تھی[1]۔ اور انتہا یہ ہے کہ سپنسر جیسا قد آور شاعر بھی ورجل بننے کی آرزو رکھتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی میں ارسطو کے خیالات براہِ راست یونانی سے منتقل نہیں ہوئے[2] بلکہ یہ ابنِ رشد کی وساطت سے پہلے عربی میں ترجمہ ہوئے پھر عربی سے اطالوی زبان میں منتقل ہوئے اور سب سے آخر میں اطالوی سے یورپی زبانوں میں آئے لوگ ہوریس کو پڑھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ ارسطو کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ غلطی جو لاعلمی میں مسلمانوں سے سرزد ہوئی اس کا اعادہ انگریزوں نے بھی کیا۔ اور رومن نقادوں کی آرا پر نئے حواشی چڑھا کر بنائے مسئلہ ارسطو کی طرف منسوب کر دی۔

اس تحریک کا تیسرا زاویہ یہ ہے کہ بیشتر ادبا نے انسان کے داخلی اور خارجی مسائل کو عمرانی زاویے سے پرکھنے کی کوشش کی۔ تاہم اس تحریک نے طبقاتی تضادات کو ختم کرنے اور مساواتِ انسانی کو فروغ دینے کی کوئی نمایاں کوشش نہیں کی اس کے برعکس اس دور کے ادبا نے ادب کو طبقۂ امرا کا خادم بنانے کی سعی کی۔ ٹریجڈی کو اس لئے شاندار تصور کیا گیا کہ اس کے کردار اعلیٰ ترین طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ شیکسپیر جس نے کامیاب ایسے تصنیف کئے تھے زندۂ جاوید ہو گیا اور بن جانسن جو علم و فضیلت میں بلند تر اور تخلیقی اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا تھا طربیے تخلیق کرنے کی بنا پر محض اوسط درجے کا ڈرامہ نگار شمار ہوا۔ سپنسر نے "فیری کوئین" میں انگلستان کی ملکہ کے کارناموں کو تمثیل میں لکھ کر ملکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ادبی اسلوب کو بھی مختلف طبقوں کے مطابق استعمال کرنے کی طرح ڈالی گئی چنانچہ ملاحوں اور تاجروں کے لئے پست درجے کا اور دیوتاؤں اور بادشاہوں کے لئے اعلیٰ درجے کا اسلوب تجویز کیا گیا۔

عمرانی تحریک کلیسا کی جبریت اور پادریوں کی فرماں روائی کے خلاف براہِ راست صف آرا نہیں ہوئی تاہم ان ادبا نے کلیسا کو استحسان کی نظر سے نہیں دیکھا۔ یہ تحریک بنیادی طور پر ملکی عظمت کو اجاگر کرنے کی آرزومند تھی۔ چنانچہ جلد ہی ادیبوں، شاعروں اور ڈرامہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد نے قومی انفرادیت کو نمایاں کرنے اور نئی معنویت کو فروغ دینے کے لئے اپنی دیسی زبان میں تخلیقی اظہار شروع کر دیا۔ اور اس تحریک نے جو ادب پیدا کیا اسے دوامی حیثیت حاصل ہے۔ تحریک کے ابتدائی دور میں تھامس مور نے "یوٹوپیا" تصنیف کی جس میں افلاطون کی مثالی ریاست کو ایک عملی تعبیر کی صورت میں پیش کیا گیا تھا۔ روجر آسچم (Roger Ascham) نے ذی سکول ماسٹر لکھی اور اساتذہ کو لاطینی کی تعلیم کے اصول بتائے اراسمس (Erasmess) کی کتاب "غلطی کی تعریف میں" (In Praise of folly) سے شائستہ مزاج کو تقویت ملی۔ شعری ادب میں سپنسر (Spencer) نے "فیری کوئین" (FAIRY QUEEN) لکھ کر نام پیدا کیا۔ ڈرامے میں جان للی (LYLY) تھامس کڈ (Thomas Kyd) اور کرسٹوفر مارلو (CHRISTOPHER MARLOW) کو شہرت حاصل ہوئی۔ عمرانی تحریک کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار ولیم شیکسپیر ہے جس نے نشاۃ ثانیہ کے ادب کو لازوال زندگی عطا کر دی۔ چنانچہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ شیکسپیر سے پہلے انگریزی زبان ثروت

---

[1] ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ارسطو سے ایلیٹ تک۔ صفحہ ۲۷۱ [2] سید عابد علی عابد۔ اصول انتقاد ادبیات۔ صفحہ ۱۲۱

کا نشانہ تھی لیکن شیکسپئر نے اس مٹی کو کندن بنا دیا اور یہ عظیم ادب کی تخلیق کرنے پر قادر ہو گئی۔

عمرانی تحریک کی ایک اہم شخصیت جس میں نشاۃ ثانیہ کی پوری روح سمائی ہوئی نظر آتی ہے۔ سر فلپ سڈنی ہے۔ اس تحریک کے زمانے میں جو ادبی مباحث اٹھائے گئے ہیں ان سب کا مدلل جواب سڈنی نے دیا۔ چنانچہ ادب و شعر کے بارے میں جو گرد گوسن نے "مدرسہ دشنام" (SCHOOL OF ABUSE) لکھ کر اٹھائی تھی اسے زائل کرنے میں سڈنی کی کتاب "شاعری کی معذرت" (APOLOGIE FOR POETRIE) نے بنیادی کردار ادا کیا اور عمرانی تحریک کے شعراء کا اعتماد بحال کرنے میں مدد دی۔ سڈنی کی خوبی یہ ہے کہ اس نے فلسفۂ شعر کے دقیق مسائل کو تخلیقی انداز میں پیش کیا اور اس میں عام قاری کی دلچسپی کا سامان پیدا کر دیا۔

عمرانی تحریک قدما کو بازیافت کرنے کی تحریک تھی۔ چنانچہ اس کی آنکھ ماضی کے ادب پر اور قدم مستقبل کی طرف تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ اس تحریک نے بیک وقت کلاسیکیت اور رومانیت کے رجحانات کو پروان چڑھانے کی کوشش کی جو بعد میں ادب کی دو بڑی تحریکوں کی شکل میں سامنے آئے۔ یونان اور روما کی عظیم روایت کے ساتھ جب اطالوی تہذیب کی روح نے انگریزی کے ساتھ مس کیا تو شعور کو نئی تازگی مل گئی جس نے مستقبل کے ادب کو ہمیشہ اپنے دائمی اثرات سے متاثر کیا۔

مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاح مذہب بنیادی طور پر کلیسا کی جابرانہ حاکمیت کے خلاف صدائے احتجاج کی تحریک تھی۔ رومن کیتھولک فرقے نے بظاہر فرد کو نجات کا خواب دکھایا تھا لیکن درحقیقت اسے دائمی گناہ کے خوف سے دوچار کر کے اسے ایک تنگ نظر مذہبی جماعت کا غلام بنا دیا تھا۔ چنانچہ اس تصور کو زیادہ فروغ دینے کی کوشش کی گئی کہ آدمی انسان سے زیادہ حقیقی اور جماعت فرد سے اہم ہے۔ مارٹن لوتھر نے صداقت کی اجتماعیت کو فرد کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی اور جب حقیقت کھل کر سامنے آئی تو عوام حیرت زدہ ہو گئے کہ ان میں سے ہر ایک کے دل میں ایک مقدس کلیسا موجود تھا اور وہ روحانی مسرت کے حصول کے لئے کسی تنگ نظر پادری کا محتاج نہیں تھا۔ فرد کی اس بغاوت کے پس پشت وسیع تر قومیت کا جذبہ بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ چنانچہ جب عوام نے رومن کیتھولک کلیسا سے نجات حاصل کی تو غیر ملکی تسلط۔ روم کی برتری اور پوپ کی امتیازی حیثیت وغیرہ سب کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ قرونِ وسطیٰ کے مذاہب نے لاموجود کو تو اہمیت دی تھی لیکن موجود کے بارے میں کسی صحت مند رویے کا اظہار نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فنون لطیفہ میں حرم و دیر کا تصور زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ صلیبی جنگوں نے مقدس مقاصد اور عاقبت کے انعامِ موعود کے لئے جان نچھاور کر دینے کے جذبے کو شدید صدمہ پہنچایا تھا۔ کلیسا کے رہنماؤں کی اخلاقی اور مذہبی بدعنوانیوں اور نجات کے لئے مقررہ قیمت پر پروانۂ جنت کی فروخت نے بغاوت کی آگ کو تیز تر کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اصلاح مذہب کی تحریک روز بروز عوام میں مقبول ہوتی چلی گئی۔ سولہویں صدی کے اوائل میں جب پاپائے روم نے بادشاہ کو ملکہ کیتھرائن کو طلاق دینے کی اجازت نہ دی تو یہ لاوا سرکاری سطح پر بھی پھوٹ نکلا اور ہنری ہشتم نے کلیسا کے سب احکام منسوخ کر کے اس کی وسیع جائداد کو بحق سرکار ضبط کر لیا۔[۲]

اصلاح مذہب کی تحریک نے جو طغیانِ نظر مذہبی حلقوں میں پیدا کیا تھا اس کی کچھ لہریں ادب پر بھی اثر انداز ہوئیں چنانچہ عمرانی تحریک کے ادبا کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ اپنے عقائد پر نظر ثانی کریں اور پوپ اور مارٹن لوتھر میں سے کسی ایک کے ساتھ نظریاتی وابستگی استوار کریں۔ تھامس مور کی "یوٹوپیا" اور مارٹن لوتھر کے "بانوے مقالات" ایک ہی زمانے کی تصانیف ہیں لیکن ان پر عوام اور خواص کا ردعمل متضاد نوعیت کا ہے۔ تھامس مور عقائد کے لحاظ سے رومن کیتھولک تھا۔[۳] اس لئے ولیم ٹنڈل (WILLIAM TYNDAL) نے

ص۱ ہاؤسٹن مین کرنٹس آف انگلش لٹریچر صفحہ ۷۲ ص۲ ہاؤسٹن۔ مین کرنٹس آف انگلش لٹریچر صفحہ ۷۲ ص۳ لگوئی۔ شارٹ ہسٹری آف انگلش لٹریچر صفحہ

جب نیا عہد نامہ" انگریزی میں ترجمہ کیا تو تھامس مور یا پاپائیت کے دفاع کے لئے ایک ساتھ ادبی سطح پر متصادم[1] ہوا۔ ادبی لحاظ سے اس تحریک کا مثبت زاویہ پرانی کتب کے انگریزی تراجم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تمام سوالات جو فرد کے ذہن کو برانگیختہ کرتے تھے اور اطالوی زبان لاعلمی کی بنا پر حل نہیں ہو پاتے تھے اب انگریزی میں اس کے سامنے آئے اور فرد کو ان پر غور و فکر کرنا نسبتاً آسان ہو گیا۔ چنانچہ عوامی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے نظم کے ساتھ نثر کو بھی فروغ حاصل ہونے لگا۔ ہیف لائمیر HOUUGH LATIMARX کے وعظ اس مذہبی نثر کی عمدہ مثال ہیں۔ سکاٹ لینڈ میں اس تحریک کو ڈیوڈ لنڈسے (David Lindsay) نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ جان ناکس (JOHN KNOX) نے یہی فریضہ نثر میں ادا کیا اور تحریک کے پیغام کو عوام کے قریب تر کر دیا۔

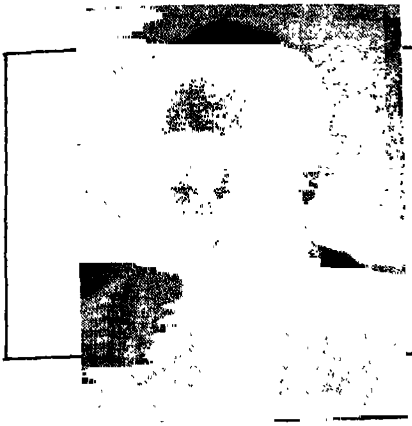
تحریک اصلاح مذاہب کی اہم عطا یہ ہے کہ اس نے اعتقادی سطح پر جو تلاطم بپا کیا تھا اس کے اظہار کے لئے نثر کو وسیلہ بنایا اور یوں انگریزی نثر کو ترقی کے زینے پر چڑھنے میں مدد دی۔ یہ تحریک چونکہ رومن کیتھولک عقائد کی سنگلاخیت کے خلاف اٹھی تھی اس لئے اسے بہت شدید ردعمل کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اور ایک نئی تحریک مراجعت شروع ہوئی جس نے ایک دفعہ پھر فرد کو عقیدے کی پابندیاں قبول کر لینے کی طرف متوجہ کیا لیکن اب آزادی کا جن بوتل سے باہر آ چکا تھا اس لئے اسے دوبارہ محبوس کرنا ممکن نہیں تھا۔

تحریک احیاء العلوم کے ثمرات یوں تو سارے یورپ میں پھیلے تاہم اس تحریک نے انگلستان کو دوسرے ممالک کی بہ نسبت زیادہ متاثر کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگلستان تہذیبی لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک سے نسبتاً فاصلے پر تھا اور یہاں تہذیبی اثرات پہنچنے میں بھی وقت لگ جاتا تھا۔ ثانیاً جو تخلیقی قوت انگلستان کی زمین کی زیر سطح چھپی ہوئی تھی اسے پہلے نہ کبھی دریافت کیا گیا تھا اور نہ ہی اسے استعمال کرنے کی کوشش کبھی ہوئی تھی۔ اطالوی زبان اور رومی ادب کے ساتھ جب انگلستان کا تعارف ہوا تو یہ قوت یکدم بالائی سطح پر آ گئی۔ بات یہ ہے کہ انگریز ایک متنوع مزاج قوم کے افراد تھے۔ یہ قوم زندگی کا مشاہدہ سنجیدگی سے کرتی لیکن جب سنجیدگی حد سے بڑھ جاتی اور اس میں میکانیت پیدا ہونے لگتی تو وہ اس پر کھلکھلا کر ہنسنے کا حوصلہ بھی رکھتی تھی۔ چنانچہ ادب کی دوسری اصناف کی بہ نسبت اس دور میں ڈرامے کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور اس خطہ ارض سے دنیا کا سب سے عظیم ڈرامہ نگار شیکسپیئر پیدا ہوا۔ انگریز قوم کی اس امتزاج پسندی کا اظہار شاعری میں بھی ہوا۔ چنانچہ ایسی شاعری جو کانوں میں مسلسل رس گھول سکے عوام و خواص میں زیادہ مقبول ہوئی۔ ان وجوہات کی بنا پر احیاء العلوم کی ہوا چلی تو اس کی تازگی کو انگلستان نے زیادہ قبول کیا اور زندۂ جاوید تخلیقات سے ادب کے ہر گوشے کو جگمگا دیا۔

تحریک احیاء العلوم کی روشنی سترھویں صدی کے ربع اول میں ماند پڑنے لگی۔ اس وقت انگلستان میں پیورٹنزم کی تحریک نے اپنا بیج بکھیر دیا تھا اور فضا پر انقباض کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ تاہم تحریک احیاء العلوم نے جس تخلیقی توانائی کو جنم دیا تھا وہ یکسر معدوم نہ ہوئی اور ملٹن (MILTON) نے "جنت گم شدہ" لکھ کر اس تحریک کے بنیادی نصب العین کو پھر تازگی عطا کی۔ ملٹن نے اس عظیم کتاب میں فطرت اور مذہب کا نقطہ اتصال دریافت کر لیا تھا۔ چنانچہ اس کی شخصیت میں ایک ایسا ادیب سامنے آیا جس نے نشاۃ ثانیہ اور تحریک اصلاح مذہب کی روح کو یکساں طور پر ابھارنے کی کوشش کی۔

---

۵ کزامیان۔ اے ہسٹری آف انگلش لٹریچر۔ صفحہ ۲۱۱   ۲ لگوئی اے شارٹ ہسٹری آف انگلش لٹریچر صفحہ ۶۹



سوتے میں چلتی ہوا سے لڑنے والی شاعرہ

ڈاکٹر سلیم اختر

"میں شاعری کرتی ہوں
کیونکہ میں نے خودکشی نہیں کی
میں زندگی کرتی ہوں
کیونکہ میں نے دلبری نہیں کی
میں نوکری کرتی ہوں
کیوں کہ میں نے ہمدردی نہیں کی
میں ...
میں ناگفتنی کرتی ہوں
کیونکہ میں نے گفتنی نہیں کی !"

("مکافات")

اردو ادب میں شاعرات عجب EMBARRASSING قسم کی چیز رہی ہیں۔ جاگیردارانہ نظام کی مشکلات میں جکڑے مسلم معاشرے میں عورت اگر بیوی بن کر اپنے وجود کا اثبات نہ کرپاتی تو پھر محلات میں لونڈی بنتی ورنہ بازار حسن کی زینت! مسلم حکمرانوں کی تاریخ میں نورجہاں، ممتاز محل، چاند بی بی یا حضرت محل ایسی شہرت یافتہ ملکائیں ملتی ہیں تو یہ صرف چند استثنائی مثالیں ہیں ورنہ باقی عورتیں محض عورتیں ہی ہیں انفرادیت سے عاری اور تخلیق کے جوہر سے ناآشنا۔ جن کی شخصیت کا اظہار ان کی تولیدی صلاحیتوں سے ہی ہوتا تھا۔ اس عہد میں اگر کوئی عورت سچ مچ آزاد نظر آتی ہے تو وہ صرف طوائف ہے اور اسے بھی اس معاشرے کا تضاد سمجھنا چاہیئے۔ اور تاریخ ادب اردو کا ایک اہم نفسیاتی وقوعہ کہ چند استثنائی مثالوں سے قطع نظر بیشتر شاعرات طوائفیں تھیں۔ جس لکھنؤ کے مرد عورت بن کر ریختی کہہ رہے تھے اس لکھنؤ کی طوائفیں مردانہ جذبات پر مبنی غزل میں نام پیدا کر رہی تھیں۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند ادب کی تحریک نے ادب میں کئی ٹیبوز توڑے۔ چنانچہ اس تحریک میں عورت بھی مرد کے شانہ بشانہ شاعری کرتی نظر آتی ہے لیکن اظہار نسوانیت کیونکہ مروج ادبی فیشن کے خلاف تھا اس لئے شاعری میں عورت اپنی سائیکی کا اظہار نہ کر پائی (حالانکہ افسانہ میں عصمت چغتائی بات کہاں سے کہاں تک پہنچا چکی تھی) مرد نے جب آنچل کو پرچم بنانے کا مشورہ دیا تو یہ بھی اس

کے عورت پن کو مجروح کرنے کے مترادف تھا اور اس حقیقت سے صرفِ نظر کا نتیجہ کہ پرچم سرنگوں ہو جاتے ہیں مگر آنچل نہیں!

پاکستان میں بھی شاعرات مردانہ روش پر گامزن رہیں اور یوں اچھی شاعرہ ہونے کے باوجود بھی بحیثیت عورت وہ اپنے لہجے میں انفرادیت نہ پیدا کر سکیں۔ اس انداز کی نمایاں مثال اداؔ جعفری ہے۔

کشور ناہید کی غزلوں کا پہلا مجموعہ "لب گویا" (۱۹۶۹ء) ــــ بول کہ لب آزاد ہیں تیرے، کی زندہ تفسیر معلوم ہوتے ہیں ان غزلوں میں پہلی مرتبہ عورت کی شاعری نظر آتی ہے۔ کشور ناہید نے گفتگو کے جس مردانہ انداز سے اب اپنی ایک لے چنڈ بنالی ہے۔ "لب گویا" کی غزلوں میں اس کے آثار نہیں ملتے لہجہ بھی ملتا ہے اور اظہار میں شرمیلا پن۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ آنچل سے سر کو خوب ڈھانک کر کھڑی ہو، اپنے اس شعر کے مصداق ؎

دیکھ کر جس شخص کو ہنسنا بہت　　　سر کو اس کے سامنے ڈھکنا بہت

اس انداز کی چند مثالیں پیش ہیں:

کچھ یوں ہی زرد زرد سی ناہیدؔ آج تھی　　　کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھلتا ہوا نہ تھا

گھر کے دھندے کہ نمٹتے ہی نہیں ہیں ناہیدؔ　　　میں نکلنا بھی اگر شام کو گھر سے چاہوں

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دبی آگ　　　مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں

میں دو بچوں کی ماں جب سے بنی ہوں　　　مرے چہرے پہ دو تل ہو گئے ہیں

دوسرے مجموعۂ کلام "بے نام مسافت" (۱۹۷۴ء) میں کشور ناہید نظموں میں اپنی نسوانیت اور اس کے حوالہ سے پاکستانی عورت کی سائیکی کو EXPLORE کرتی محسوس ہوتی ہے۔ جذباتی گھٹن، جنسی تشنگی اور ان سب کے نتیجے میں تناؤ سے چٹختے اعصاب نے "بے نام مسافت" کے شعری سفر کے عنوانات مہیا کئے ہیں۔ یہ مجموعہ کشور ناہید کی تخلیقی شخصیت کی نفسی اساس مہیا کرتا ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ کی بعض نظموں میں ایسے کار آمد جنسی اشارات اور نفسی تلازمات ملتے ہیں جن سے کشور ناہید کے شعری پیکر کے خدوخال اجاگر ہوتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً یوسف کامران پر مکمل نظم جس سے یہ "ODD COUPLE" ایک نئے تناظر میں THREE LEGED RACE کے پارٹنرز کی طرح ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم نظر آتا ہے۔

انسان جب پیراکی سیکھتا ہے تو پہلے کنارے کنارے رہتا ہے۔ اس کے بعد خود اعتمادی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ گہرے پانیوں میں غوطہ زن ہوتا اور مخالفانہ تیز دھاروں کے مقابل آتا ہے۔ کچھ یہی حال کشور ناہید کا معلوم ہوتا ہے۔ "لب گویا" میں وہ کنارے کنارے پانی اور اپنے اعصاب سے اٹکھیلیاں کرتی ہے۔ "بے نام مسافت" میں اس کے اظہار میں زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو چکی ہے اور اب وہ دریا کے بہاؤ میں دور تک تیز موجوں سے کھیلتی نظر آتی ہے۔ جب کہ "گلیاں دھوپ دروازے" (۱۹۷۸ء) میں، وہ فنی پختگی کی معراج زندگی کے گہرے پانیوں میں اس مچھلی کی طرح غوطہ زن نظر آتی ہے جس کا مسکن ہی گہرا پانی ہوتا ہے:

"کشور ناہید
تم منہ بند سیپی کی طرح

زندگی کے سمندر میں
ہواؤں سے باتیں کرنے
پہاڑوں کی بنیاد ہلانے
اور لہروں کو اپنے بالوں کی طرح کاٹ کر
ساحل پہ
گزشتہ کی روایتی
اور آج کی مضطرب
عورت بن کر سوچ رہی ہو　　　　(کشور ناہید)

نام نامی کے عنوان والی اس نظم کے علاوہ ایسی اور بھی کئی نظمیں ہیں جن میں کشور ناہید نے اپنے وجود، اپنی ذات اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے عورت پن کی بات کی ہے۔ "مکافات"، "گھاس تو مجھ جیسی ہے"، "سمجھوتہ"، "اجازت دو"، "آخری خواہش"، "فادر کمپلیکس"، "ہڈ بیتی"، "میں کون ہوں" وغیرہ اس انداز کی بہت خوبصورت مثالیں ہیں۔
ان میں کہیں واضح اور دو ٹوک انداز میں بات کی ہے تو کہیں استعاروں اور امیجز سے، اور کمال یہ ہے کہ ریشم کے کیڑے کی طرح خود کو اپنی نرگسیت کے خول میں بند نہ کیا بلکہ نظموں سے اپنے وجود کی یوں توسیع کی کہ وہ عام عورت کی فرسٹریشن، ناآسودگی اور پیاس کی علامت بن جاتا ہے۔ کشور ناہید کے لئے اس کی ذات ایک قوی تخلیقی محرک کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اسے شاعری کے آئینہ میں اپنی تخلیقی شخصیت کی مشاطگی یوں کی کہ اپنے سراپا کو پاکستانی عورت کا سراپا بنا دینے کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری کو آج کی آزادی طلب عورت، اپنے وجود کا اثبات چاہنے والی عورت، اپنی شخصیت کا اظہار چاہنے والی عورت اور اپنی نسوانیت سے نہ شرماتے والی عورت کا منشور بھی بنا دیا۔ یہ مشرق کی روایتی عورت کا آنسوؤں اور آہوں سے مملو PASSIVE RESISSTANCE والا انداز نہیں بلکہ بحیثیت عورت وہ اپنے آپ پر ناز کرنے اور خود کو قابل احترام سمجھنے کی تلقین کرتی ہے۔ چنانچہ اس کی بیشتر نظموں جیسے "جاروب کش" — = + "FACE THE PAIN"، "ہم نے خواہشوں کے سارے پرندے اڑا دئے ہیں"، "میری ماں" "نظم"، "دھواں چومتی لبیں"، "سن ری سہیلی"، "کلیر لنس سیل"، "کتنی چاہت والے لوگ ترے دیوانے"، "اعتراف" "میں کون ہوں"، "اے کاتب تقدیر لکھ"، "زخمی پرندے کی چیخ" وغیرہ ان سب نظموں میں کشور ناہید گھاس کی مانند پامال پاکستانی عورت کے لئے صدائے احتجاج بلند کرتی نظر آتی ہے۔

اگرچہ ان نظموں اور بعض دیگر نظموں میں بھی (جیسے "تیرا لشیا شہر بھنبھور"، "تم سے"، "رات آتی ہے"، "دوسری موت") کشور ناہید نے لہو کی پکار اور جسم کی چہچہاہٹ سنی اور سنائی ہے لیکن فہمیدہ ریاض کے برعکس انداز کلینکل نہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس لحاظ سے کشور ناہید انفرادیت اختیار کر لیتی ہے کہ اس نے جنس میں عورت کی پامالی دیکھی ہے۔ اس لئے وہ اسے بعض اوقات استحصال کے مترادف گردانتی ہے۔

دراصل یہی وہ پُر تضاد صورتِ حال ہے جس سے عورت کی مخصوص جنسی نفسیات کا تضاد جنم لیتا ہے۔ وہ باہر کی دنیا میں کتنی ہی بے باک اور ظالم ہنٹر والی کیوں نہ ہو لیکن اپنی آسودگی کے لئے اسے جسم کا شہر سرنڈر کرنا پڑتا ہے۔ اس صورتِ حال کے تضاد کی خود کشور ناہید سے بڑھ کر اور کون بہتر طور پر سمجھ سکے گا جو اپنے وجود اور اس کے ساتھ ساتھ شاعری میں WOMEN'S LIB کی زندہ تصویر ہے۔

کشور ناہید بھی سائمن دیوار کی مانند عورت کو SECOND SEX کے روپ میں دیکھنے کی روادار نہیں۔ سائمن دیوار نے فلسفیانہ سطح پہ اپنی معروف تالیف "SECOND SEX" میں جس مسئلے کو لیا تھا، کشور ناہید تخلیقی سطح پر اس سے نبرد آزما ہے۔ مجھے کئی امور میں ان دونوں میں مماثلت نظر آتی ہے۔ لہٰذا اگر انتظار حسین کے "جھانسی کی رانی" والے خطاب کے بعد مزید کوئی خطاب تجویز کرنا مقصود ہو تو کشور ناہید کو اردو کی سائمن دیوار قرار دیا سکتا ہے (کشور ناہید خود بھی اس کی بہت مداح ہے، اتنی کہ "SECOND SEX" کا اردو میں ترجمہ کر رہی ہے۔)

"بے نام مسافت" سے کشور ناہید کی نظموں میں عورت کی جنس اور جنس کے ذریعہ عورت کی شکست یا پامالی ایک اہم موضوع کی صورت اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ "بے نام مسافت" کی پہلی نظم "شب عروسی"، "گلیاں دھوپ دروازے" کی نظم "مدارات آتی ہے" کی صورت میں تکمیل پاتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ وہ احساس ہے جسے کشور ناہید کی نظم "چوب خشک اور آگ" کے اس مصرع سے واضح کیا جا سکتا ہے۔

"مرے شوق کو میرے گنہ سے سوا بھلا جانے کون"

لیکن شوق کی تکمیل کیسے کیسے اعصابی ہفت خواں طے کراتی ہے۔ اس کا اندازہ ان چند مثالوں سے ہو سکتا ہے:

"نیند نہیں آتی
بستر کی خواہش بھی آسودگی چاہتی ہے
میں ستارے گنتے گنتے
یہ سوچتی ہوں کہ ستاروں کی گنتی
تو تمھیں گلا گھونٹ کے مار ڈالنے کی گنتی سے کہیں کم ہے"

میں کروٹ بدل کر لیٹ جاتی ہوں
مرتبان میں بند
تتلی کی طرح
صحرا میں گھومتے
اکیلے چیتے کی طرح
مگر نیند نہیں آتی

(ترالیا شہر بمبور)

______

اتنی گرمی
میرا تن اندر سے بھٹی
باہر ۱۱۷—۱۲۰ کی گرمی
مہندی لمحے بھر کو ٹھنڈک
بیچ ہتھیلی آن جگائے

پانی پنڈے پر ڈالو تو
آتی جاتی ٹھنڈک
روئیں روئیں میں
شہر شہر کے جین سجائے
ٹھنڈ پیٹ اور نرم کٹوروں
بیچ رکھے ہاتھوں میں جاگے "
("تم سے")

"دو بستر
ایک ہی کمرے ایک ہی چھت کے سائے میں
ایک پہ بہتا نیند کا ساگر
ایک پہ بے خوابی کا صحرا
ایک پہ نرم ہوا کے جھونکے
ایک پہ لو کے گرم تھپیڑے

دو بستر
بیچ نہ ساحل
اور نہ صحرا
پھر بھی ڈونگا لمبا پینڈا "
("رات آتی ہے")

" ہر لڑکی ایسی باتوں سے خوش ہوتی ہے
وہ وعدوں کی گرہ میں الجھی
عہدِ وفا کی رسی پکڑے
ٹھنڈے گھر کی چھت کے نیچے
ریت کو پانی کا مس دے کر
کورے برتن کی صورت میں
لمس ملے تو بج اٹھتی ہے "
("دوسری موت")

یوں دیکھیں تو یہ سراب ایسے تند جذبوں اور کورے برتنوں کی کہانی بن جاتی ہے۔ وہ کہانی جس میں عورت کے مقدر میں صرف "افسوس حاصل کا" رہ جاتا ہے۔ کشور ناہید نے اپنی ایک اور نظم "کتھیارسیس" میں بھی کچے پیالے کے حوالے سے بات کہی ہے:

"کچے پیالے پہ منہ رکھ کے
میں نے پیاس کی خوشبو سونگھی
اوس نے دید سے رشتہ باندھا
اس نے رنگ کی چولی پہنی
گھر میں خواب کی شاخ لگا کے
سوچا تھا دیوار ڈھکے گی
بیل عمر یا چڑھ جائے گی
کتنے میٹھے خواب تھے جن کا
ذکر کرو تو ہونٹ کسیلے
کتنے انوکھے رشتے تھے وہ
خواب سے سچے، خواب سے جھوٹے"

اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک آنکھوں میں سچے اور جھوٹے خواب اور ہاتھوں میں خواب کی شاخ تھامے ننگی دیوار کے سامنے کھڑی ہے۔ سر پہ دھوپ نے چادر تانی ہے اور کچھ دیر بعد شاخوں کے گلابوں نے مرجھا جانا ہے اور یوں اس کے ہاتھ میں صرف کانٹوں کا گلدستہ باقی رہ جائے گا۔

اس فرسٹریشن کے ضمن میں نفسیاتی اہمیت کے یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا تند جذبات اور کورے برتن خود کشور ناہید کے اپنے وجود کی توسیع ہیں یا محض شاعرانہ استعارات؟ کیا یہ پیاس اس کے اپنے اعصاب کی پکار ہے کہ لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ؟ اور ان سے بھی زیادہ اہم اور بنیادی اہمیت کا یہ سوال کہ اپنی شاعری کی صورت میں خود کشور ناہید نے "SUBLIMATION" کے کتنے مراحل طے کئے ہیں، کیا اس نے اپنے کتھیارسیس کا عمل مکمل کر لیا ہے؟ کیا اس نے گلاب خواب حاصل کر لئے یا ابھی تک بے خواب راتوں کے نائٹ میئرز میں سے گزر رہی ہے۔ ان سوالات کے جوابات اتنے مشکل نہیں اور کشور ناہید کی "AUTOBIOGRAPHICAL" شاعری سے اس کی جنسی اور نفسی تصویر مرتب کرنی اتنی مشکل بھی نہیں لیکن کیا کروں، یوسف کامران میرا بہت اچھا دوست ہے۔



رائٹرز نوٹ بک

جوگندر پال

(۱)

اردو میں بسیار نویسی کے الزام سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ جیسا بھی لکھئے ، پانچ دس برس میں صرف ایک بار لکھئے اور توفیق ہو تو اتنا بھی نہ لکھئے ، بس لکھنے والوں کی تپسیا بھنگ کرتے رہئے اور خوب گھن گرج کر سین پر ڈٹے رہئے۔ کسی کی کیا مجال، آپ کے بہت بڑا ادیب ہونے کو تسلیم نہ کرے؟ ـــــ ہمارے موجودہ ادب میں اچھی تحریریں بہت کم ہونے کے اسباب میں بسیار نویسی کے الزام کا خوف بھی کارفرما ہے۔ ادب کی باگ ڈور لکھنے والوں کی بجائے ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو ایک لکھنے کے سوا باقی سب کچھ کرتے ہیں اور اِس سب کچھ، میں سب سے زیادہ یہ کرتے ہیں کہ کسی طرح اُن کا دبدبہ بنا رہے، اور پھر یہ ہوتا ہے کہ ہوتے ہوتے وہ اپنی اِسی سوشل کلائیمبنگ کو ہی لکھنے دیکھنے پر محمول کرنے لگتے ہیں۔ ادب کے ان طاقتور مولویوں کو ایسے ادیبوں سے چڑ ہوتی ہے جو اپنی دھن میں لکھتے جا رہے ہیں، سو یہ ان پر بسیار نویسی کا فتوٰی صادر کر کے، انہیں ایک طرف جھٹک دیتے ہیں، لو لکھتے رہو، لکھ لکھ کر ہمارا کیا بگاڑ لوگے؟

بسیار نویسی کا مفہوم دراصل زیادہ لکھنے سے ادا نہیں ہوتا، بلکہ فالتو ـــــ ایک سطر بھی فالتو لکھنے سے ادا ہوتا ہے۔ عام بات چیت کے دوران بھی آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہ ہو تو آپ کا ایک ہی فالتو جملہ آپ کی پوزیشن کو مضحکہ خیز بنا سکتا ہے۔ بات تو بہر صورت کچھ کہنے سے ہی بنتی ہے، محض بولتے چلے جانے سے نہیں، لیکن جہاں ایک طرف ادب کو محض بولتے چلے جانے والوں سے خطرہ لاحق ہے وہاں ان لوگوں سے بھی کم خطرہ نہیں جو اپنے آپ کو پہاڑ سمجھ کے دہانوں کو صرف آتش فشانی کے انتظار میں بند پڑا رہنے دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ زندگی میں دو ایک بار ہی پھٹیں گے اور پھٹیں گے تو سارا آس پاس تباہ کر کے دم لیں گے ـــــ جن پہاڑوں پر چہار موسم چپ چاپ آبشار بہتے رہتے ہیں، بڑے بڑے درختوں اور ان کے ننھے منے پودوں کا میلا لگا رہتا ہے اور چرند پرند اور انسان جہاں ہر دم ہنستے کھیلتے اپنا دکھ درد بانٹ کر بس جانے کے اسباب میں جٹے ہوتے ہیں، تخلیق کا باب حقیقتاً انہی سے گھنا ہوتا ہے۔

بہت باتیں کرنے والوں کو باتونی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ منہ واقعی کچھ کہنے کے لئے لفظوں سے بھرا پڑا ہوتا تو باتوں کی غزل دریاؤں کے میٹھے اور گہرے پانی کے مانند کائنات کے حسن اور بہبود میں اضافے کا باعث ہوتی ہے اظہار کی الوہٹ خواہش سے

لکھنے والوں کو اظہار کے معجزوں کا ادراک میسر آتا ہے، ورنہ ٹوٹی پھوٹی خواہش یا بے خواہشی سے کبھی کبھار لکھنے سے تصنیف بھی اسی گرانبار بے خواہشی کا آئینہ کرتی ہے۔

ہمارے برصغیر میں عموماً سبھی زبانوں اور خصوصاً اردو میں یہ حال ہے کہ جب سب دوسرے کاموں سے فرصت ہو تو مصنف کو لکھنے کی طرف راغب ہونے کی ترغیب ہوتی ہے۔ یعنی ہمارے بیشتر لکھنے والوں کے نزدیک لکھنا وکھنا کوئی ننھی سی بے ضرر سی ہابی ہے۔ کبھی ہاتھ خالی ہوئے تو معصوم کو بازوؤں میں بھینچ کر خوش ہو لئے، یا پھر یہ ہے کہ گھور بڑھاپے میں کچھ اور کرنے کے اہل نہ رہے تو تصنیف سے کھیل کھیل کر باقی ماندہ ایام پورے کر لئے۔ یہ صورت حال ہو تو کسی زبان کے ادب میں اہم اور مسلم تصانیف کا پیدا ہونا اس سے زیادہ تعجب خیز ہے کہ اس میں اچھی تصانیف نہ لکھی جا رہی ہوں۔ ادب باضمیر اور ضرر رساں شرکتوں کے تواتر پر اصرار کرتا ہے اور شریک ہونے والے کی زندگی میں ایک فیصلہ کن لمحہ لا کھڑا کرتا ہے کہ یا تو سب کچھ تج کے صرف یہی کرو، یا پھر خوش وقتی کا ٹائم ٹیبل مرتب کر کے مزے سے جیو، جو دو ایک گھنٹے آرام کے ملتے ہیں انہیں بھی کیوں غرق کرتے ہو؟ ——

اس میں شک نہیں کہ رائٹرز کی ایک کلاس فل ٹائم کمرشلز کی بھی ہوتی ہے جو آلو بیچنے یا منشی گیری کرنے کی بجائے لکھنے کا دھندا اختیار کر لیتے ہیں۔ میں ان لوگوں کے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوں کہ ہر کسی کو روٹی کے لئے کوئی نہ کوئی دھندا تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ یہ نہ سہی، یہ سہی۔ میرے ذہن میں اس وقت وہ پرفیکشنسٹ ہیں جنہیں ادب کو چوبیس گھنٹے ایمان کی طرح برتنا ہوتا ہے۔ ایمان ان کی روٹی روزی کا ذریعہ بن بھی جائے تو وہ روٹی روزی کو اپنے ایمان کا حاصل نہیں سمجھتے۔ اہل ایمان کی ساری ریاضت کا ثمر انہیں ایمان کی تقویت میں حاصل ہوتا ہے انہیں تو ساری دنیا کے گناہوں کا اقرار کر کے ان کی سزا کو بھگتنا ہوتا ہے —— اور اگر واقعی ایسا ہی ہے تو ظاہر ہے کہ کل انسانی ضمیر کے مرحلے کوئی چھوٹی سی خوشگوار پارٹ ٹائم ڈیوٹی سمجھ کے طے نہیں کئے جا سکتے یہ صعوبتیں ساری ساری زندگی کی شرکت کا مطالبہ کرتی ہیں۔

لیکن مصیبت یہ ہے کہ جو لکھنے والے تصنیف کو پارٹ ٹائم ڈیوٹی سمجھ کے اپنا پارٹ ٹائم بھی صرف شخصی عظمتوں کو منوانے میں بتا دیتے ہیں وہ اوروں کے پیہم تخلیق تجسس کے عمل کو اپنی سہولت کی —— خاطر بسیار نویسی سے تعبیر کر کے ٹال جانا چاہتے ہیں۔ ایسا کر کے یا تو وہ اپنی بددیانتی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں یا جہالت کا۔

اردو میں ادب کو ڈرائنگ روم کی کاہل فرصتوں کا آلۂ کار بنا کر ہم اپنے لئے محض ضمیر فروشی کے ماحول کا سامان کر رہے ہیں۔ ہنرمند لوگ بے ضمیر ہو جائیں تو ان کی ہنرمندی دھری رہ جاتی ہے، کیونکہ ہنرمندی کی لازوال شکلیں مسلسل ضمیر کوشی اور ریاض سے ہی ظہور پذیر ہوتی ہیں، ضمیر کوشی اور بے عملی سے آدمی اس حیثیت سے ہی عاری ہوتا ہے جو تخلیق کی اولین شرط ہے۔

غوں غاں کرتے ہوئے بچے بھی بعض اوقات بہ اتفاق کوئی چونکا دینے والی بات کہہ دیتے ہیں، اس طرح ایک آدھ اچھی نظم یا کہانی لکھ کے کوئی یہ سمجھ لے کہ اس نے اپنے اس کارنمایاں سے ادب کے سارے منصب کو نبھا دیا ہے اور اب اس کا کام عمر بھر اسی ایک کہانی یا نظم کا ڈھول پیٹتے جانا ہے —— اور اگر ہم بڑی خوش دلی سے اس کی منطق کو قبول کریں تو یہ امر ہمارے ادب کے دیوالیہ پن کا باعث ہو سکتا ہے۔ جسے ہم ادیب کہتے ہیں —— بڑے یا چھوٹے کی صفات کو بھول جائیے —— اسے لگاتار اچھا لکھ لکھ کر اپنی تخلیقات کا ایک مانومینٹ تعمیر کرنا ہوتا ہے اور اس مانومینٹ کو بھی ایک نظر دیکھتے ہوئے اسے ناکافی کا احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ بات تو رہ ہی گئی ہے —— ایسے ہی لکھنے والے ہوتے ہیں جن کی دھوپ ریکھا کو اپنے اندر جذب کر کے ادب ہر نئے دور میں نو بہ نو نکل آتا ہے۔

(۲)

کہانی کا قد آج کے بعض نقادوں کو بہت کھلنے لگتا ہے ـــــ اُنہیں بتائیے، جس کا جو قد ہوتا ہے اُسی سے اس کی ساری پھبن ہوتی ہے ـــــ مگر نہیں، یہ چاہتے ہیں اِن کی محبوبہ کا قد اتنا اونچا ہو کہ اُس کے کندھوں پر بیٹھ کے آسمان میں جا پہنچیں ـــــ ارے بھئی، اپنے پیروں سے دھرتی پر ہی جم کر کھڑے رہو، وہاں آسمان میں کیا رکھا ہے؟ ـــــ مگر نہیں، اِنہیں بہرحال ناول کی آسمانی طوالت درکار ہے۔

یہ درست ہے کہ ناول کے بڑے کینوس میں نہ صرف ناول کی کہانی کو بلکہ اُس کے سارے پڑوس کو بھی پھیلایا جا سکتا ہے لیکن اس کا کیا کیجئے گا کہ ہمارے دور میں بستیاں اتنی گنجان ہو گئی ہیں یہ پہلے کی طرح رہائش کے لئے بڑی بڑی حویلیاں آج کہاں مل بھی جائیں تو ساری تنخواہ تو ان کی مرمت کی نذر ہی ہو جایا کرے گی ـــــ پہلے جائنٹ فیملی سسٹم تھا۔ اب تو چھوٹی چھوٹی فیملیاں ہیں۔ ساری ضرورت چھوٹے چھوٹے فلیٹوں سے بخوبی پوری ہو جاتی ہے، پھر حویلیوں کے جھنجھٹ میں کیوں خواہ مخواہ پھنسا جائے؟ ـــــ ہاں یہ ضرور ہے کہ پاؤں پھیلانے کیلئے جگہ تھوڑی ہو تو آرام سے پاؤں پھیلانے کی خاطر قرینے کے شعور کی ضرورت رہتی ہے کہانی بھی ون روم ٹینیمنٹ ہے۔ اسی لئے با قرینہ ہوئے بغیر اس میں بود و باش ممکن نہیں۔ لیکن بڑی بڑی حویلیوں کی اگر گنجائش نہیں اور ہمیں بہرحال انہی فلیٹوں میں رہنا ہے تو قرینے کے شعور کے بغیر چارہ ہی کیا ہے؟

لیکن اگر جگہ بہرصورت زیادہ ہی درکار ہے تو دو یا تین بیڈ روم کا فلیٹ ہی تعمیر کروا لیجئے۔ اتنی بڑی حویلی کے لئے جگہ کہاں ہے؟ ـــــ اور حویلی کی ضرورت بھی کیا ہے؛ ـــــ جن کی حویلیاں ہیں بھی، وہ بھی انہیں توڑ پھوڑ کر چھوٹے چھوٹے کارآمد بنگلے بنوا رہے ہیں۔

کہانی اور ناول بھی نئے تقاضوں کے مطابق ایک دوسرے پر اثر پذیر ہو رہے ہیں۔ ناول سے کہانی کے تناؤ میں ڈھیلا پن سا آ گیا ہے۔ جس سے وہ کشادہ ہو گئی ہے اور کہانی سے ناول کا ڈھیلا پن ذرا تن کر دلکش ہو گیا ہے۔

تنقید کا اصل مسئلہ یہ نہیں کہ ناول کو کہانی سے یا کہانی کو ناول سے کمتر ثابت کیا جائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ کہانی کار اپنے موضوع کو ہیئت کے صحیح تناسب سے برت پائے، اُس کے برتاؤ سے خواہ ناول ذرا سی کہانی لگے اور کہانی ذرا سا ناول۔ اس نقطہ کی ہمدردانہ فہم کے بغیر نئی فکشن کی نشاندہی ممکن نہیں۔

---

(۳)

شروع شروع میں میرے کہانیاں لکھنے کے عمل میں میرا یہ نوعمر سا جذبہ کارفرما ہوتا تھا کہ اس طرح خود ایک کہانی بن جاؤں گا، لیکن آج کہانیاں مجھ پر کچھ یوں مسلط ہو گئی ہیں کہ اپنے آپ کو آزادانہ لکھواتی ہیں۔ میں اب اپنی کہانیوں میں بس اتنا ہی موجود ہوتا ہوں کہ انہی میں غائب رہتا ہوں، کچھ اس طرح غائب ہوتا رہوں کہ جو بھی نظر آتا جائے وہی بنتا چلا جاؤں ـــــ

---

(۴)

عام طور پر میں بہت احتیاط سے کام لیتا ہوں لیکن ایک بار ایک بڑی کومل کہانی عمل تخلیق میں میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور بے چاری کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ آج اس حادثہ کو کئی سال ہو گئے ہیں اور وہ کہانی بڑی جوان نکل آئی ہے بہت

خوبصورت ہے پر آج بھی لنگڑا کر چلتی ہے ـــــــ

---

(۵)

سنا ہے کسی کے سر پر بھوت سوار ہو گیا تو بھوت نکالنے والوں نے مار مار کر بھوت کا بھرکس نکال دیا اور پوچھا۔ "بتاؤ اب تم کون ہو؟"

"ٹھہرو، مجھے مارنا بند کرو، ابھی بتاتا ہوں"

"بتاؤ، جلدی بتاؤ!"

"میں ایک کہانی کار ہوں ـــــ ٹھہرو، مجھے مارو نہیں۔ میں سچ بول رہا ہوں ـــــ میں ایک کہانی کار ہوں اور یہ شخص میری ایک کہانی کا کردار ہے ـــــ ٹھہرو، مارو نہیں! میں ابھی اس کے سر سے نکل جاتا ہوں ـــــ"

اور سنا ہے جب کہانی کار اپنے کردار کے سر سے نکل گیا اور کردار نے آنکھیں کھولیں تو پوچھنے لگا۔ "میں کون ہوں؟ ـــ!"

---

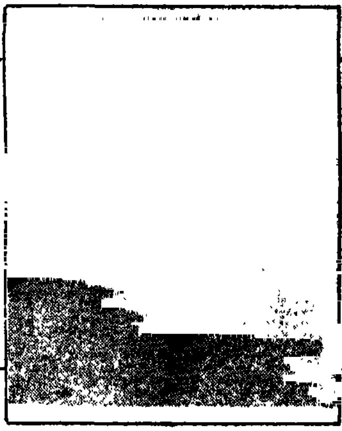
(۶)

میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ میری اچھی کہانیاں صرف میری نہیں، اُن کی بھی ہیں جو انھیں پڑھتے ہوئے اُن میں شریک ہو جائیں، سبھی کی ہیں۔ فن کا کام محض شخصی صلاحیتوں کو ثابت کرنا نہیں ہوتا۔ اچھا فن پارہ سبھی کی ساجھی ملکیت ہوتا ہے، کیونکہ اس میں ایک شخص کی فہم کی بجائے بنی نوع انسان کے ادراک کا کل ورثہ بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اُس فن پارے کا مجھ سے یا آپ سے لکھا جانا ایک اتفاقیہ امر ہے، جیسے میں اور آپ بنیادی طور پر اتفاق میں اور آپ ہیں۔

---

(۷)

جھوٹ موٹ کے تکنیک کا مسئلہ سچ مچ کے لکھنے والوں کا مسئلہ نہیں۔ جس طرح جانداروں کے چہروں میں ہم ان کی روحوں سے مل لیتے ہیں اسی طرح تکنیک میں بھی تحریر کی روح آباد ہوتی ہے نہ ہو تو تکنیک کا مکھوٹا نوچ پھینکئے، آپ دیکھیں گے کہ اس کے کندھوں کے اوپری درمیان میں کوئی چہرہ ہے ہی نہیں۔



چھوٹی صنف کا بڑا شاعر

جمال پانی پتی

نگار صہبائی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مروجہ اصنافِ سخن سے کیا تھا۔ پورے دس گیارہ سال تک وہ مسلسل غزلیں، نظمیں اور قطعات لکھتا رہا لیکن پھر ایک دن اس نے اپنا راستہ بدل دیا اور سلیم احمد کے اشارے پر پورے دس گیارہ سال کی کمائی لٹا کر گیت کے سفر پر چل نکلا۔ یہ بڑے حوصلے کی بات تھی خصوصاً اس صورت میں جبکہ اردو میں گیت کی روایت بجائے خود بڑی کمزور اور غیر معتبر تھی۔ میرا جی کے بعد اس روایت میں کوئی سنجیدہ اور بڑا کام نہ ہو پایا تھا۔ ہوتا بھی کیسے جبکہ اردو میں یہ روایت ہلکے پھلکے جذبات کو ہندی کے چند سہل الفاظ کی مدد سے مترنم انداز میں ڈھال کر پیش کر دینے تک محدود تھی۔ عظمت اللہ خاں، میراجی اور مقبول حسین احمد پوری کے گیتوں کا حشر تو خیر سبھی کو معلوم ہے ہی اب رہ گئے علامہ آرزو لکھنوی، ایسے ضرور تھے جن کے گیت اردو میں مقبول ہوئے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے گیت کو اس کی عام رومانی اور جذباتی سطح سے اونچا اٹھا کر نہ صرف اپنے دور کے بعض اہم سماجی اور سیاسی موضوعات کے اظہار کا آلہ کار بنایا بلکہ اسے ایک سنجیدہ مزاج اور نیا آہنگ بھی دیا لیکن ان کے گیتوں کی تمام تر مقبولیت کے باوجود ان کی گونج فلمی دنیا کے باہر ذرا کم ہی سنی جا سکی۔ ایسے میں نگار صہبائی کا غزل اور نظم کی شاہراہ کو چھوڑ کر گیت کے ویران راستے پر نکل جانا گویا اپنے پورے ادبی کیریئر کو داؤں پر لگانے کے مترادف تھا۔ لیکن ہوا یوں کہ اس کے پہلے ہی گیت نے یاروں کو چونکا کر رکھ دیا۔

پورن کے رتھ پر بیٹھ کے آئے ساون بھادوں میرے دوار

اور

جھکے پسارے جلوں کی ٹولی آئی ندیا کے پار

اس کے پہلے ہی گیت کے یہ بول نہ صرف یہ کہ گیت کی عام ڈگر سے بہت مختلف تھے بلکہ اس کے اندر چھپے ہوئے ایک سچے اور خوبصورت گیت کار کی خبر بھی دے رہے تھے۔ یاروں نے اس کی حوصلہ افزائی کی تو نگار نے بھی گیت کی صنف کو مکمل طور پر اپنا لیا اور پوری ذہانت اور سچائی کے ساتھ اپنے تجربات اور محسوسات کو گیت کی زبان دینے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کا جوہر کھلتا گیا اور اس کی آواز نکھرتی گئی اور اس کے گیت اپنا ایک الگ لب و لہجہ بناتے چلے گئے۔ ہر نئے گیت پر یار لوگ اس کے اندر نئی صلاحیتوں کے معترف ہوتے گئے یہاں تک کہ آج سے کوئی بیس سال پہلے جب اس کا پہلا مجموعہ "جیون درپن" شائع ہوا تو اس کے گیتوں کی ادبی

اور فنی حیثیت مسلّم ہو چکی تھی اور جاننے والے یہ بات جان چکے تھے کہ گیت کی دنیا میں ایک بہت وقیع اور بڑا نام ابھر کر سامنے آیا ہے [illegible]
نگار صہبائی نے اپنے ابتدائی گیتوں کے پس منظر کے لئے ہندیا نہ متھرا گوکل کاشی ایودھیا شیام وغیرہ کو [illegible]
روایت سے اٹھائے اور ان کا تار و پود برصغیر کے موسموں، کھیتوں، باغوں، پھولوں، چاندنی راتوں، [illegible] وغیرہ سے تیار کیا
ہندوستان کے موسموں کی بو باس، وہاں کا ماحول، آب و ہوا اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ قدرتی مناظر کی رنگا رنگی ان کے
ان گیتوں میں ہندی دیو مالا کے عناصر کے ساتھ آمیز ہو کر اپنے تمام حسن اور رچاؤ کے ساتھ ہندی الفاظ [illegible] ان
گیتوں کو دیکھیئے تو عجیب سماں نظر آتا ہے۔ کہیں موہن مرلی کی مدھر تان بن کر رادھا کی [illegible] اور کہیں کوئی داسی
پریم کی پیاسی، ماتھے بندیا سجائے، نینن دیپ جلائے پیا ملن کی آس میں مندر کی [illegible] ہے۔ کہیں پنگھٹ کی راہوں میں نٹ کھٹ
شیام، رادھا کا راستہ روک کر آنچل کھینچ لیتے ہیں۔ وہ آنچل چھڑانے کی کوشش کرتی ہے تو شیام آگے بڑھ کر کلائی تھام
لیتے ہیں۔ وہ بنتی کرتی ہے کہ

مُرلی کی سوگند چھوڑو کلائی
پاؤں پڑوں میں سیس نوائی
سکھیوں کی پائل بجتی ہے چھم چھم
مارے شرم کے میں کٹ جاؤں
[illegible]

کہیں ساون بھادوں پون کے رتھ پر بیٹھ کر آئے ہیں اور برکھا کی رت اور شام [illegible] بجلی
چمکتی ہے، کوئل کوکتی ہے۔ آم کے باغوں میں جھولے پڑتے ہیں اور سکھیاں مل جل کر [illegible] گیت
سناتی ہیں اور مہوے کی ڈالی پر بیٹھا پنچھی تان اڑاتا ہے۔ دور کہیں دھان کے کھیتوں میں [illegible] کے ساتھ
سہیلیاں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامتی ہیں۔ اور کہیں ساجن کے سنگ [illegible]
میں سپنے تتلی بن کر ناچنے لگتے ہیں۔

دھان [illegible] ساجن کے سنگ [illegible]
سپنے تتلی بن کر [illegible]

ایک طرف چندا [illegible] تو دوسری طرف [illegible]
بھی ہوتا ہے کہ من کے میت [illegible]
کے موتیوں سے دھرتی کا روپ نکھر آتا ہے۔ کوئی [illegible]
ہیں۔ گات کنول سے آنچل [illegible] ہیں۔ اور روپ چندن سے [illegible]
کھلنے لگتی ہیں۔ اور جیون کا روپ [illegible]

گات کنول سے آنچل [illegible]
[illegible]
[illegible]

ایسی تصویریں نگار کے ابتدائی کلام میں بکثرت نظر آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زندگی کا سارا حُسن، اور حُسن کے سارے رنگ اس کے گیتوں میں سمٹ آئے ہیں۔ جب کوئی البیلی نار اپنے چال سنگیت میں مگن برسات کے جلترنگ سے بجاتی ہوئی گزرتی ہے تو اس کے پیروں تلے نگار کے گیت جنم لینے لگتے ہیں۔

سن ری سکھی موری پائل کی چھن
میں چلوں تو ستائے لٹائے گگن
میں رکوں تو ہر اک تال میں کتنے سم
میرے پیروں تلے گیت لیتے جنم
چال سنگیت میں میرا تن من مگن

نگار کے گیتوں میں ایسی گھلاوٹ، ایسی سندرتا، ایسی مدھرتا اور ایسا رچاؤ ہے کہ بایدوشاید۔ اُسے اپنے فن پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ وہ جہاں اپنی بات حسب موقع انتہائی سادگی اور پُرکاری سے کہنے کا ہنر جانتا ہے وہاں انتہائی فنکارانہ نزاکت اور حسن پیدا کرنے پر بھی پوری طرح قادر ہے۔ اس کے گیتوں میں جا بجا ایسی تازہ ایسی خوبصورت اور ایسی نادر تشبیہیں، استعارے، امیجز (images) ملتی ہیں کہ ہم اس کے کمالِ فن کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مثلاً ایک جگہ پائل کی جھنکار کا بیان کتنا خوبصورت ہے۔

موری پائل میں برسات کے جلترنگ
جیسے جھرنوں کے سنگ ناچے مہوے کا بن

یا ایک اور جگہ سورج غروب ہونے کا منظر یوں بیان ہوا ہے۔

ڈوب رہا ہے سورج جیسے مہندی کوئی چھڑائے

کمالِ فن کے ایسے ہی خوبصورت، دلآویز اور بے مثال نمونے اس کے گیتوں میں جا بجا دامنِ دل کو کھینچ لیتے ہیں۔ اس کا نادرہ کار تخیل ایک سے ایک حسین تصویر اور ایک سے ایک خوبصورت پیکر تراشتا چلا جاتا ہے۔ بے جان مناظر میں اس کے فن کی جادوگری سے جان سی پڑنے لگتی ہے۔ اور بے زبان تصویریں اسکے اعجازِ نفس سے بول اٹھتی ہیں۔ اس کے کسی بھی گیت کو اٹھا کر دیکھ لیجئے اس کی حسن کاری اور پیکر تراشی کی گواہی دیتا ہوا ملے گا۔

ابھی وہ اپنے نگار خانۂ فن کو رنگا رنگ تصویروں سے سجانے میں مصروف تھا کہ اچانک اس کی تصویروں کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ جیسے کسی ہولناک اور مہیب منظر نے دفعتہً اسے مبہوت کر دیا ہو۔ ابھی وہ اپنے گیتوں کی کیاری سینچ ہی رہا تھا کہ اچانک بادِ صرصر کے تند و تیز جھونکوں سے اس کے سارے پھول مرجھا کر رہ گئے۔ ہجر و وصال کے موسموں کے درمیان دکھ سکھ کی گھٹتی بڑھتی چھاؤں میں نشاط و الم کے گیت گاتے گاتے اچانک اس کی آواز گلوگیر سی ہو کر رہ گئی۔ ایسا لگتا ہے جیسے بانسری سے سُر کا ناتا ٹوٹنے ہی والا ہو۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کے گیتوں کی مالا کوئی دم میں ٹوٹ کر بکھرنے ہی والی ہے۔ من مندر کے سارے دیپ ایک ایک کر کے بجھنے لگے تو کاشی اور متھرا کی وہ گلیاں بھی سنسان اور بے چراغ ہونے لگیں جو کبھی شیام کے من سے جاملتی تھیں اس کے ابتدائی گیتوں کے بعد "جیون درپن" کے گیتوں کے پیچھے سے ایک عجب طرح کی اداسی اور ویرانی جھانکنے لگتی ہے۔ اس سے پہلے جو رنگ اور ترنگ، جو مستی اور سرشاری اسکے گیتوں کی جان تھی اب جیسے اچانک وہ کہیں غائب ہو کر رہ گئی اور اس کی جگہ

تلخ اور سوگوار سی فضا اسکے گیتوں میں در آئی۔

رک گئی شیام کی بنسی دیکھو
چھاؤں کرم کی بھاگے
بکھر چلے ہیں سارے پتّے
من بینا کے سُر ہیں سچے
سات سروں کے پھیر سے باہر
رادھا راگ الاپے
مند ہیں نین کوارے

سکھ کے گھاؤ ہیں دکھ سے گہرے
میں یہ کیسے بتاؤں
پل چھن کا تھا جیون سارا
اب کیا دیپ جلاؤں

دکھ میں دھیرج دور کہیں
مرے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے
مری آشا جوڑا کھولے کھڑی
یہ ودھوا سوگ منائے

میں چپ ہوں مرا جیون چپ ہے
یہ ٹونا بھی کب تک
من اندھیارا رات اندھیاری
بجھ گئے گیت کے دیپک
ٹوٹے بین تو جاتوں پیار
اور ساون کی چنچل نار

گیتوں کا ذائقہ پہلے گیتوں سے بہت مختلف ہے۔ کوئی سانحہ، کوئی حادثہ ایسا ضرور ہوا ہے جس کے سبب سے شیام کی ...ارک گئی ہے۔ اور بنیا جیون ٹوٹے درپن کی مثال سو ٹکڑوں میں بکھر کر رہ گیا ہے۔ کوئی طوفان، کوئی آندھی ایسی ضرور ...ہے جس نے میٹھے اور مدھر گیتوں کی کیاری سینچنے والے کوی کا راستہ روک کر اسے تھوڑی دیر کے لئے اس سوچ میں ...دیا کہ وہ آگے بڑھ کر اس طوفان کا مقابلہ کرے یا سہم کر پیچھے ہٹ جائے۔

بیتا جیون ٹوٹا درپن
بکھر گیا ہوں سو ٹکڑوں میں
ہر درپن میں ہے اک آندھی
سو طوفان ہیں ان رستوں میں
ان رستوں سے جانا ہے اب
پاؤں بڑھاؤں یا روکوں

لیکن نگار ہار ماننے والا آدمی نہیں تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری اور گھر کو آگ لگتے دیکھ کر پیچھے ہٹنے کی بجائے اسی آگ میں پھول کھلانے پر کمر بستہ ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ نگار صہبائی بنیادی طور پر ایک فنکار ہے۔ زندگی نے اسے ہزار دکھ دیئے اور لاکھ زخم لگائے لیکن وہ انھیں ہنس ہنس کر سہتا رہا۔ اور زندگی کے دکھ اور سکھ کے راستے سے زندگی کی معنویت کا سُراغ پانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے صحیح معنوں میں اپنے خونِ جگر سے اپنی کشتِ فن کی آبیاری کی اور اپنی شاعری کو زندگی کا آئینہ بنا کر رکھ دیا۔

اپنی آواز کو پانے، اپنے اسلوب کو سنوارنے، اس کے خد و خال کو نکھارنے اور اپنی شاعری کو اپنے تجربات کا کامل اظہار کا آئینہ بنانے کی جد و جہد میں اس نے بڑے انہماک اور تخلیقی لگن کا ثبوت دیا۔ اسے معلوم تھا کہ ہر سچے فن کار کی زندگی اس کے فن کے لئے ایک تجربہ گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ سو ایک طرف تو اس نے اپنے آپ کو ہر قسم کے تجربات کے لئے ہمیشہ کھلا رکھا۔ اور دوسری طرف ان کو ان کی تمام تر تلخی، ترشی اور شیرینی کے ساتھ اپنے فن میں سمونے کی کوشش کی۔ اپنے ابتدائی گیتوں میں اس نے ہندی دیو مالائی روایت کے کرداروں کو ایک خاص طرح کی زندگی کی تصویر کشی کے لئے استعمال کیا تھا۔ اپنے سفر کی اگلی منزل میں اس نے ان کرداروں سے تخلیقی طور پر زیادہ بہتر انداز میں کام لینا سیکھا۔ اب شیام اور رادھا وغیرہ کردار تو وہی رہے لیکن ان کے پردے میں وہ اپنی زندگی کے سچے تجربات اور محسوسات کو گیت کی زبان دینے لگا۔ لیکن یہ کام کچھ ایسا آسان بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے تجربات کے بعض پہلو جنھیں وہ اپنے فن میں سمونا چاہتا تھا اس قدر تلخ اور ہولناک تھے کہ گیت کی عام زبان ان کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ نگار کی اعلیٰ درجے کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ کرنے کے لئے یہی ایک بات کافی ہے کہ اس نے اس مشکل مرحلہ کو جس آسانی اور خوبصورتی کے ساتھ طے کیا وہ کسی معمولی درجے کے فنکار کے بس کی بات نہیں تھی اور یہیں سے اس کا فن اپنے ارتقا کی ایک اہم منزل سر کرتا نظر آتا ہے۔ ذرا دیکھئے تو سہی اس نے اپنے تجربات کے کیسے کیسے اذیت ناک اور زہریلے گوشوں کو کس فنکارانہ حسن و کمال کے ساتھ اپنے نگار خانۂ فن کی زینت بنا لیا ہے۔

نینن جوت اک دیپ جلائے
دیپک رانی میرا دیپک
دو سجے گھر رکھ آئے
اب کس کو بتیاؤں
پگ پگ ٹھوکر کھاؤں

کجرا لاگے پاپ کی کالک
کالک کون لگائے
جی سے اترا روپ سنگھار
اور ساون کی چنچل مالا

جلتے دیپ میں سوتا دیپک
دیکھوں جی گھبرائے

دو جے دیئے کی جوت جو جاگے
جانے کیا ہو جائے

نین کی جوتی روپ کسوٹی
کاجل کو بہروپ بتائے
تن سے من کی جوت نہ جاگے
ویسے گھر جل جائے

شیتل سیج ہے پھلواری میں
میں ہنستا ہوں چنگاری میں

یہ اس اذیت ناک تجربے کے چند مختلف گوشے ہیں جس نے ایک طوفان کی صورت نگار کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اور جس کے سبب اس کے گیتوں کی مالا ٹوٹ کر بکھرنے والی تھی۔ نگار نے اپنے تجربے کے بعض اجزاء کو پورے تجربہ سے الگ کرکے پیش کرنے کی بجائے اپنے پورے تجربہ کو اس کی تمام تر اذیت ناکی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ بات بجائے خود اسکی فنکارانہ دیانت کا ثبوت تو خیر فراہم کرتی ہی ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر ہمارے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ایسے تلخ تجربات کو ان کی تمام تر تلخی اور اذیت ناکی کے ساتھ اپنے شعری تجربہ کا موضوع بنانے کی ہمت جدید اردو شاعری میں کتنے لوگوں نے کی ہے۔ بہر صورت، جیون درپن کے صفحات میں بکھری ہوئی اس تجربے کی مختلف جزئیات کو ملا کر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ شیام نے کبھی نینن جوت سے جو دیپ جلایا تھا۔ جب دیپک رانی کے ہاتھوں وہی دیپ دو جے گھر جا پہنچا تو شیام اندھیروں میں بھٹک کر رہ گیا اور اندھیروں میں پگ پگ ٹھوکر کھاتے اس کی آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے من مندر کے کواڑے اس پر بند ہو چکے ہیں۔ تن کا ناتا جھوٹا پڑ گیا تو من کی سچائی بھی مشکوک ہو گئی۔ جلتے دیپک میں سوتا دیپک دیکھ کر طرح طرح کے توہمات نے چاروں طرف سے آن گھیرا۔ لیکن ایک آخری سہارا آس کا ابھی باقی تھا جس نے یہ کہہ کر ڈھیر بندھائی کہ سمے کی کالک سمے کے ہاتھوں ہی ڈھل سکتی ہے۔ ایک بات تو پہلے ہی سمجھ میں آ چکی تھی کہ جیون کا کھیل ایک ساگر کی مانند ہے جس میں دکھ اور سکھ کے گھر بنے ہوتے ہیں اور اگر انسان کسی بھی حالت میں آس کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور دکھوں کے بیچ ہنس ہنس کر جینے کا ہنر سیکھ لے تو جیون کی ہاری ہوئی بازی پھر سے جیتی جا سکتی ہے دوسرے رخ سے دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ رادھا رانی اپنی کھوئی بندیا ڈھونڈتی پھرتی ہے اور اس کی تلاش میں ناکامی سے یہ سوچ سوچ کر گھلانے لگتی ہے کہ اب شیام کو کیا منہ دکھائے گی۔ رفتہ رفتہ سارے پرانے سپنے نینن جل کے ساتھ بہ جاتے ہیں۔ اب رادھا رانی اپنی بھول پہ پشیمان ہوتی ہے کہ من کی گاگر بھری تھی تو کسی ساگر پر جا کر اشنان کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ادھر شیام کے من میں بھی اندھیارا ہے جس کے دیپک بجھ چکے ہیں۔ سارا سنسار جھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ اور اسے اپنے من میں ایسی شکتی کی تلاش ہے جس سے بن باجے راگ بج سکتی ہو۔ وہ رادھا کو طعنے دیتا ہے کہ جس مندر کے سارے دیپک بجھ چکے ہوں اس میں بھجن سنانے سے کیا حاصل؟ اور جھوٹے

جیون کے سواگت کے لئے ایسی تھال سجانے کے کیا معنی جس میں لاج کا دیپک نہ جلتا ہو اور نہ بجھتا ہو. رادھا یہ سب کچھ سن کر بھی دونوں کی بات نبھانے پر مصر ہے. اس سے شیام کی سمجھ میں یہی بات آتی ہے کہ اس میں پریم کی سچائی ضرور ہے. آخر کار جلتے دیپک کو بجھانے کے لئے سوتا دیپک جاگ اٹھتا ہے اور دیپک رانی من مندر میں دیپ جلانے آتی ہے. آشا پھر سے پھرائے ہوئے نینوں میں جوت جگاتی ہے شیام کھوٹ اگن سے پیچ کا کندن اٹھا کر لاتے ہیں اور پریم گھاٹ سے اٹھ کر آنے والے بادل چھم چھم امرت برسانے لگتے ہیں. آخر میں رادھا رانی ایک خوبصورت گیت گاتی نظر آتی ہے۔

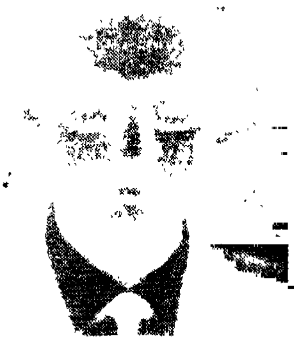
من کی چتر یا رنگ دو ساجن
دوجے روپ نہ بھاؤں
دوجے درپن میں کیا دیکھا
اک اندھیارا کاجل جیسا
کاجل میں وہ جوتی دیکھی
جس سے رستہ پاؤں
میری سندریا جیون درپن
نین اٹھاؤں تم کو دیکھوں
نین جھکاؤں تم کو دیکھوں
اُتّر سے تم اتر رہے ہو
دکّھن سے تم ابھر رہے ہو
پورب دیکھوں تم کو پاؤں
پچھم دیکھوں تم کو پاؤں
سندر یا کیسی جیون درپن
تم میں جیون درپن پاؤں

اور باتوں سے قطع نظر یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ایسے تلخ تجربے کو سہارنا کوئی معمولی بات نہ تھی. لیکن نگار اس تجربے کو سہار لے گیا اس کی داد تو خیر اسے جاتی ہی ہے مگر اس سے زیادہ قابل داد بات یہ ہے کہ اس نے اس تجربہ کو اس کی تمام تلخی اور ترشی کے ساتھ اپنے گیتوں میں سمو کر تخلیق فن کا ایسا حیرت انگیز کرشمہ دکھایا جو بجائے خود اس کی اعلیٰ درجہ کی فنی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے. نگار کی شاعری کو اس کی زندگی کے حوالے سے دیکھنے پر سمجھ میں آتا ہے کہ آگ میں پھول کیسے کھلتے ہیں اور زہر کو امرت کیسے بنایا جاتا ہے۔

جیون درپن کی اشاعت سے پہلے ہی لوگوں کو محسوس ہونے لگا تھا کہ گیت میں اس دور کی ایک نئی اور اہم آواز ابھر رہی ہے۔ کم و بیش اس زمانے میں نگار کے بارے میں ایک فقرہ سننے میں آیا. چھوٹی صنف کا بڑا شاعر. ایک بات تو ہے کہ فقرہ کہنے والے کو نگار کی شاعری کی بڑائی سے انکار کرتے نہ بن پڑا تو اس نے اسے چھوٹی صنف کا طعنہ دیا. نگار پر اس فقرہ کا ردِعمل تو مجھے نہیں معلوم، اور چھوٹی بڑی صنف کے فرق کو بھی میں نہیں جانتا. لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ بڑ

صنف ہمیشہ بڑی شاعری کی مرہون منت ہوتی ہے اور نگار کی شاعری اگر بڑی ہے تو جس صنف میں وہ لکھ رہا ہے اس میں بھی بڑائی کا عنصر کچھ نہ کچھ تو آنا ہی چاہیئے۔ سو "جیون درپن" سے "من گاگر" تک آتے آتے نگار نے گیت کی روایت میں نئے اور حسین تر رنگوں کا اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ گیت کی صنف کو بھی یکسر منقلب کر کے اس کے امکانات کو اور زیادہ وسیع کر دیا اب اس کے ہاتھوں گیت میں نئی جہات (DIMENSION) کا اضافہ ہو رہا ہے اور ساتھ ہی وہ کچھ ایسے عمیق تر اور پیچیدہ تر تجربات کو بھی اپنے گیتوں کی لے میں ڈھال رہا ہے جن کے بارے میں سلیم احمد کا خیال ہے کہ جدید اردو شاعری کی روایت میں ابھی تک کسی نے انھیں ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وہ ایک طرف تو گیت کی ہندی روایت کو اسلامی روایات کے قالب میں ڈھال رہا ہے اور دوسری طرف اپنی جذباتی زندگی کے جن مسائل سے وہ "جیون درپن" میں الجھ رہا تھا، ان کا سلسلہ اس نے "من گاگر" میں حیات و کائنات کے بڑے اہم اور بنیادی سوالات سے ملا دیا ہے۔ "جیون درپن" میں اس کا بنیادی مسئلہ تن اور من کی کشمکش سے متعلق تھا تو اب اس کے ہاں تن اور من، گاگر اور ساگر، پل اور جگ سب مل کر ایک ہو رہے ہیں۔ پہلے وہ کسی طوفان سے دوچار ہو کر آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کے بارے میں سوچتا تھا، لیکن اب حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا دکھائی دیتا ہے۔ پہلے وہ ہندو دیومالا کے کرداروں کو ہندی زبان کے قالب میں ڈھال کر پیش کرتا تھا تو اب وہ ہندی زبان کے الفاظ میں سورہ رحمٰن کا آہنگ سمو رہا ہے۔

"جیون درپن" میں اس کا سفر اپنی ارتقائی منازل میں تھا تو "من گاگر" میں اس کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اور اس کی شاعری اپنی مخصوص صنف کی حدود و قیود سے بالاتر ہو کر "ورائے شاعری" کی سرحدوں کو چھونے لگی ہے۔ وہ لوگ جو کبھی اسے چھوٹی صنف کا بڑا شاعر ہونے کا طعنہ دیتے تھے۔ اب وہی لوگ اسکے گیتوں میں جا بجا اعجازِ فن کی بجلیاں سی کوندتے دیکھ کر بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں کہ نگار گیت کی صنف میں غزل کے شعر لکھ رہا ہے۔ اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ گیت کی صنف کو اعتبار اور وقار کے اس مرتبہ تک پہنچنے کے لئے نہ جانے کب سے نگار صہبائی کا انتظار تھا۔



نئے افسانے کا قد آور بونا

نجم الحسن رضوی

نئے افسانے کے بعض معترضین کو اکثر یہ گہرافشانی فرماتے ہوئے دیکھا گیا ہے کہ منٹو اور اس کے ہم عصروں کے بعد اردو افسانے میں دیوزادوں کا دور تو رخصت ہوا۔ اور افسانے کا فن محض "بونوں" کے ہاتھ آیا جو نہ تخلیقی اہمیت کے اعتبار سے اپنے پیشروؤں کے ہم پلہ ہیں اور نہ ہی انہیں قبول عام کے لحاظ سے گزرے ہوؤں کے برابر گردانا جاسکتا ہے اور اسی وجہ سے وہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے شعبدہ بازی کی طرف مائل ہیں۔ میرے خیال میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اور گزشتہ پندرہ بیس سال کے دوران افسانے کے سفر کو مدنظر رکھئے تو لگتا ہے کہ افسانے کو نئے تخلیقی امکانات سے ہمکنار کرنے کا کارنامہ انہیں "بونوں" نے سرانجام دیا ہے جن میں ایک نام رشید امجد کا ہے، ان لوگوں نے افسانے کو کچھ اور دیا ہو یا نہ دیا ہو اسے نئے لہجے اور تفکر کی دولت سے مزید مالامال کیا۔ رشید امجد کی عطا بھی یہی ہے کہ انہوں نے نئے افسانے میں تفکر اور تعمق کو مکالمہ بنایا۔ اس سلسلے میں مجھے اندیشہ یہ ہے کہ لوگ یہ مطالبہ کریں گے کہ یہ بھی بتایا جائے کہ اس سے خود افسانے کی مقبولیت میں کیا اضافہ ہوا۔ اور آیا یہ کہ اس سے افسانے کے پرستاروں میں اضافہ ہوا یا افسانے کے دائرہ اثر میں کمی واقع ہوئی تو اس سلسلے میں محض یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ قبول عامہ فن کے لئے اچھی چیز ہے مگر لازمی نہیں۔ اس کا انحصار خود لکھنے والے کی خواہش پر ہے کہ وہ اپنے فن کے ذریعے فن پرستوں کے کن حلقوں تک رسائی چاہتا ہے۔

ادبی حلقوں میں نئے افسانے میں کہانی پن کے فقدان، علامت و تجرید اور ابلاغ کے بارے میں بار بار گفتگو ہوتی رہی ہے لیکن اس کا کوئی خاطرخواہ نتیجہ کبھی برآمد نہیں ہوا۔ وجہ شاید یہ ہے کہ نئے افسانے کی دنیا میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے اور نئے افسانے کے لوازمات، علامتی کہانی کے اجزاء اور خود علامت و تجرید کی ضرورت اور دیگر تکنیکی معاملات کے بارے میں دو علامتی کہانی لکھنے والے شاید مشکل ہی سے اتفاق رائے کر سکیں۔ خود میں افسانہ نگاروں کے جس مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہوں اس کا خیال ہے کہ افسانہ نگاروں کو کہانی کہنے کا بنیادی فرض پورا کرنا چاہئے۔ اور علامت کا استعمال کہانی کو موثر بنانے کے لئے ہونا چاہئے یعنی علامت کہانی کے تابع ہو نہ کہ کہانی علامت کی؛ خود اس گروہ میں بھی اختلاف رائے کی کمی نہیں میرا اپنا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کہانی کو دو سطحوں پر پھیلانا چاہئے۔ ایک عام سطح پر جہاں کہانی واقعاتی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے۔ اور دوسری خالص INTELLECTUAL سطح پر جہاں کہانی اپنے عمومی ماحول سے بلند ہو کر اشاراتی اور علامتی معانی کی سعی کرے۔ مقصد یہ ہے کہ افسانے کی ریڈرشپ کو محدود نہ ہونے دیا جائے اور ہر قاری کو اس کی استعداد کے مطابق متاثر کرے۔ میرا ایمان یہ ہے کہ سوچنا انفرادی عمل ہے مگر لکھنا اور خاص طور پر اشاعت کے لئے قاری کی آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے سو جب لکھنا ایک سماجی عمل ٹھہرا تو پھر قاری کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہوگا اور اسے بہرحال علم و ادب کی جمہوریہ میں مناسب نمائندگی دینی ہوگی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کہانی کو پلیٹ میں رکھ کر قاری کو پیش کرنے کی وکالت کر رہا ہوں۔ ہرگز نہیں میرا مدعا

ہے کہ کہانی کو کلچر کیا جائے جیسے سچے موتیوں کو کلچر کیا جاتا ہے۔ رشید امجد نے بھی یہ کام اپنے انداز میں کیا ہے اور ... نے کہانی کو کلچر کیا ہے۔
یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ وہ رونا تو اسی بات کا ہے کہ ان کے یہاں کہانی ہی تو PERSONA NONGRATA بنی ہوئی ہے۔ ایسے تو ان پر اور بھی الزامات عائد کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً تجرید اور ابہام کے ... ان سے ہمدردی ہے اس سے کہ ... ان کی نیت صاف تھی اور بیزار آدم کے بیٹے، اور پھر ریت پر گرفت کے افسانوں میں انہوں نے زندگی کے جن سبک رفتار لمحوں کو گرفتار کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ تھے ہی ایسے ...... اسی وجہ سے رشید امجد کی کہانیاں زیادہ تر صرف ایک ہی سطح پر پڑھی جاتی ہیں یعنی فکری سطح پر ایک خاص فکری سطح سے نیچے ان افسانوں میں شاید عام پڑھنے والوں کو، بے معنویت کے جزیرے ہی نظر آئیں۔

ابلاغ کے باب میں لفظ و معنی کی بحث بجائے خود اب بہت پرانی ہو چکی ہے اور یہ مسئلہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسان۔ ادبیات اور لسانیات میں بھی اس موضوع پر دفتر کے دفتر سیاہ کیے جا چکے ہیں۔ دورِ جدید کے انگلستان میں یہ بحث پہلی بار اس وقت منظر عام پر آئی جب ۱۹۲۳ میں اوگڈن اور رچرڈز کی کتاب THE MEANING OF MEANING شائع ہوئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے تہذیبی تبدیلیاں آتی گئیں یہ بحث زیادہ بلند آہنگ ہوتی گئی کیونکہ یہ خیال زیادہ واضح ہوتا گیا کہ ہر تہذیبی اور تمدنی بحران لسانی سطح پر بھی بحران پیدا کرتا ہے۔ ایک برطانوی ماہر لسانیات پروفیسر سی۔ ایل۔ این نے اپنی تصنیف، لفظ اور علامت میں لکھا ہے کہ ہمیشہ تہذیبی انتشار اور تمدنی تغیر کے دور ہی میں کسی مخصوص، لسانی صلاحیت، کے خلاف آواز بلند کی جاتی ہے یا اسے پھر سے دریافت کیا جاتا ہے۔ اس کے الفاظ میں لسانی صلاحیت سے زبان کی وہ تاثیر مراد ہوتی ہے جس سے اس عالم موجود میں کسی ذاتی تجربے کو موثر انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ پروفیسر این کے خیال کے مطابق علامت کی ضرورت اسی وقت پیش آتی ہے جبکہ عام مستعمل الفاظ ماورائے مشاہدہ حقیقت کو بیان کرنے سے قاصر ہوں درحقیقت نئی زبان اور نیا طریقۂ اظہار پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جب کسی نئے اور غیر معمولی تجربے کو بیان کرنا مقصود ہو لیکن یہاں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ علامتیں نظر کے شیشوں کی طرح ہوتی ہیں۔ جو اگر غلط لگ جائیں تو منظر صاف ہونے کے بجائے دھندلا جاتا ہے اور یہی وہ کیفیت ہے جسے ہم ابہام کہتے ہیں لیکن اگر رشید امجد کے یہاں کوئی ابہام ہے تو اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہے۔ کہ نظر کے شیشے غلط لگ گئے ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ لوگوں کی نظر احساسات کی اس دنیا تک نہیں پہنچتی جہاں رشید امجد کا دل دھڑکتا ہے دراصل اس کے افسانوں میں چیزیں کم دکھائی دیتی ہیں۔ آوازیں زیادہ سنائی دیتی ہیں لگتا ہے کچھ یوں ہے کہ جیسے لکھنے والا آنکھیں موندے لیٹا ہے اور اپنے چاروں طرف پھیلی آوازوں کو اپنی روح کے اندر سمیٹ رہا ہے کبھی کبھی وہ ذرا سا آنکھ کھول کے ادھر ادھر دیکھ لیتا ہے تو وہاں وہ اس زندگی کا ایک لمحہ کھینچ لیتا ہے اس کے پردۂ ذہن پر محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہ پھر اسی آواز کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو کسی ان دیکھی دنیا سے آ رہی ہے۔

میں نے غور کیا تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے رشید امجد کے افسانوں، اس کے بیشتر کرداروں اور خود رشید امجد کا مسئلہ اپنی شناخت کا مسئلہ ہو۔ اس کے بیشتر افسانے CRISIS OF IDENTITY کے افسانے ہیں اس مسئلے کی دو پرتیں اور دو جہتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ اس کا بنیادی کردار۔ بے چہرہ ہے جو ایک منتشر اور سماجی اور تمدنی بحران کے شکار معاشرے میں اپنی جستجو میں نکلا ہوا ہے اپنی پہچان اور اپنی شناخت کے لیے بے چین۔

ہم کیا ہیں؟ یہ سوال اس مجموعے کے پہلے ہی افسانے نارسائی کی شمعیں میں جلتے چہرے سے ٹکراتا ہے۔

ہم جو گھنے سیاہ درختوں کی ریشمی ملائم چھاؤں میں۔

سبز مخمل گھاس پر، خود کو جاننے، پانے کی آرزو میں۔

اپنی سوکھی انگلیوں کو اپنی ننگی ہڈیوں پر پیٹتے ہیں۔ ہم بھی کیا ہیں؟

یہ تلاش ہمیں رشید امجد کے تمام افسانوں میں ملتی ہے اپنی تلاش، اپنی جستجو، خوف کی ایک زنجیر میں ... فرد کے ...

پر یہی سوال ہے۔ میں کون ہوں؟ وہ کون ہے جو مجھے بلاتا ہے؟ خود کو دریافت کرنے اور خود کو پانے کی خواہش بار بار اس کے لبوں تک آتی ہے اور یہ سوال کہ وہ ہے بھی یا نہیں؟

میاں تم پلیٹ فارم کی بات کرتے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے جیسے ہم ابھی تک اپنی ماں کے پیٹ ہی سے باہر نہیں نکلے!
تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے۔؟

(تشبیہوں سے باہر ایک پھڑپھڑاہٹ)

رشید امجد (میں) کے تشخص کو پانے کی جستجو میں جب یا ہو کی نئی تعبیر تک پہنچتا ہے تو یہ عجیب انکشاف ہوتا ہے کہ صدیوں سے تمدنی ترقی کی خوش فہمی کا شکار انسان، اندر سے ابھی پتھر کے زمانے کا وہی وحشی ہے جس کے بالوں بھرے سینے میں کینہ حسد اور رقابت کی آگ روشن ہے۔

باہر سے میں کتنا ملائم ہوں لیکن اندر سے۔۔۔۔ یا ہو میرے منہ سے نکلے ہوئے خوبصورت، ملائم اور لذیذ لفظ سامنے والے کے نرخرے میں گڑ جاتے ہیں۔ میں ہونٹوں کی طشتری میں گرم، ابلتے، نمکین لہو کا ذائقہ چکھتا ہوں۔

میرے اندر اگے ہوئے لمبے سیاہ بالوں کے جنگلوں میں کوئی سرسراتا ہے اور چپکے چپکے ہنستا ہے۔

رشید امجد کا یہ کشف اس کے گیان دھیان کا نتیجہ ہے جو اسے اس لئے پسند ہے کہ اسے بعض ضروری سوالوں کے جواب مل سکیں اور کچھ ٹھوس حقائق تک رسائی ہو سکے۔ رشید امجد کا ایک افسانہ ہے "پھسلتی ڈھلوان پر ضروان کا ایک لمحہ" مجھے اس کا ہر افسانہ پھسلتی ڈھلوان پر ضروان کا ایک لمحہ محسوس ہوا۔ دراصل اس کے سارے افسانے اس کے اندرونی کشف کا اظہار ہیں۔ وہ سوچتا ہے سوچتا ہے اور سوچتا ہے اور پھر اچانک کہیں سے تاریکی میں حقیقت ایک کرن کی طرح ابھرتی ہے اور یہی وہ ضروان کا ایک لمحہ ہے جس کے لئے رشید امجد کے افسانے لکھے گئے ہیں۔ اب اگر قاری افسانہ نگار کے تفکر کے دھارے کا ساتھ نہ دے سکے تو پھر رشید امجد کا افسانہ اس کے لئے پھسلتی ڈھلوان ہی رہے گا۔

رشید امجد کے افسانے یا ہو کی نئی تعبیر کو ہم اس کے طرز تحریر کا بہترین نمونہ کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ اس میں ہمیں علامت کہانی اور آزاد تلازمۂ خیال کی تکنیک کا بہت اچھا مظاہرہ ملتا ہے۔

تشخص، پہچان کے مسئلے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ مجھے رشید امجد کے افسانوں کا یہ مجموعہ خود افسانہ نگار کے اپنے نام، اپنی شخصیت کی دریافت اور اپنی آواز اور انفرادیت کو تلاش کرنے کا وسیلہ معلوم ہوا۔ رشید امجد نے شعوری طور پر یہ کوشش کی ہے کہ ان کی انفرادیت کا علم بلند رہے اور ہر سطر میں ان کی اپنی چھاپ نظر آئے۔ اس سلسلے میں ہمیں ان کے یہاں پرانے لفظوں کے خلاف شدید احتجاج اور نئے اسلوب کی تشکیل کا نمایاں رجحان ملتا ہے۔ پرانے لفظوں کے خلاف رشید امجد کے احتجاج کا اندازہ ان فقروں سے لگائیے۔

تو اس نے الف سے شروع کیا لیکن الف تو مدت ہوئی بوڑھا ہو چکا ہے۔ ب ویسے ہی بیمار ہے اور بستر پہ لیٹا ہوا ہے۔ ج کا آدھا حصہ غائب ہوا ہے ہمارے تو حروف تہجی ہی بیمار ہیں۔ ایک اور اقتباس دیکھئے۔

ہاں اس نے سر ہلایا۔۔ ہم لفظوں کی اس مملکت میں ہیں اور نہیں کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں۔۔۔۔ اور لفظ۔۔۔۔ لفظ تو اب فاحشہ عورتیں ہیں۔؛

رشید امجد نے ان فاحشہ عورتوں کو سیدھی راہ پر لانے کی یہ ترکیب سوچی کہ انہیں اپنے عقد میں لے آئے اب وہ وہی کہتی ہیں جو رشید امجد ان سے کہلوانا چاہتا ہے۔ اس مجموعے میں ایسی مثالیں بھری پڑی ہیں کہ جہاں رشید امجد نے ہر بات کے لئے نئی تمثیل اور نیا استعارہ تلاش کیا ہے یا کسی اچھوتے انداز میں اپنی بات کہی ہے چند فقرے ملاحظہ ہوں۔

وہ اداس خوشی کا کبوتر اس کے دل کے آنگن میں غٹرغوں غٹرغوں کرنے لگا۔

"وہ چابک کھائے ہوئے گھوڑے کی طرح بدک کر اپنے ملبے سے باہر نکلا"

"اے شہر کی ٹھنڈی ہواؤ، مگنے سیاہ بادلوں سے کہو کہ اپنے حاملہ پیٹ کھولیں اور پانیوں کے تازہ بچے ہماری کھلی گودوں میں ڈالیں"

"وہ چیتیں ڈائنوں کی طرح ہیں جو آزادیوں کے نوزائیدہ بچوں کو کھا جاتی ہیں"

"وہ بار بار پلکوں کی بالکونی سے جھانک جھانک کر اس پر شناسائی کے مسکراتے کنکر پھینک رہی تھی"

"سر کی طرف بتی والا بڑا چوک ہے جس کے جبڑے صبح ہوتے ہی پھیل جاتے ہیں۔ اور وہ نتھنے پھلا پھلا کر سارا دن بڑی چھوٹی گاڑیاں تانگے سائیکل اور پیدل چلنے والے لوگوں کو اس کے منہ پر تھوکتا رہتا ہے۔"

"پرندہ اسی طرح پھدکتا رہا اور اس کی زندگی کی میز سے کئی اور سفید کاغذ لفظوں کے حل سے کالے ہو کر وقت کی ویسٹ پیپر باسکٹ میں جاگرے"

رشید امجد کا اسلوب یقیناً بہت خوب صورت ہے اور ان کی کہانی کے مجموعی تاثر کو بڑھانے میں خاصا مددگار ثابت ہوتا ہے مگر ٹھہریئے اب یہاں پھر وہی مسئلہ پیدا ہوگا۔ کہ رشید امجد کے یہاں کہانی ہے بھی کہ نہیں؟ میرے خیال میں یہ کہنا کہ رشید امجد کے یہاں کہانی نہیں ہے غلط ہے ان کے یہاں کہانی ہے لیکن وہ سامنے موجود نہیں ہوتی کہیں کہیں پڑھنے والے کو یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اسے کہانی کی جوئے شیر کو نکالنے کے لئے لفظوں کے پربت کو کاٹنا پڑے گا۔ مگر زیادہ تر وہ کسی عشوہ طراز محبوب کی طرح استعاروں کی چلمن سے اشارے کرتے نظر آتی ہے اور اس مجموعے کی آخری چند کہانیوں میں تو یہ دوشیزہ لفظوں کا دریچہ کھول کے آدھے دھڑ سے باہر لٹک گئی ہے۔

رشید امجد کی کہانی مختصر خیال آدمی کے نہاں خانوں کا خاموش عکس ہوتی ہے۔ اور اگر ذرا توجہ اور انہماک سے پڑھا جائے تو قارئین کو رشید امجد کی بنائی ہوئی لفظوں کی دیوار چین کے پیچھے انسانی احساسات کی ایک مملکت خداداد سانس لیتی نظر آئے گی۔ رشید امجد کے افسانوں میں ہمیں معاشرے کے انتشار اور تمدنی تغیر سے بوکھلائے ہوئے فرد کی اصل صورت نظر آتی ہے اور اگر یہ جاننا مقصود ہو کہ اس مجموعہ میں جن کرداروں کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں وہ کون لوگ ہیں تو اس کے لئے ہمیں رشید امجد کے ان الفاظ کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا کہ۔

"ہم سب ابجد چالاک لفظوں کی مملکت میں ایک بے چہرہ عصر کی بے صدا آوازیں ہیں۔ اور کچھ بھی نہیں"

یہ بات بڑی اہم ہے اور آج کے بہت سے افسانہ نگاروں پر بھی صادق آتی ہے جو اپنی شناخت اور اپنی پہچان کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔



تصوّف اور وجودیت

ہری داس چودھری / نسیم نیشوفوز

تصوف کی حقیقت اپنی بے حد مستند اور پاکیزہ ہیئت میں تین بنیادی اثبات میں ظہور پذیر ہوتی ہے

۱۔ ہستی جو کائنات کا حتمی جواز ہے۔ زمان، مکان اور اسباب و علل کی دنیا سے بالاتر ہے۔

۲۔ ہستی محیط کل ہے۔ وہ تمام تخلیق و ارتقار کا سرتاسر اولین مرکز ہے۔

۳۔ انسان جو ہستی کی بے مثل مرکزیت ہے۔ یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ ہستی سے فوری رابطہ اختیار کر سکے۔ بعد ازاں یہ فوری رابطہ ایک غیر شعوری وحدت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس وحدت کو وجدانی اتصال بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ اتصال روحانی جستجو کار کے نفسیاتی مزاج سے عبارت ہے۔

انسان کی اسراریت اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے قلب میں اسرار کائنات اور اسرار ہستی لئے ہوئے ہے۔ اسرار ہستی کائنات کی اصل حقیقت ہے۔

ایک ایٹم کی ننھی منی ہستی اپنی اندرونی ساخت لئے وسیع ترین نظام شمسی کی ہیئت کی عکاس ہے۔ بعینہ روحانی دانش مندی و فراست جو مستند روحانی تجربے سے جنم لیتی ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف کرتی ہے کہ انسان اپنے مائیکروزم (MICROCOSM) میں کائناتِ کُل کی ساخت کی عظمت چھپائے ہوئے ہے۔ اس آفاقی وسعت و احاطے میں مادیت کے سات ساختہ اصول پائے جاتے ہیں۔

"بذات خود مادّے کی حقیقت"۔ حیات، ذہن، فوق البشر ذہن، روحانی توانائی، تصعید اور ماہیت سے معمور صداقت کائنات کے سات اصولوں پر منحصر ہے۔

انسانی ہستی کے بھی سات پہلو یا اس کی پوری شخصیت کی سات سمتیں ہیں۔ طبعی، پُرازواقعیت، ذہنی، فوق الذہنی، تخلیقی، جمالیاتی اور مافوق الہست سمتیں۔

وجودیت نے انتہائی فلسفیانہ معنی میں اپنی توجیہ و تشریح مارٹن ہیڈیگر اور ژاں پال سارتر کے طفیل پائی۔ جس کی ابتدا نطشے کے خدا کے انکار سے ہوتی ہے اور یہ انکار کائنات کی غیر عارضی صوفیانہ اور فوق الفطری جہتوں تک پھیل جاتا ہے۔

"وقت ——— ہستی کا افق ہے" اور وقت کی مادیت انسانی حقیقت کی بنیادی ساخت ہے۔

(ہیڈیگر)

وقت کی اس رو میں انسان بطور ایک متحرک قوت "مستقبل سے مربوط ہے۔ اس کا ماضی و حال اسے ربط سے اپنی معنویت اخذ کرتا ہے۔ مستقبل میں کچھ کر گزرنے اور کر دکھانے کا مقصد ہی ایک ایسا نکتہ ہے کہ انسان اپنے ماضی کی شرح کرتا ہے اور حال میں عمل کرتا ہے۔

خدا کا تصور یقیناً انسان کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وجودیت پرست سارتر کو اس بات کا اعتراف ہے، انسان کی یہ شدید اور پر جوش خواہش ہے کہ وہ خدا تک پہنچ جائے۔ یعنی ہستی اور گردیدنی (BECOMING)، ہستی اور شعوریت کی مکمل وحدت کی تکمیل کر سکے لیکن تکمیل کی یہ خواہش لایعنیت کی ایک.. کوشش ہے۔ انسان مستقلاً بدلتا رہتا ہے۔ سفر ارتقا میں ہوتا ہے۔ اپنی ترتیب و مسمار کرتا ہے، بنتا اور ٹوٹتا ہے۔ گردیدنی (BECOMING) کی یہ مستقل مشق ہی اس کی ہستی کا جوہر ہے۔ وجود کا مفہوم تبدیلی ہے۔ تبدیلی اور تغیر کے اس طریقۂ کار کی گرفت صرف اسی صورت ہو سکتی ہے کہ انسان اپنی ہستی کا خاتمہ کر دے۔ موت کے ہم آغوش ہو جائے طبعی یا روحانی موت کو اپنا کر۔

انسانی شعوریت کا تقاضا ہی کچھ ایسا ہے کہ جونہی اسے خاص منزل کا احساس ہوتا ہے دوسری عظیم تر منزلیں اس کے ذہنی افق پر بیدار ہوتی ہیں اور اسے مزید برآں کاوش و مہم پسندی پر اکساتی ہیں۔ اسی کاوش انگیز شعوریت کی خاصیت کی بنا پر انسان اپنے آپ کو مستقبل کے انجانے خاکے میں آگے بڑھاتا ہے۔ لہٰذا ایسی انسانی شعوریت کو موجودہ صورت حال میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ بہ الفاظ دگر ہستی اور شعوریت کی دائرہ نما وحدت محض مہملیت ہے۔ یہاں حقیقت مطلق ایک سراب ہے جسے تصوف اور وجودیت کی یگانگت ہی حاصل کر سکتی ہے۔

ادھر تصوف اور وجودیت کی مماثلتیں قابل غور ہیں۔ مشہور ترین یونانی مقولے "خود کو پہچانو" کی طرح یوگا اور ویدانت میں بھی آتما نام بدھی کا بھی وہی معنی ہے جو مذکورہ یونانی مقولے کا ہے۔ کیونکہ انا کی گہرائی میں آپ ہستی کے اسرار پا سکتے ہیں۔ بلاشبہ انا سارے علم کا راز ہے ——— زمان و مکان کی دنیا اور ابدیت کے علم کا بھی۔

وجودیت ہستی یا حقیقت انسانی پر فلسفیانہ علم کی کلید کے طور پر مرتکز ہے۔

سارتر کہتا ہے:

"وجود کو جوہر پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ انسان کی وجودی خاصیتوں کا تجزیہ ہے۔ پر ہم حقیقت کی بنیادی ساخت کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں۔ ان خصوصیات میں انسان کی بیزاری، اضطراب، مایوسی، تجدید، گناہ اور موت کا تعلق وغیرہ شامل ہیں۔ مثلاً جب ہم موت پر غور کرتے ہیں تو ہم خود کو معدومیت (NOTHINGNESS) کے زمرے میں رکھتے ہیں اور زندگی کو بطور "کل" دیکھنے کا موقع پاتے ہیں۔ تاکہ زندگی کا ماحصل جان سکیں۔ اسی لئے شوپن ہاور نے صحیح طور پر مشاہدہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"موت پر غور و خوض کرنا فلسفیانہ سمجھنے کی ابتداء ہے"

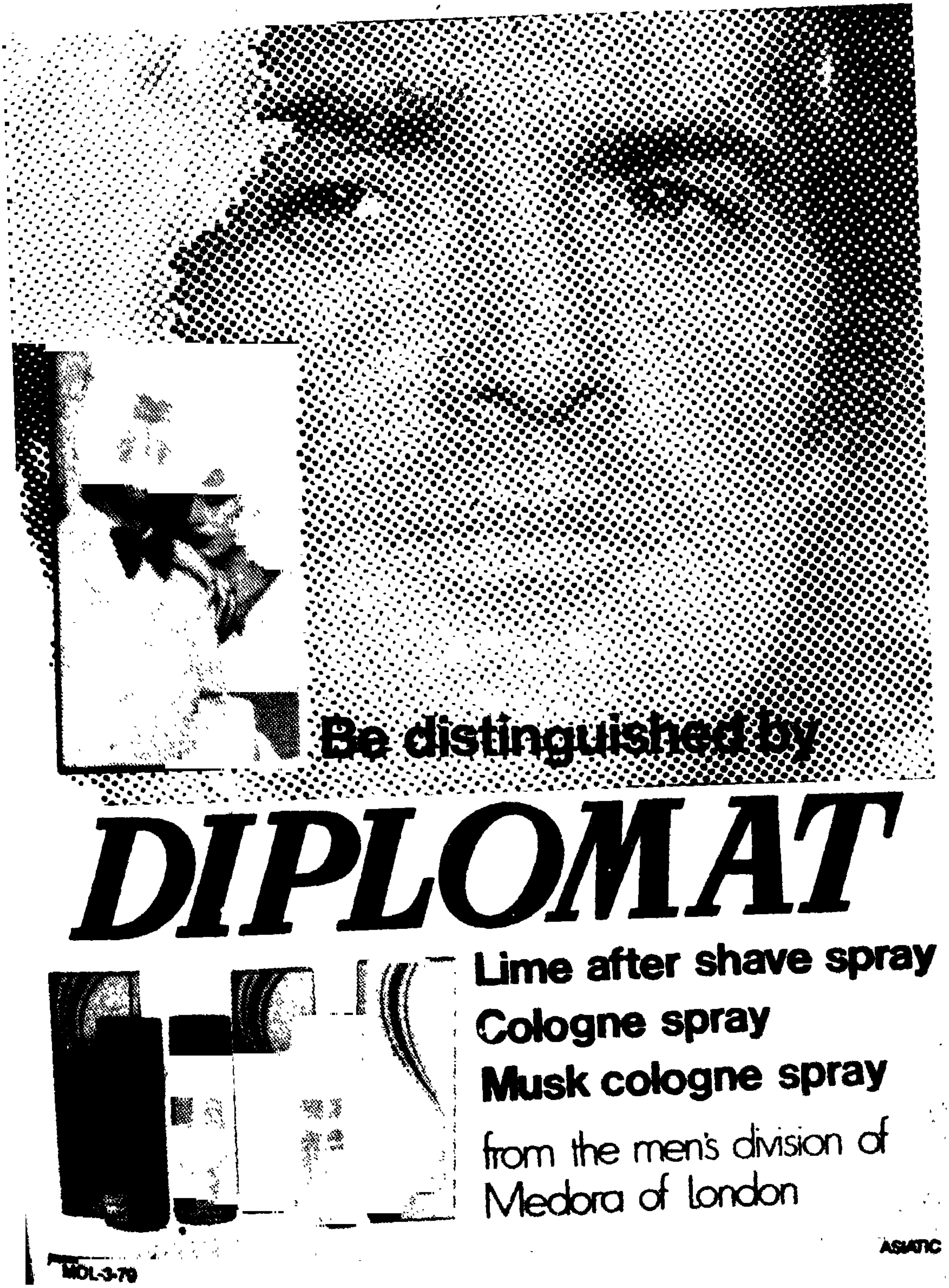
ادھر وجودیت کا قول ہے: "میرا وجود ہے لہٰذا میں سوچتا ہوں۔ میں اپنی زندگی بسر کرتا ہوں۔ جبلی طور پر اپنے ماحول کا جواز بنتے ہوئے اور جذباتی طور پر اپنے ساتھی انسانوں سے دنیاوی معاملات میں تعلقات پیدا کرتے ہوئے ———"

"خیال ——— وجود کا منصب ہے۔ تصور اور جوہر، قوانین اور اصول ——— خیال کا نتیجہ ہیں۔"

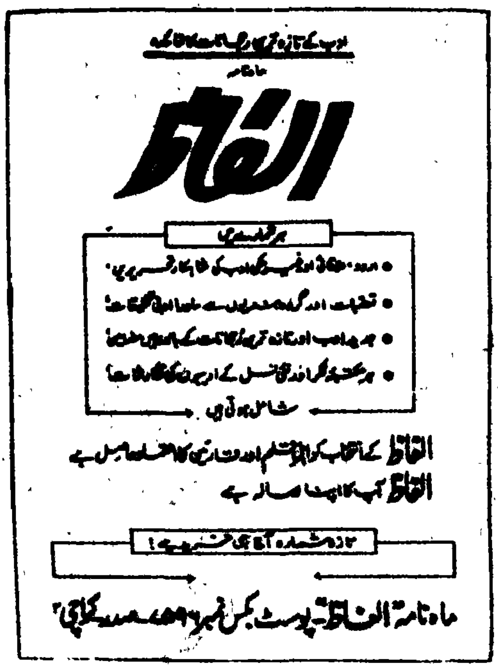
یہ تمام امور ادراکی ساخت ہیں جنہیں "عمل" کا مفید آلہ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ وجود کا قبل از قصد کا حصہ ہیں۔ ان کی منامانہ حیثیت کچھ نہیں۔

ویدانتی فلسفہ کہتا ہے:

"انا ـــــ ہستی کے اسرار کی چابی ہے"
جب کہ فلسفۂ وجودیت کہتا ہے:
"وجودیت ـــــ حقیقت کی ماہیت کی کلید ہے" مذکورہ مقولوں کا موازنہ اختصاریت کے باوجود توجہ کا طالب ہے۔
وجودیت فرائڈ کی اس تقسیم کو چیلنج کرتا ہے۔ جو انسان کی مکمل ہستی کو شعوری اور لاشعوری ذہن کے حصوں میں بانٹ دیتا ہے۔
سارتر کے نظریے کے مطابق شعوریت نام نہاد لاشعوریت میں ہر لحظہ موجود رہتی ہے۔ خواہ وہ اپنے طور پر غیر فکری شعوریت ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لئے جب کوئی ماہر نفسیات مریض کے ذہن کے حسّی حصوں میں داخل ہوتا ہے تو مریض کی مزاحمت بڑھ جاتی ہے۔
ہندی تصوف خود اس خیال کا حامل ہے کہ وجودیت اور شعوریت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ وجودیت اور تصوف کے درمیان دوسری اہم مماثلت آزادی کی آگہی ہے۔ جو انا کا بنیادی جوہر ہے (آزادی کا مفہوم یہاں مسئلہ جبر و قدر ہے۔ یعنی قدر کو قدریت حاصل ہے۔)
وجودیت کا کہنا ہے کہ ایک عام انسان اپنی جامع ہستی سے بے بہرہ رہتا ہے۔ وہ قدریت جو اس کا اصل حیات ہے۔ اس کی یہی بے آگہی مصائب اور مایوسی کا مخرج ہے۔ آزادی کی مکمل آگہی ہی اسے جبلّی سماجی اور ثقافتی طور پر بھرپور زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھاتی ہے۔ مغرب میں یہ آگہی وسیع القدر سائنسی جبریت کے مقابل ہندی تصوف کی بنیادی صداقت ہے۔ اس تصوّف کے مطابق انسانی انا اساسی طور پر آزاد ہے۔ بقیہ تمام جبری سائل جہالت و مایاجال ہیں۔ انا کی آگہی کا مقدس احساس اور اس کی آزادی زندگی کا صحیح مفہوم ہے۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ تصوّف ابدیت سے "آزادیٔ وحدت" پر زور دیتا ہے۔ وجودیت "آزادیٔ انتخاب" پر زور دیتی ہے۔
جو وقت کی تخلیقی تحریک سے عبارت ہے۔ ہر دور کا سب سے بڑا تعلق انا سے ہستی کی جانب سفر ہے۔ انسانی شعوریت (آتما) کے مرکز سے مرکزِ کائنات (براہما) کی جانب سفر ہے۔ اس اعتبار سے تصوف اور وجودیت دونوں ہی داخلیت، سائنس کی کلّیت اور تخمینی فلسفے کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ داخلیت ہر چیز کو تجریدی اقدار، تجزیری تصورات اور مروجہ اصول و قوانین کی روشنی میں تشریح کرتی ہے۔ جب کہ تصوّف اور وجودیت مذکورہ امور کو انا کی روشنی میں کرتے ہیں۔
انا ـــــ جو انسانی شعوریت کا وجدانی مرکز ہے۔ جس سے اسرارِ کائنات اور ہستی انسان کی تہہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ویدانتی نظریہ یہی ہے کہ انا کا علم ہستی کے علم کا "درشاہی" ہے۔
وجودیت کا ایک بڑا اختلاف یہ ہے وہ سائنس کی عقلیت اور تخمینی فلسفہ کو مسترد کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وجودیت حقیقت کو سمجھنے کے لئے انسان کی وجودیاتی خصوصیات کا عقلی تجزیہ بھی کرتی ہے۔
مغرب کی عقلی روایت کی تقلید کرتے ہوئے وجودیت کا علم اجمالاً تمام صوفیانہ تجربات (الہامی و شبیہی) کو مسترد کر دیتا ہے نتیجتاً انسانی حقیقت کی روحانی جہت وجودیت کے لئے مہر بند کتاب ہے اور یوں انسان بطور "طفلِ ابدیت" وجودی زاویے سے چشم پوشی اختیار کر لیتا ہے۔
وجودیت "حقیقت" کا ادراک وقت اور تاریخ کے توسط سے کرتی ہے۔ جب کہ تصوّف "ابدیت" کے وسیلے سے۔ مستند صوفیانہ تجربہ ابدی ہستی کا انکشاف کرتا ہے۔ جو انسانی ذات کا مدار ہے۔ تصوّف کے توسط سے پہچانی ہوئی ہستی زمان و مکان سے بالاتر ہوتی ہے۔ ارتقاء اور تاریخ سے بالاتر ہوتی ہے۔ وجودیت انسان کے فانی وجود پر زیادہ توجہ دیتی ہے اور اس کی غیر فانی جہت کو فراموش کر دیتی ہے۔ جب کہ تصوف ابدیت پر زیادہ توجہ دیتا ہے اور زمان و ارتقاء کی دنیا کو "دامِ خیال" قرار دیتا ہے۔


Be distinguished by
DIPLOMAT
Lime after shave spray
Cologne spray
Musk cologne spray
from the men's division of
Medora of London
MOL-3-79
ASIATIC

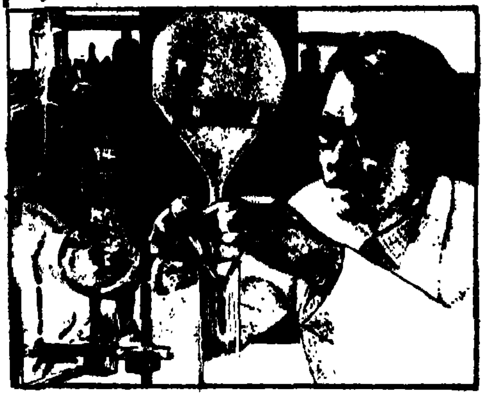

سوزوکی
A80 A100
ہمہ گیر صلاحیت
زیادہ کفایت
رواں دواں
سندھ انجینئرنگ لمیٹڈ


ماہنامہ
الفاظ
شامل ہوتی ہیں
الفاظ آپ کا اپنا رسالہ ہے

سیمپ کراچی

ڈنٹونک پاؤڈر کا اعلیٰ معیار برقرار رکھنے کے لئے ہم کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے

دانتوں کا صحت و زندگی سے گہرا تعلق ہے یہی وجہ ہے کہ ہم ڈنٹونک کا اعلیٰ معیار برقرار رکھنے کیلئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے بہترین ادویات، ماہرین کی خدمات اور جدید ترین آلات کی مدد سے ہر مرحلہ پر ڈنٹونک کی جانچ پڑتال ہماری فرض شناسی کی روشن مثال ہے۔



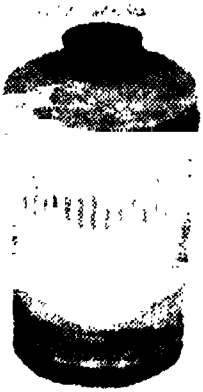
قدم قدم پر جانچ پڑتال، فرض شناسی کی روشن مثال



بہترین ادویات، ماہرین کی خدمات، جدید ترین آلات



دانتوں کا صحت و زندگی سے گہرا تعلق ہے



DENTONIC
TOOTH POWDER

ALA CHEMICALS
P.O.BOX. 2110. KARACHI- 18

ORIENT ALA/4/73

فلسفۂ تکملہ (INTEGRAL PHILOSOPHY) وجودیت اور تصوّف کو ہم آہنگ بنانے میں کوشاں ہے۔ فلسفۂ تکملہ کے نقطۂ نظر سے وجودیت اور تصوّف آدھی آدھی صداقتیں ہیں۔

نظریۂ تکملہ یہ ہے کہ فطرت اور فوق الفطرت ہستی کی تخلیقی توانائی کے دو مختلف مظاہر ہیں۔ یہی حقیقت مادے اور ذہن کی ہے۔ مادہ اپنے غیر شعوری طریقۂ عمل میں توانائی (ENERGY) ہے جب کہ ذہن اپنے شعوری طریقۂ عمل میں توانائی ہے شعوریت مادّے اور ذہن دونوں میں قائم رہتے ہوئے ہستی کو ''کل'' بناتی ہے۔ خواہ ہستی کے مدارج اور موڈ مختلف النوع ہی کیوں نہ ہوں سارتر ہستی کے ان درجات کی توجیہہ کرتے ہوئے ثابت کرتا ہے کہ فطرت میں اس شعوریت کا مکمل فقدان ہے۔

یہاں مشرقی بلکہ ویدانتی نقطۂ نظر سے انسانی شعوریت کا موازنہ فطرت کی شعوریت سے کیا جاتا ہے۔ مہارشی سری آری بندو کہتے ہیں:

''انسانی شعوریت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ فطرت کی شعوریت کی ایک شکل ہے۔''

فطرت کا ارتقا آزاد ہے، رواں دواں ہے، تخلیقی توانائی ہے۔ فطرت کی اس تخلیقی توانائی کو میکانکی یا مقصدی پیمانوں سے نہیں ناپا جاسکتا ہے۔ یہ توانائی تخلیقی اظہار ہے، لامحدود ممکنات کا اظہار ——— جو ہستی کے خصائل و محاسن سے معمور ہے۔

فلسفۂ تکملہ کے تحت وقت اور ابدیت، تاریخ اور ماورائیت، ارتقاء اور تکمیل یہ ہر دو ایک ہی مکمل ہستی کی دو غیر منقسم حقیقی سمتیں ہیں۔

وقت ——— غیر حقیقی نہیں بلکہ حقیقت مطلق کا ایسا مسلسل میڈیم ہے جو لامحدود ممکنات کا اظہار ہے۔ ہستی حقیقتاً مکمل ہے اور وقت کے تخلیقی عمل سے قطعی آزاد۔ وقت کا تخلیقی عمل (خلقیت) ہستی کے مکمل پن کا از خود بہاؤ ہے۔ ہستی غیر محدود نشاط ہے جو بے حرکت ہستی ہی سے محظوظ نہیں ہوتی بلکہ متحرک ہستی کی خود اظہاریت کے تخلیقی نشاط سے بھی لطف اندوز ہوتی ہے۔

ہستی ——— جیسا کہ وقت اور تاریخ اس کا انکشاف کرتے ہیں ''متغیر چیز'' ہے۔

ہستی ——— جیسا کہ مستند صوفیانہ تجربے سے منکشف ہوتی ہے ''غیر متغیر'' ہے، ابدی ہے۔ اس نکتہ پر تصوّف اصرار کرتا ہے۔

فلسفۂ تکملہ متغیر اور غیر متغیر کو یکجا کرتا ہے۔ وقت اور ابدیت دونوں پر حاوی ہوتا ہے۔ اس محتاط تجزیے سے دو مفروضوں کا انکشاف ہوتا ہے۔

۱۔ طاقت یا توانائی خاصیت یا صفت ہے جس شے سے کہ وہ عبارت ہے۔

۲۔ وجود اور توانائی (ہیئت اور بے ہیئت) دو مختلف امر ہیں۔

فلسفۂ تکملہ کا نتیجہ یہ ہے کہ توانائی (شکتی) خاصیت یا صفت نہیں ہے بلکہ وجود کے ضمن میں آتی ہے۔ خالص وجود اور خالص توانائی ''ایک'' ہے۔ خالص وجود کو ''روحیت'' (SPIRITUALITY) سمجھا گیا ہے جو اپنے بنیادی جوہر میں شعوریت اور آزادی سے متعلق ہے۔ خالص توانائی (شکتی) کو نیچر (NATURE) قرار دیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ ہم کائنات کا ادراک اپنے حواس سے کرتے ہیں۔ فلسفۂ تکملہ کے نزدیک روح ——— نیچر ہے اور نیچر ''روح'' ہے۔ ''روح - نیچر'' یا ''ہستی - توانائی'' جیسے مرکب لفظ آزاد ہیں۔ لامحدود ہیں۔ عمیق ہیں اور خالصتاً ماورائی خاصیت کے حامل ہیں۔ یہ مرکب الفاظ زمان و مکان، تغیر و تبدل کی دنیا سے ماوراء ہیں اور سدا نت نئی اشکال، خصوصیات اور اقدار کے خالق بنتے ہیں۔ انہی آفاقی نظام، زمان و

مکاں کی روانی اور تاریخ کے پھیلاؤ کے مساوی گردانا جانا چاہئے۔ یوں فلسفۂ تکملہ میں وجودیت اور تصوّف ہم آہنگ ہو کر ایک ہی حقیقت کے دو رخ قرار پاتے ہیں۔

لیکن کیا تصوّف فوق الفطری اور غیر دنیاوی نہیں ہے؟ اور کیا وجودیت فوق الفطرت اور غیر دنیاوی پن کے خلاف اہم احتجاج نہیں ہے۔ لفظ وجودیت EXISTERE سے مشتق ہے۔ جس کا مفہوم ہے کہ فلاں شخص دنیا میں وہاں کھڑا ہے یعنی وجودیت انسان کے وجود پر مرتکز ہے۔ جس میں اس کی صلاحیتوں کو دنیا میں حقیقت کا رنگ اختیار کرنا ہے۔ اور دنیا میں انسان کی تقدیر کی تکمیل ہونا ہے۔ لہٰذا اس بات میں کوئی خوبی نہیں کہ وہ صوفی کی لن ترانی سنے جو وجود کے فوق الفطری درجات کے متعلق کچھ نہ کچھ کہتا رہتا ہے اور ابدیت سے ملفوف ماورائی اقدار کی باتیں کرتا ہے۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ روایتی تصوّف میں انسان کی وجودی حقیقت کو مسترد کر دیا جاتا ہے اور اس کا رشتہ ناطہ فوق الفطرت عمل سے جوڑا جاتا ہے۔ روایتی تصوّف نے سماجی، معاشی، سیاسی اور دنیا کی سائنسی اقدار کی نفی کی ہے لیکن جب وجودیت اور تصوّف کی بنیادی صداقتوں کو پورے طور سے سمجھا جائے گا تو دونوں کے تضادات کو جہالت محمول کیا جائے گا۔

وجودیت نے ہمارے جدید خیال و نظریے کی سب سے نمایاں یہ خدمت انجام دی ہے کہ اس نے انسان کے کردار کی آزادی کا تصوّر بخشا۔ وجودیت کا پیغام یہ ہے کہ انسان کی تخلیقی آزادی تازہ و شگفتہ "نسیم بَرّی" کی مانند ہے۔

فلسفۂ تکملہ کی خوبی یہ ہے کہ انسان یوگا اور وجدان کے ذریعہ اپنی روح کی گہری سمتوں کو دریافت کرسکتا ہے۔ فلسفۂ تکملہ کا نصب العین یہ ہے کہ انسان شعوریت کے بلند تر درجات سے کہیں زیادہ بلند ہو جائے۔ وجودیت کا اصرار انسان کی افقی خود ماورائیت پر ہے جو مستقبل کی جانب نشاندہی کرتی ہے جب کہ تصوّف کا اصرار انسان کی سمت الرّاس (VERTICAL) خود ماورائیت پر ہے۔ جو ابدیت کی جانب لے جاتا ہے۔

وجودیت اور تصوّف کی یہ ہم آہنگی انسان کے روشن خیال آئیڈیل کا تصوّر پیش کرتی ہے۔ تہذیب کی ارتقائی نشو و نما کا نظریہ دیتی ہے کہ انسان ابدی ہستی بن سکے۔ ہستی اور توانائی کی ہم آہنگی سے "فوق الذہن" پیدا ہوتا ہے جو ہستی کا فعال مرکز ہے یہ فوق الذہن محیط الطبع شعوریت کی علامت ہے۔ انسانی ارتقاء اور دنیاوی معاملات کا محرک ہے۔ بین الاقوامی وحدت اور قومی خود عزمی کا نصب العین ہے۔ شعوریت کی باطنی نشو و نما ضروری ہے جو انسان کے وجود کو کلی طور پر دنیاوی اعتبار سے حقیقتاً بدل کر رکھ سکے۔ غالباً یہی فلسفۂ تکملہ کی تلقین و توجیہہ ہے۔

●
●

غزلیں

خورشید الاسلام

کب تلک بے مہریٔ حالات کی باتیں کریں
جام کو چھلکائیں، اوجِ ذات کی باتیں کریں

دن میں دیکھیں اک روپہلے گنگناتے دن کا خواب
رات میں اک جگمگاتی رات کی باتیں کریں

فرش سے بھیجیں سوئے عرشِ بریں وحیٔ انعام
عرش سے اُتری ہوئی آیات کی باتیں کریں

کھول دیں دل کے دریچے، جائیں پھولوں سے لپٹ
کوئی موسم ہو بھری برسات کی باتیں کریں

آج کی شب یوں گزاریں، ناز بے جا ہی سہی
خاندانِ عشق کے سادات کی باتیں کریں

زندگی آفات ہے، آفات سے جائیں گزر
زندگی سوغات ہے، سوغات کی باتیں کریں

زخمِ دل، زخمِ خوشی، زخمِ عبرت، زخمِ ننگ
لذتیں اتنی ہیں، کن لذات کی باتیں کریں

بے محابا، بے تکلف، بے تحاشا، بے درنگ
دوستوں سے جسم کے نغمات کی باتیں کریں

ڈوب جائیں رات کے سینے میں اور ڈھونڈیں نشاط
پھر تصوّر میں کسی بارات کی باتیں کریں

لہلہاتے دو بدن اور سینۂ شب کا گداز
کیوں نہ یاروں سے انہی اوقات کی باتیں کریں

دل کے سوتے جاگ اٹھے ہیں، یہ ساعت ہے عجیب
آؤ ایسے میں خمارِ ذات کی باتیں کریں

خورشید الاسلام

گھٹ کے رہ جاتے ہیں دریا خاکنائے دہر میں
منحصر ساحل پہ ہو جن کی روانی، کیا کریں
کیسے رخشندہ ستارے ہو گئے پیوندِ خاک
سنتے سنتے سو گئے اپنی کہانی، کیا کریں
دل کو گویائی ہوئی قسمت نہ گویائی کو دل
ہم کہاں لے جائیں اپنی بے زبانی، کیا کریں
کس کے ہاتھوں لُٹ رہی ہے، کس چمن کی آبرو
کیا سنیں، کس سے سنیں کس کی کہانی، کیا کریں
جن کے بازو ہیں توانا، ان کے خنجر تیز ہیں
ناتوانوں کا علاجِ ناتوانی، کیا کریں
کیسی راحت تھی قفس میں، ہو رہائی کا بُرا
آ پڑی ہے سر پہ آفت ناگہانی، کیا کریں
گل میں دل، سبزہ میں دل، بازو میں دل، آنکھوں میں دل
یاد آتے ہیں وہ ایامِ جوانی، کیا کریں
ہم نے جس دل کو چھُوا، اس دل کو زندہ کر دیا
حافظہ کہتا ہے اک ایسی کہانی، کیا کریں
یار ہم سے چھُٹ گئے، اغیار ہم سے چھٹ گئے
اب کہاں جا کر کریں ہم گل فشانی، کیا کریں
سوز سے خالی ہو دل اور آنکھ ہو عالم پہ بند
جب یہ عالم ہو تو پھر رمز و معانی کیا کریں

ناچتے ہیں سربسر، کون و مکاں، اللہ بس
ہم بھی اک عالم میں بیٹھے ہیں یہاں، اللہ بس

اِک نگہ ایسی کہ سنّاٹے میں آجائے وجود
آئے کیوں حرفِ شکایت درمیاں، اللہ بس

شیشہ خالی ہے، سبو خالی ہے، دل ہیں بے حضور
کیا کہیں، پیرِ مغاں، پیرِ مغاں، اللہ بس

شب کے آئینے میں دیکھا میں نے اک سیلِ اَلم
موج اندر موج، تا حدِ مکاں، اللہ بس

شیشہ و ساغر سے آگے، غنچہ و گل سے پرے
دل اگر ڈھونڈے نشاطِ جاوداں، اللہ بس

زندگی میں پیچ و تابِ غم، نشاطِ غم کے ساتھ
ہیں یہی تیر و کماں، تیر و کماں، اللہ بس

اس بدن میں ہم نے پایا، اپنے دل کا سا گداز
خرمنِ گل میں رہے، آتش بجاں، اللہ بس

خلیل الرحمٰن اعظمی

دنیا داری تو کیا آتی، دامن سینا سیکھ لیا
مرنے کے تھے لاکھ بہانے پھر بھی جینا سیکھ لیا

دھرتی کتنے ناچ نچائے تب اک کوڑی جیب میں آئے
ایڑی سے چوٹی تک پہنچے کیسے پسینہ دیکھ لیا

اپنے آپ پہ کیوں اترائیں اپنے آپ کو کچھ سمجھائیں
کبھی کبھی ہے جھوٹ بھی کہتا یہ آئینہ سیکھ لیا



رنج یہ گردِ ملال تھی کیا تھی
حاصلِ ماہ و سال تھی کیا تھی

ایک صورت سی یاد ہے اب بھی
آپ اپنی مثال تھی کیا تھی

میری جانب اٹھی تھی کوئی نظر
ایک مبہم سوال تھی کیا تھی

اس کو پا کر بھی اس کو پا نہ سکا
جستجوئے جمال تھی کیا تھی

صبح تک خود سے ہمکلام رہا
یہ شبِ جذب و حال تھی کیا تھی

دل میں تھی پر لبوں تک آ نہ سکی
آرزوئے وصال تھی کیا تھی

اپنے زخموں پہ اک فسردہ ہنسی
کوششِ اندمال تھی کیا تھی

خوں کی پیاسی تھی یہ زمینِ وطن
ایک شہرِ جدال تھی کیا تھی

باعثِ رنجشِ عزیزاں تھی
خوئے کسبِ کمال تھی کیا تھی

ایک جھلک لمحۂ فراغت کی
ایک امرِ محال تھی کیا تھی

کوئی خواہاں نہ تھا کہ جنسِ گراں
اک مفلس [illegible]

خلیل الرحمٰن اعظمی

جلتا نہیں اور جل رہا ہوں
کس آگ میں پگھل رہا ہوں
مفلوج ہیں ہاتھ پاؤں میرے
پھر ذہن میں کیوں مچل رہا ہوں
اک بوند نہیں لہو کی باقی
کس بات پہ میں مچل رہا ہوں
تم جھوٹ یہ کہہ رہے ہو مجھ سے
میں بھی کبھی بے بدل رہا ہوں
کیوں مجھ سے ہوئے گناہ سرزد
کہنے کو تو بے عمل رہا ہوں
رائی کا بنا کے ایک پربت
اب اس پہ یونہی پھسل رہا ہوں
کس ہاتھ سے ہاتھ میں ملاؤں
اب اپنے ہی ہاتھ مل رہا ہوں
کیوں آئینہ بار بار دیکھوں
میں آج نہیں جو کل رہا ہوں
آج کون سا ڈر رہا ہے باقی
اس ڈر سے میں کیوں نکل رہا ہوں
قدموں کے تلے تو کچھ نہیں ہے
کس چیز کو میں کچل رہا ہوں
اب کوئی نہیں رہا سہارا
میں آج سے پھر سنبھل رہا ہوں
میں کیوں کروں آسماں کی خواہش
اب تک تو زمیں پہ چل رہا ہوں
یہ برف ہٹاؤ میرے سر سے
میں آج کچھ اور جل رہا ہوں
مجھ کو نہ پلاؤ کوئی پانی
پیاسوں کے میں ساتھ چل رہا ہوں
کھانے کی نہیں رہی طلب کچھ
اب بھوک کے بل پہ پل رہا ہوں



شان الحق حقی

آ ڈھونڈ لیں لذت ہی کا پہلو کوئی غم میں
دُکھ تیرے جنم میں ہے نہ دُکھ میرے جنم میں

آنکھوں کا بھی تھا سنگِ سرِ راہ سے کچھ ساز
لغزش کوئی یونہی نہیں آئی تھی قدم میں

کب جا کے کھُلے دیکھئے اسرارِ عدم کے
جب چھپ گئے ہم خود ہی حجاباتِ عدم میں

ہیں فاصلے ذہنوں کے ستاروں سے زیادہ
طے ہوتی ہے منزل کوئی دو چار قدم میں

حسرت سے اُسے یوں لیے بیٹھا ہوں کہ جیسے
کچھ بھی نہ بچا ہو مرے پیمانۂ غم میں

شیطاں کو بھی لے آئیں اطاعت پہ جو آخر
انداز خدائی کے ہیں وہ میرے صنم میں

تخلیق ہے خود اپنی ہی توفیق نمو کی
حاشا کہ یہ صورت تھی نظر میں نہ قلم میں

ہے کوچۂ ابہام میں انبوہِ حریفاں
لیکن کوئی غالب کوئی بیدل نہیں ہم میں

ہم نے یہ درس پایا لے دے کے زندگی سے
افسانہ آدمی کا سچا ہے آدمی سے

دل کے تو تا ابد تھے پیمان زندگی سے
تولے ہوئے ہے خنجر دستِ قضا ابھی سے

اے دوست دل سے دل تک قرنوں کی منزلیں ہیں
تارے ملے جلے سے لگتے ہیں دُور ہی سے

ہاتھوں میں تیرے سونپی کُل کائنات ساقی
لا بانٹ دے نصیبہ سب کا برابری سے

بادِ صبا نے کیسا دامن بھرا ہے دیکھو
شبنم کا قطرہ قطرہ لے کر کلی کلی سے

سہمے ہوئے ہیں سُن کر روزِ جزا کا نقشہ
یہ ظلمتوں کے تاجر ڈرتے ہیں روشنی سے

ہر راہ رو کے لب پر دعویٰ ہے رہبری کا
اک ہم ہی ہیں وطن کی راہوں میں اجنبی سے

ہم نے کبھی نہ راہ پکڑی افسانہ خوانیوں کی
دیکھا کہ آدمی کو وحشت ہے راستی سے

احمد ظفر

لکھی نہ کوئی بات رلانے کے واسطے
جو زخم بن رہی ہے زمانے کے واسطے

سورج کی روشنی سے اندھیرا برس گیا
سو رنگ ہیں ستم کے چھپانے کے واسطے

دیکھا تو آشیاں کبھی مرا آشیاں نہ تھا
کہتے ہیں ہر شجر ہے جلانے کے واسطے

پتھر بنا ہوا ہوں کسی رہگذار میں
گھر سے چلا تھا پھول کھلانے کے واسطے

ہر جادۂ حیات مسافر بنا گیا
منزل فریب، بارہا کھانے کے واسطے

موسم کی آگ میرے لہو میں اتر گئی
چہرہ چراغ، راہ دکھانے کے واسطے

اس کے لئے سکونِ محبت حرام ہے
زندہ رہا ظفرؔ جو زمانے کے واسطے

کرار نوری

ہائے وہ دل جو محبت کا طلبگار بھی تھا
تیری بیگانگیٔ شوق سے بیزار بھی تھا

وہ بھی دن تھے تو محبت کا طلبگار بھی تھا
اور یہ شوق کہ آمادۂ اظہار بھی تھا

لے اڑا جوشِ جنوں ہمکو بیاباں کی طرف
ورنہ کوچہ میں ترے سایۂ دیوار بھی تھا

تیری بیگانہ روی نے کہیں رہنے نہ دیا
میں تو آسائشِ دنیا کا طلبگار بھی تھا

ہائے وہ راز جسے دل میں چھپایا ہم نے
کس سے اب جا کے کہیں قابلِ اظہار بھی تھا

ہم نے ہی طوقِ غلامی کو گوارا نہ کیا
ورنہ بکنے کو یہاں مصر کا بازار بھی تھا

رونقِ دار و رسن جن کو کیا ہے تو نے
ان میں اب تو ہی بتا کوئی گنہگار بھی تھا

گم شدہ دل کی شکایت تو ہے ان سے نوری
یہ مگر بھول گئے کوئی خریدار بھی تھا



تجھ کو پانا بھی تو کیسے تجھے کھویا کب تھا
میں جو اس رات کا جاگا ہوں تو سویا کب تھا

جانے کیا لوگ سمجھ بیٹھے یہ پتھر دل ہیں
میں تو اپنے پہ ہنسا کرتا تھا رویا کب تھا

تیرے دامن پہ کھلیں پھول تو اب کیسے کھلیں
تیرا دامن مرے اشکوں نے بھگویا کب تھا

میری آنکھوں سے کوئی اشک ابھرتا کیسے
اس تبسم کو ابھی دل میں سمویا کب تھا

جمیل ملک



لوٹ کر آئے نہ کیوں روٹھ کے جانے والے
سارے موسم ہیں اگر لوٹ کے آنے والے
مِل تو جاتے ہیں طرحدار یہاں اور وہاں
کتنے ہوتے ہیں مگر ساتھ نبھانے والے
عشق کا نکتۂ آغاز ہی انجام بھی تھا
سوچتے رہ گئے حیرت سے فسانے والے
منہ سے کچھ بھی نہ کہیں جان لُٹا دیں اپنی
قرض یوں بھی تو چُکاتے ہیں چُکانے والے
سچ ہے مصلوب تو کیا، بات تو چل نکلی ہے
خود ہی قاتل ہیں، مری لاش اُٹھانے والے
دیکھتے دیکھتے بُنیاد ہلا دیتے ہیں
یوں تو کچھ بھی نہیں کہتے ہیں زمانے والے
کسی دروازے پہ دستک ہے نہ آواز کوئی
سُرخ کرنوں میں اُتر آئے جگانے والے
لفظ و معنی سے ہے پُر، جسم کا مینار بلند
زرد فنکار بھی ہوتے ہیں، خزانے والے
جب بہار آئی تو کیا خون نہ چھڑکیں گے جمیل
آندھیوں میں بھی دیئے اپنے جلانے والے!

جب سے سیکھا تری آنکھوں سے مروّت کرنا
آ گیا ہم کو بھی اے دوست محبّت کرنا
یہ بھی اظہارِ محبّت کی ادا ہے شاید
بات کوئی بھی نہ ہو پھر بھی شکایت کرنا
اپنے سر بھی کوئی الزامِ محبّت لینا
تم ہر اک بات مجھی سے نہ روایت کرنا!
تجھ کو دیکھوں تو ترا حسن، خدا لگتا ہے
سوچتا بھی ہے تجھے تیری عبادت کرنا
مجھ سے تو کچھ نہ کیا جائے گا ہنگامِ وصال
جذبۂ شوق ذرا آپ ہی ہمّت کرنا
اُس کا جانا تو قیامت کا گزر جانا ہے
مُسکراتے ہوئے اُس شخص کو رُخصت کرنا
دشمنوں سے بھی بہر طور نبھائے رکھنا
یوں بھی ہوتا ہے رفیقوں سے عداوت کرنا
لب ہلیں اور زمانہ مرا دُشمن ٹھہرے
کس قدر جُرم ہے اظہارِ صداقت کرنا!
کبھی روتی، کبھی ہنستی ہوئی آنکھوں سے جمیل
سامنے اُس کے بیاں اپنی حکایت کرنا

عابد عشری

مری نظر میں وہی کچھ خیالِ فن کرتے
جو حرف حرف کو صرفِ جمالِ فن کرتے

متاعِ فکر کم آگاہ کا نصیب کہاں
تہی نظر سے بھلا کیا سوالِ فن کرتے

کسی سے ہم تو کوئی سچّا شعر سن نہ سکے
تمام عمر ہی گزری ملالِ فن کرتے

انہی کے واسطے گلہائے آگہی کھِلتے
لہو کو اپنے جو صرفِ جمالِ فن کرتے

نہ جانے کون مہ و مہر کا مقدّر ہو
ہر ایک ذرّے سے کسبِ کمالِ فن کرتے

دلوں سے کرتے ادا جو عروسِ شعر کا مہر
وہ رُونمائیِ حسن و جمالِ فن کرتے

کسی کا ہاتھ نہیں ہے مری تباہی میں
رکھا ہی کیا ہے میاں عذرِ بے گناہی میں

کہیں اندھیروں سے پھوٹی ہے روشنی کی کرن
بصیرتیں نہ بسا شہرِ کم نگاہی میں

فضائے زیست اندھیرا ترا مقدّر ہے
سحر کے رنگ بھی ہیں رات کی سیاہی میں

مرے مقدمے میں انصاف کی امید کہاں
جب آگیا مرا قاتل مری گواہی میں

حضور اس کا تقابل غمِ حبیب سے کیا
کسے ہے شک غمِ دنیا کی بے پناہی میں

کسی غریب کی کٹیا مہک نہیں سکتی
اسیر آج بھی خوشبو ہے قصرِ شاہی میں

شہیدِ راہ وفا ہوں کہیں نشاں نہ مزار
ہوں اُس کی فوج کا گمنام اک سپاہی میں

میں زندگی کو خود اپنی نظر سے دیکھتا ہوں
مجھے شریک نہ کر جرمِ کم نگاہی میں

عابد حشری

آوارگی کا حسن بکھر جانا چاہیے
جب رات بھیگ جائے تو گھر جانا چاہیے

سیلِ بلائے جاں سے گذر جانا چاہیے
جینے کی آرزو ہو تو مر جانا چاہیے

وہ شعلۂ جنوں ہو کہ ہو سوزِ آگہی
سینے میں روشنی کو اتر جانا چاہیے

بندِ قبا و جیبِ گریباں کی فکر کیا
موسم جدھر بلائے ادھر جانا چاہیے

زہرِ خودآگہی کو کہ ہے اعتبارِ زیست
رگ رگ میں خون بن کے اتر جانا چاہیے

شاید پھر ہو سنگِ ملامت سے سرفراز
کچھ دیر اس گلی میں ٹھہر جانا چاہیے

کب تک انا کے خول میں سمٹا رہے شعور
شعلہ نہ بن سکے تو بکھر جانا چاہیے

سنتے ہیں اس گلی میں دل و جاں کا ہے زیاں
اک بار اس طرف بھی مگر جانا چاہیے

وقت کا زہر مری آنکھ سے کب اوجھل تھا
آج بھی حشری مرے سامنے میرا کل تھا

وہی وحشت وہی سناٹا وہی ویرانی
شہر بھی دیکھ لیا شہر بھی اک جنگل تھا

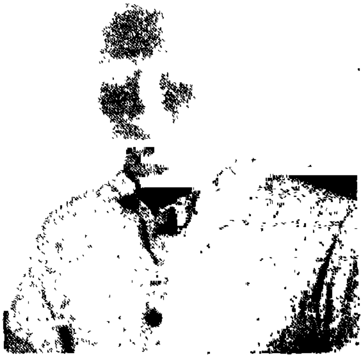
جو سرِ عام کرے ہوش و خبر کی باتیں
وہ بھی یارو کوئی میری ہی طرح پاگل تھا

گرمیٔ حسنِ مدارات سے دم گھٹنے لگا
وہ شبستانِ محبت تو نہ تھا مقتل تھا

جانے میں کیوں نہ الٹ پایا نقابِ رخِ زیست
میرے اندازِ جنوں میں تو بڑا کس بل تھا

پیاسی دھرتی پہ برستا تو کوئی بات بھی تھی
لے اڑی جس کو ہوا وہ بھی کوئی بادل تھا

کتنی روشن تھی رہِ فکر و نظر ہم سفرو
دل میں سوزِ غمِ احساس نہ تھا مشعل تھا



امّید فاضلی

وہ پیار کی خوشبو جو چھپائی نہیں جاتی
اب وصل کے موسم میں بھی پائی نہیں جاتی

آشفتہ سری گھر سے تو لے آئی مگر اب
تنہائی کی دیوار گرائی نہیں جاتی

وہ شخص بھی کیا تھا کہ نہیں ہے تو ہر اک سانس
تہمت ہوئی ایسی کہ اٹھائی نہیں جاتی

تلوار سی وہ رات وہ آواز دھنک سی
چاہوں کہ بھلا دوں تو بھلائی نہیں جاتی

ہر آنکھ میں آنسو ہے مگر دل کے نگر میں
وہ آگ لگی ہے کہ بجھائی نہیں جاتی

وہ گرد خد و خال جسے عکس کہا جائے
آئینے کے چہرے سے ہٹائی نہیں جاتی

سچائی نمو پاتی ہے مقتل کی زمیں پہ
یہ فصل صحیفوں میں اگائی نہیں جاتی

جاگ اٹھتی ہے ذرّوں میں جہاں اپنی تب و تاب
سورج سے وہاں آنکھ ملائی نہیں جاتی

امّید مرا جرم یہ ٹھہرا ہے کہ مجھ سے
آواز میں آواز ملائی نہیں جاتی



انجم اعظمی

غزل

اس سے بچھڑے ہیں تو کیا مرجائیں گے
زندگی بھر اس کو کھو کر پائیں گے

دل نہ بہلے گا سہی پر ہر گھڑی
دل کو سو سو طرح سے بہلائیں گے

بے خودی میں مل گئی غم سے پناہ
ہوش گر آیا بہت گھبرائیں گے

تیز تر اے شعلۂ ذوقِ نمو
خاک کے ذرے فلک تک جائیں گے

ہم بھی ان اڑتے پرندوں کی طرح
اپنے بازو دور تک پھیلائیں گے

ہاتھ آیا نشۂ ہستی بہت
دل کو شیشے کی طرح ٹکرائیں گے

رونقِ بزمِ سخن گو ہم نہیں
اٹھ گئے تو پھر بہت یاد آئیں گے

احمد ہمدانی

وہ رہ رہ کر جو پچھتاتا رہے گا
مزہ زخموں کو بھی آتا رہے گا

نظر کی اوٹ سے پرچھائیاں سی
وہ کب تک مجھ میں پھیلاتا رہے گا

یونہی بڑھتی رہیں گر دوریاں تو
ہمارا تجھ سے کیا ناتا رہے گا

دکھوں سے یہ جو سرمایہ ملا ہے
یہ سب بھی ہم سے کیا جاتا رہے گا

سو پھر بھی ہم نہ پہچانیں گے خود کو
کوئی آئینہ دکھلاتا رہے گا

کہاں تک ہم بھی اس کا ساتھ دیں گے
یہ دل تو آگ برساتا رہے گا

بچھڑ کے ہم سے وہ اب تک بچھڑ سکے بھی کہاں
جو لمحے بیت گئے، بیت کر گئے بھی کہاں

ذرا سی دیر میں ہو جائیں ہم سے لوگ بحال
نگاہِ دوست میں اب ایسے معجزے بھی کہاں

کبھی کبھی تو یہ پچھلے پہر نے ہم سے کہا
دلوں کے کام کچھ آئے یہ رت جگے بھی کہاں

عداوتیں جو ہمیں جان سے تھیں بڑھ کے عزیز
غبار وقت میں اب ان کو ڈھونڈتے بھی کہاں

کسی کے دھیان میں گزری ہے ساری عمر مگر
محبتوں کے جو حق تھے ادا ہوئے بھی کہاں

اُداس کر تو گئی اس کی بے ادائی مگر
دیے جلائے تھے خوابوں نے جو بجھے بھی کہاں



احمد ہمدانی

ہر اک جھونکے پہ منہ کیوں فق ہوا ہے
ہوا نے کان میں کیا کہہ دیا ہے

عجب دکھ ہے کہیں بھی کیا کسی سے
رہیں اپنوں میں کب تک اجنبی سے

یہ سوتے جاگتے کیوں مدّتوں سے
تعاقب ایک سایہ کر رہا ہے

بنا پائے نہ اک لمحہ بھی اپنا
توقع تو بہت تھی زندگی سے

مبارک تیرے گھر کے رنگ تجھ کو
پسِ دیوار کوئی سو گیا ہے

کہاں پہچانتے تھے گھر بھی اپنا
کبھی آتے تھے جب ان کی گلی سے

جہاں کے یہ حسین منظر کسی نے
دکھوں کا ان پہ کیوں غازہ ملا ہے

یہاں ٹھہراؤ بھی ہے کب کسی کو
مگر یہ دکھ ہیں کیسے دائمی سے

غنیمت تھا ہمارے دل کا دیپک
عجب لَو دے کے جو اب بجھ چکا ہے

تمھیں دیکھیں کہ دیکھیں رنگِ عالم
تکیں کس کس کو یوں ہم بےکسی سے

مرے دل میں تمنّاؤں کا میلہ
کسی دریا میں اک کچّا گھڑا ہے

بُنا کرتے تھے کیا کیا خواب ہم بھی
کبھی لڑ کر، کبھی مل کر کسی سے

صہبا اختر

روشنی کے ساتھ پہنچی، تیرگی انجام کی
میں نے جب سورج تراشے زندگی نے شام کی

دیکھ لینا کوئی چہرہ، چوم لینا کوئی زلف
میری نظروں میں عبادت ہے یہ صبح و شام کی

وہ ہے اس کا بسترِ راحت، ہے اور سامانِ خواب
میری آنکھوں میں بھری ہے نیند جس کے نام کی

تو نے ان زہرہ وشوں کو کس لئے پروردگار
صورتیں پریوں کی دی ہیں، عادتیں اصنام کی

اُس کی آنکھیں کتنی غزلیں بخش دیتی ہیں مجھے
جس کی زلفوں میں چھپی ہیں بارشیں الہام کی

جب لب و رخسارِ جاناں کے قصیدے لکھ چکا
تو خدا نے میرے فن کو روشنی انعام کی

آسماں تو اب زمیں سے گفتگو کرتا نہیں
پھر یہ کس نے مجھ کو اپنی خامشی پیغام کی

میکدے تو بند ہیں پھر بھی شبِ مہتاب میں
چاندنی پیتا ہے صہبا، مہ وشوں کے نام کی

پھر اس کے بعد کی ہے جو روش ایجاد کی ہم نے
سرِ شہرِ سخن پہلے، غزل بنیاد کی ہم نے

تجھے تصویر کرنے کا ہنر آ ہی گیا تو پھر
غلط ہے کارِ فن میں زندگی برباد کی ہم نے

سفارت خانۂ اقلیمِ گل محبوب تھا اتنا
جہاں بھی مل گئے تنظیمِ ابر و باد کی ہم نے

ہماری عمر گزری کل فراموشی کے مکتب میں
نہ دنیا یاد کی ہم نے، نہ عقبیٰ یاد کی ہم نے

اسے بھی زندگی کہتی ہے تو اے زندگی دشمن
بسر جو دل کے ویرانے میں تیرے بعد کی ہم نے

تصرف میں ہمارے رہ گئی تھی صرف ویرانی
یہ باندی بھی خدا کی راہ میں آزاد کی ہم نے

نویدِ آمدِ جاناں سنی تو دل میں چپکے سے
سجا لی خود ہی اک محفل مبارکباد کی ہم نے

مزاجِ میر و غالب ساتھ لے کر آئے ہیں صہبا
کراچی کو غزل بخشی جہاں آباد کی ہم نے

فضا ابنِ فیضی

ہت دنوں بعد، منھ سے دانش کی بات نکلی
تمام تر کائنات، توسیعِ ذات نکلی

ھنے اندھیروں سے چاندنی کی برات نکلی
یسلو، شفق کے لہو کی کچھ تو زکات نکلی

بدلتے لمحوں کا سیل اسے لے گیا بہا کر
ہ آگہی مرے عصر کی بے ثبات نکلی

راغ کوئی مرے تعاقب میں نہ لگ جائے
دن چرائے سحر کی ڈیوڑھی سے رات نکلی

چھپا ہے مجھ میں جو دوسرا شخص، کون ہے وہ
چلا جو گھر سے تو ایک پرچھائیں ساتھ نکلی

ار تقلہ ہے کہ نیند میں چل رہی ہے دنیا
سیاہ چمکیلی دھند، صبحِ نجات نکلی

چھپا لیا ہے تمام سچائیوں کو اس نے
سیاستِ وقت، چادرِ شش جہات نکلی

یہ خواب در خواب، عکس در عکس، نقش و پیکر
بصیرتوں کے افق سے جنگل کی رات نکلی

سفر ہے در پیش، پھر مجھے کالے پانیوں کا
خود آگہی بھی، سفینۂ حادثات نکلی

الجھ کے چھلکوں میں رہ گئے سارے مغز والے
یہ فتح الفاظ کی، معانی کی مات نکلی

یہاں بجز اس کے ثمرۂ محنتِ قلم کیا
گلہ ہی کیا، بے ثمر جو شاخِ نبات نکلی

ابھی تو الجھے ہیں اپنے ہی لاشعور میں سب
شعور کا سارا فلسفہ جھوٹی بات نکلی

فضا یہ مصرعہ ہی لاؤ! دیوارِ جاں پہ لکھ دوں
ہوس ہی اس دور میں متاعِ حیات نکلی

اختر ہوشیارپوری

ہم اپنے سر پہ کھلا آسمان رکھتے ہیں
کشادہ دل ہیں کشادہ مکان رکھتے ہیں

تمام رستے اسی کی گلی کو جاتے ہیں
ہم اپنے گھر کا یہی اک نشان رکھتے ہیں

زمین دسترسِ آسماں سے دور نہیں
ہم اپنی ذات مگر درمیان رکھتے ہیں

وسیع تجربے رکھتی ہے ناؤ کاغذ کی
کہ سینہ سینہ سمندر چٹان رکھتے ہیں

سفر کے جتنے مراحل ہیں سب نگاہ میں ہیں
ہوا کے سامنے ہم بادبان رکھتے ہیں

نہ ہو چراغ تو اپنا لہو جلاتے ہیں
ہم اپنے کچے گھروندوں کا دھیان رکھتے ہیں

صحیفے حرف و نوا کے قلم پہ اترے ہیں
ہم اپنے گھر پہ اسی کا نشان رکھتے ہیں

خود اپنے سامنے شاید پلٹ کے آ جائیں
گذرتے لمحوں سے کیا کیا گمان رکھتے ہیں

ہوا کا چاروں طرف اک مہیب جنگل ہے
مگر یہیں پہ ہم اختر، مکان رکھتے ہیں

اب جدھر جائیں لے کے سر جائیں
کچھ تو اپنی شناخت کر جائیں

رات کے سائے سر پہ آ پہنچے
چاند ابھرنے لگا ہے گھر جائیں

لوگ بے چہرہ اور ہیں بے سر
کیوں نہ اس گرد میں بکھر جائیں

شرط یہ ہے نہ مڑ کے دیکھیں گے
لوگ صحرا میں بےخطر جائیں

ساحلوں سے چراغ لے لے کر
پانیوں میں اتر اتر جائیں

وہ سفر ہے کہ ختم ہو نہ کہیں
اپنے اندر کبھی در بدر جائیں

رہ گزاروں میں موڑ مڑتے ہیں
دور تک تتلیوں کے پر جائیں

راستے منزلوں سے پیوستہ
راہرو ہی بکھر بکھر جائیں

سایہ اپنا ہوا گراں اختر
اپنے قامت سے اب گذر جائیں



عبیداللہ علیم

تو اپنی آواز میں گم ہے میں اپنی آواز میں چُپ
دونوں بیچ کھڑی ہے دنیا آئینۂ الفاظ میں چُپ

اوّل اوّل بول رہے تھے خواب بھری حیرانی میں
پھر ہم دونوں چلے گئے پاتال سے گہرے راز میں چُپ

خواب سرائے ذات میں زندہ ایک تو صورت ایسی ہے
جیسے کوئی دیوی بیٹھی ہو حجرۂ راز و نیاز میں چُپ

اب کوئی چھُو کے کیوں نہیں آتا اُدھر سِرے کا انگ
جانتے ہیں پر کیا بتلائیں لگ گئی کیوں پرواز میں چُپ

پھر یہ کھیل تماشا سارا کس کے لئے اور کیوں؟
جب اس کے انجام میں چُپ ہے جب اس کے آغاز میں چُپ

نیند بھری آنکھوں سے چوما، دیئے نے سورج کو اور پھر
جیسے شام کو اب نہیں جلنا کھینچ لی اس انداز میں چُپ

غیب سمے کے گیان میں پاگل کتنی تان لگائے گا
جتنے سُر ہیں ساز سے باہر اس سے زیادہ ساز میں چُپ

محسن احسان

(نذرِ مصحفی)

رواں بدن سے ہر اک شب ہے خواب میں دریا
لہو کی لہر ہے محسن شباب میں دریا

سمندروں کی طرح ٹھاٹھیں مارنے والا
تلاش کرنے چلا ہے سراب میں دریا

شکست و ریخت کے قصّے زبانِ موج پہ ہیں
بلا جواز نہیں پیچ و تاب میں دریا

عجب کہانی کناروں پہ کر گیا تحریر
جو پڑھ سکو تو ہے ہر نقشِ آب میں دریا

شراب اوس کی مانند قطرہ قطرہ نہ پی
کہ کل کرے گا طلب وہ حساب میں دریا

نہیں ہے ہم میں بصیرت کہ ہم بھی دیکھ سکیں
درخت بیج میں پنہاں، حباب میں دریا

انور شعور

دل یہ کس کے دَر جاتا ہے — خوار آتا ہے مگر جاتا ہے
من کے بَن بیں کس سے پوچھوں — رستہ کون نگر جاتا ہے
خوب ہے انسانوں کا ریوڑ — یک جا ہو کے بکھر جاتا ہے
دل، دیوانے پن میں، کرشمے — کیسے کیسے کر جاتا ہے
ایسے جا، جب اُس کے گھر جا — جیسے اپنے گھر جاتا ہے
آدمی ہو سہراب کہ رستم — سوتے سوتے ڈر جاتا ہے
روکوں کیا آوارہ دل کو — روکو، اور اُدھر جاتا ہے
تجھ سے ملتے وقت سنا تھا — ملنے سے جی بھر جاتا ہے
دل ہو اگر ویران تو دیدہ — دھول اُڑتی ہے جدھر جاتا ہے
جو کچھ کرنا ہے، اب کر لو — بعد میں وقت گذر جاتا ہے
میری حالت دیکھ کے بھی وہ — شوق سے جائے اگر جاتا ہے
قرضِ دنیا تو دیتا جا — اے دل ٹھیر کدھر جاتا ہے
آدمی جاتا ہے سفر دل پر — یا سامانِ سفر جاتا ہے
عشق کی ناکامی کا سہرا — دیکھیں کس کے سر جاتا ہے
دنیا پر جاتا نہیں اب دل — بالفاظِ دگر جاتا ہے
حسن وہ پروانہ ہے جو سیدھا — سوئے شمع نظر جاتا ہے
سب کے سب روشن نظروں کا — قافلہ سمتِ سحر جاتا ہے
دیکھی ہے مے پی کر، ہم نے — سارا نشہ اُتر جاتا ہے
ہم دونوں چپ دیکھ رہے ہیں — یہ بچہ کس پر جاتا ہے
دل جاتا ہے اپنے کر موں — تہمت مجھ پہ دھر جاتا ہے
جاں سُدھرے تو بگڑ جاتی ہے — دل بگڑے تو سدھر جاتا ہے

دیکھ شعورؔ کی حالتِ انساں
جیتے جی بھی مر جاتا ہے

انور شعورؔ

مشاعرے میں جنھیں داد دے کے آتے ہیں
گھر آ کے ان میں سے اکثر پہ مسکراتے ہیں

گرے تھے پیاس سے ہم، اس نے کہہ دیا جاؤ
نشہ حرام ہے ان پر جو لڑکھڑاتے ہیں

سگانِ کوچہ کو جی بھر کے بھونک لینے دو
مرادفات لغت کچھ نہیں بھی آتے ہیں

شراب، عشق نہ ہو تو کبھی نہیں چھٹتی
وہ اور ہوتے ہیں بدنام جو چھپاتے ہیں

ہمارے منہ سے نکلتی ہے بات ذو معنی
خبر نہیں کہ ہنساتے ہیں یا رُلاتے ہیں

سزا بڑی ہے محبت میں شرک کی لیکن
میں کیا کروں کہ مجھے آپ یاد آتے ہیں

پلٹنے آئیں نہ کیوں دوڑ دوڑ کر کتے
کبھی کبھی تو ہم اس کی گلی میں جاتے ہیں

ادب ہی شوق، ادب ہی وسیلۂ روزی
یہ بات الگ ہے لٹاتے ہیں یا کماتے ہیں

کمال ظرف خود آنکھوں سے دیکھ لو گے شعورؔ
جناب شیخ ابھی میکدے سے آتے ہیں

آ کے ترستا ہوں میں ہم سفری کے لئے
تو بھی نکل گھر سے اب دربدری کے لئے
آگہی و علم کا میں نہیں منکر مگر
بے خبری چاہیئے باخبری کے لئے
رات مری پتلیاں خود ہی ٹھٹھک سی گئیں
حُسن تو تیار تھا جلوہ گری کے لئے
ڈال گلے میں مرے حلقۂ ہستی کا طوق
دار کی کیا حیثیت ایک جری کے لئے
بزم میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر فضول
خوار ہوئے ہم فقط خوش نظری کے لئے
دیر سے اس شہر میں آئے ہوئے ہیں آج بھی
ڈھونڈ رہے ہیں جگہ شب بسری کے لئے
روز نئے سے نیا رنگ پلاتے ہیں آپ
مجھ سے بلا نوش کی تر بتری کے لئے
ہر کس و ناکس نہیں تلخ حقیقت کا اہل
بات کا ڈھب چاہیئے ایک کھری کے لئے
سوکھنے والے ہیں اب، جمع تھے جو چند پھول
من کے چمن میں کسی بھاگ بھری کے لئے
اور شرابیں تو کیا شہر میں ہوں دستیاب
ہونٹ ترستے ہیں اب لال پری کے لئے
بیل کی ہر پنکھڑی جھیل گئی آندھیاں
رعب ضروری نہیں بے جگری کے لئے
نامہ گری کے لئے دل کو یہاں رکھ لیا
چھوڑ دیا آنکھ کو نامہ بری کے لئے
بھیڑ بھڑکا مجھے دل سے نہیں ہے پسند
شہر کراچی نثار کنجِ مری کے لئے
حسن سے پہلے شعورؔ حسن کے آثار دیکھ
شرط ہے یہ امتحان دیدہ وری کے لئے

سحر انصاری

حقیقتوں سے ملاقات خواب میں رکھیے
یہ رمز یادِ محبت کے باب میں رکھیے

کشاکشِ غمِ سود و زیاں میں اپنے پاس
ہے ایک دل سو اسے کس حساب میں رکھیے

یہ آنکھ آنکھ کنول اور یہ ہونٹ ہونٹ غزل
کہا ہے کس نے یہ چہرے نقاب میں رکھیے

اُجڑ گیا کہ بکھرنے لگا ہے چاند کا حُسن
یہ گفتگو تو شبِ ماہتاب میں رکھیے

ہزار جیب میں کون و مکاں کھنکتے ہوں
متاعِ بحر نہ دستِ حباب میں رکھیے

سوالِ عشق تو اِک رمز تھا سو رمز رہا
جوابِ حُسن کو حُسنِ جواب میں رکھیے

لہو رُلاتے ہیں اکثر گریز پا لمحے
سرابِ زیست کو زنجیرِ آب میں رکھیے

سحر سزا و جزا کا جو تذکرہ چھڑ جائے
[illegible]

نقشِ سفال چاک سے اُترا، بکھر گیا
کوزے کے ساتھ ہی ہنرِ کوزہ گر گیا

دستور کس کو یاد تھے مہماں سرائے کے
میں انتظارِ صبح میں شب تک ٹھہر گیا

کچھ اس کی داد بھی شفقِ شام سے ملے
جو آفتاب خاک کے اندر اُتر گیا

بنجر زمیں میں ہم نے اُگائے لہو کے پھول
احسان یہ بھی فصلِ بہاراں کے سر گیا

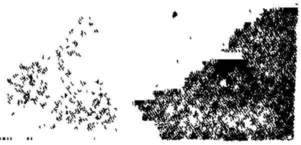
شہرِ طرب میں کون اٹھائے وفا کی لاش
تھا اِک ہجوم سا جو سرِ رہگزر گیا

کچھ اور تیز و تند ہو اے موجِ مضطرب
ساحل سمجھ رہا ہے کہ طوفاں گزر گیا

اے مجرمِ معذرت کا نہیں ہے کوئی جواز
کیوں مجھ کو دیکھ کے ترا چہرہ اُتر گیا

ماتم کہیں ہوا نہ کوئی آنکھ نم ہوئی
[illegible]

ندا فاضلی



جب سے قریب ہو کے چلے زندگی سے ہم
خود اپنے آئینے کو لگے اجنبی سے ہم

اچھے بُرے کے فرق نے بستی اجاڑ دی
مجبور ہو کے ملنے لگے ہر کسی سے ہم

شائستہ محفلوں کی فضاؤں میں زہر تھا
زندہ بچے ہیں ذہن کی آوارگی سے ہم

کچھ دور چل کے راستے سب ایک سے لگے
ملنے گئے کسی سے مل آئے کسی سے ہم

جنگل میں دور تک کوئی دشمن نہ کوئی دوست
مانوس ہو چلے ہیں مگر بمبئی سے ہم

جہاں نہ تیری مہک ہو ادھر نہ جاؤں میں
مری سرشت سفر ہے گزر نہ جاؤں میں

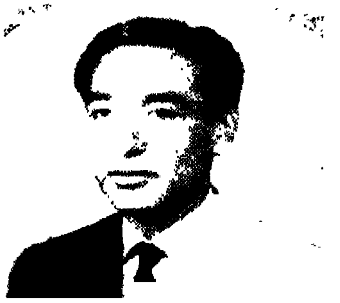
مرے بدن میں کھلے جنگلوں کی مٹی ہے
مجھے سنبھال کے رکھنا بکھر نہ جاؤں میں

مرے مزاج میں بے معنی الجھنیں ہیں بہت
مجھے اُدھر سے بلانا جدھر نہ جاؤں میں

کہیں پکار نہ لے گہری وادیوں کا سکوت
کسی مقام پہ آکر ٹھہر نہ جاؤں میں

نہ جانے کون سے لمحے کی بد دعا ہے یہ
قریب گھر کے رہوں اور گھر نہ جاؤں میں

ناصر شہزاد



تیرے قرب کا آنند، تیرے ہجر کا صدمہ
کایَہ کی کرن کایا، سانجھ کا نرت نغمہ

حالِ دل کہوں کب تک، بِن ترے رہوں کب تک
دھیان بھی تری صدما، پران بھی تری زدمَا

اِک اکھنڈ رہتے تھے، میرے بیچ بہتے تھے
رَس کے رابطے راوی، مَدھ کے ماجرے پدما

بول سب زباں سے کہہ، ہاتھ سے بدن مت گہہ
اور ے سانورے سجنا، اورے بانورے بلما

جُھوم جھُوم کر مہکیں زُلف میں گُندھے گجرے
جُوم چوم کر چہکیں پائلیں حسیں قدمالہ

پُستکوں میں، پرانوں میں... ارضوں آسمانوں میں
ایک نام کی بھگتی، ایک قول کا کلمہ

شبد میری شوبھا ہے، گیت تیرا گہنا ہے
رابطوں، رواجوں کو ساتھ ساتھ رہنا ہے

پریت پران کی بھگتی، دان آن کی شکتی
دِل بھی دے چکے تجھ کو، دُکھ بھی تجھ سے کہنا ہے

نین رین سج ساگر، موج اوج رت ناگر
سر پہ چتر چندن کا جل پری نے پہنا ہے

مَدھ ملاپ کا قصّہ، تیج تیاگ کا حِصّہ
دھن سمان دامن میں پریت کا رُلہنا ہے

موہنا سے ملنا ہے، پھول پھول کھلنا ہے
لہر لہر کامن کی، کامنا میں بہنا ہے

اَب تو کاگ بھی چھت پر، بولتا نہیں آ کر
دُکھ تری جدائی کا اور کتنا سہنا ہے

افتخار عارف



سرِ شاخِ صبح کھلا گلاب یقین کا
یہ مرا یقین کرم ہے ایک امین کا

یہ نمود و نام مرے وجود کی بازگشت
یہ مرا وجود غبار میری زمین کا

کبھی اعتبار کبھی فرار کبھی پناہ
کوئی رابطہ رہے تو مکان و مکین کا

میں وہ ہوں کہ مرے چہار سمت غنیم۔ اور
مجھے اعتبار یسار کا نہ یمین کا

مرے نام سے بھی کبھی کوئی سندِ وفا
مرے حق میں بھی کوئی فیصلہ ہو زمین کا

چلو آؤ شہر گماں میں چل کے صدا لگائیں
کہ وہیں کسی سے ملے گا اجر یقین کا

کبھی کھل کے لکھ جو گزر رہا ہے زمین پر
کبھی قرض بھی تو اتار اپنی زمین کا

کہیں سے کوئی حرف معتبر شاید نہ آئے
مسافر لوٹ کر اب اپنے گھر شاید نہ آئے

قفس میں آب و دانے کی فراوانی بہت ہے
اسیروں کو خیالِ بال و پر شاید نہ آئے

کسے معلوم اہلِ ہجر پر ایسے بھی دن آئیں
قیامت سر سے گزرے اور خبر شاید نہ آئے

جہاں راتوں کو پڑ رہتے ہوں آنکھیں موند کر لوگ
وہاں مہتاب میں چہرہ نظر شاید نہ آئے

کبھی ایسا بھی دن نکلے کہ جب سورج کے ہمراہ
کوئی صاحب نظر آئے مگر شاید نہ آئے

سبھی کو عافیت کوشی ہنر لگنے لگی ہے
سروں پر اب غبارِ رہ گزر شاید نہ آئے



احسن زیدی

کر آہنی ریت کے گھروں کو
آواز پھر دینا بارشوں کو

صحرا میں تلاش کر نہ سائے
پانی میں نہ ڈھونڈ ذائقوں کو

خوابوں کے گلاب چھن گئے ہیں
دیتے ہیں دعائیں رتجگوں کو

کرتے ہیں پرندے یاد اب تک
گزرے ہوئے اُجلے موسموں کو

سکّے یہ پُرانے دور کے ہیں
محفوظ رکھ اپنے تجربوں کو

پھر تیز ہوا لگی ہے چلنے
بجھنے سے بچاؤ مشعلوں کو

ابھی تو ٹھہریں گے الفاظ معتبر اس کے
کھلے نہیں ہیں ابھی شہر پر ہنر اس کے

چمکتا رہتا ہے مہتاب اس کے آنگن میں
شبِ سیاہ اتر آئے کیسے گھر اس کے

کبھی وہ ابرِ گہربار تھا، مگر اب تو
شجر شجر پہ آمد آئے ہیں شرر اس کے

جلا دیا ہے مجھے دھوپ کی تمازت نے
ملی نہ چھاؤں کہیں بھی اتنے سے شجر میں بھی
[illegible]

وہ شام وصل کی رُت میں اڑان کیا کرتا
[illegible]
ہوائے وصل میں احسن بکھرنا پڑا مجھے

عالمتاب تشنہ

ترے عارض سے خوش رنگی کا ہر رشتہ شراب و جام کا ہے
ہر موسم تیری نسبت سے ہر منظر تیرے نام کا ہے

دن ڈھلا تو شب کے بستر پر ترے زلف کی افشاں بکھر گئی
یہ دنیا جس کو چاند کہے اک دیا وہ تیرے بام کا ہے

ہاتھوں کے حصار میں تو رکھتا ہے روشنیوں کے عذر بہت
ہے تیز ہواؤں کا موسم مجھے دھڑکا چراغِ شام کا ہے

اسے اپنے رستوں چلنا تھا اسے جانا تھا وہ چلا گیا
پل دو پل کی ہم سفری تھی اب رونا صبح و شام کا ہے

کوئی لے کر آئے تازہ ہوا کوئی جھونکا ٹھنڈے موسم کا
یہ لمحے بڑے آشوب کے ہیں یہ وقت بڑے آلام کا ہے

اس قصۂ غم کا غم نہ کرو تم اپنی آنکھیں نم نہ کرو
یہ حال اسی بے حال کا ہے یہ نام اسی بدنام کا ہے

ہیں آنکھوں آنکھوں پیام ابھی کہ ہے اس سے رسم و راہ نئی
ابھی ضبط کلام کہاں ہم کو ابھی اس سے ربط سلام کا ہے

سنتے ہیں کہ تشنہ تیری غزل مقبول ہے ماہ رخوں میں بہت
کہتے ہیں کہ شہر نگاراں میں بڑا شہرہ تیرے کلام کا ہے

سوادِ جاں میں نہ یوں دربدر پھرا مجھ کو
مسافرت مرے گھر کا پتہ بتا مجھ کو

مجھے تو اپنے خد و خال تک بھی یاد نہیں
دیارِ خود نگری آئینہ دکھا مجھ کو

میں اپنے ظرف کی حد سے نکل نہ جاؤں کہیں
مری انا مری قامت سے مت بڑھا مجھ کو

چراغِ خلوتِ جاں ہوں اداس خیال میں ہوں
بجھا نہ دے ترے دامن کی یہ ہوا مجھ کو

لبوں پہ حرفِ تمنا کا عکس آنے لگا
دکھا رہا تھا کوئی دل کا آئینہ مجھ کو

ملا تو قصۂ ہجر و وصال لے بیٹھا
کہاں کہاں کے فسانے سنا گیا مجھ کو

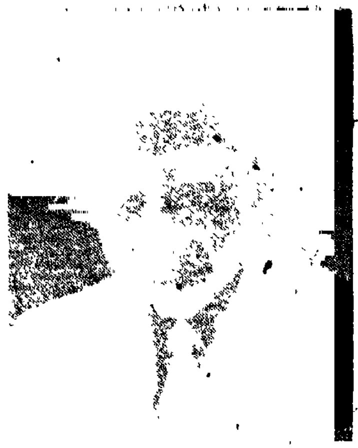
لہو میں جیسے وہ جگنو پکڑ کے چھوڑ گیا
کچھ ایسا کھل کے ملا جگمگا گیا مجھ کو

درِ خیال پہ دستک کا تھا وہی انداز
ہوائے یاد کا جھونکا رلا گیا مجھ کو

نہ جانے کتنے اجالوں کا ہے بھرم تشنہ
چراغِ خانۂ مفلس ہوں مت بجھا مجھ کو

عالمتاب تشنہ

لمحہ لمحہ میری راہ میں بکھرا ہے
سنگِ نفس سے شیشۂ ساعت ٹوٹا ہے
روشنیاں خوشبو لے کر اڑ جاتی ہیں
سانسوں سے یہ کون چراغ بجھاتا ہے
جینے کے آثار ابھی کچھ باقی ہیں
آئینۂ انفاس ابھی دھندلاتا ہے
ایک پرندہ کھلی فضا میں اڑنے کو
محبسِ جاں میں پر پھیلائے بیٹھا ہے
بند اگر ہوں کان تو پھر اپنے اندر
طوفانوں کا شور سنائی دیتا ہے
جشن حسرتِ گریہ آج منائیں ہم
اے تنہائی وہ بھی آج اکیلا ہے
تنہا رات میں سرد ہوا کی نوحہ گری
سن کر کوئی دل کو پکڑ کر رویا ہے
آنکھوں کی جھیلوں میں عکس اترتے ہیں
تنہائی میں ہر چہرہ یاد آیا ہے
وہ نازک سی لڑکی وہ خوشبو پیکر
جس کا جسم سمندر ہے دل دریا ہے
جس کی آنکھوں میں زہراب تمنّا کا
جس کے ہونٹوں پر میخانہ کھلتا ہے
اس کے لمس کی شبنم دل پر گرتی ہے
اس کے قرب کا سورج سر پر آیا ہے
تجھے مبارک تشنہ دل کا خوں ہونا
تیری غزل میں رنگ تغزّل آیا ہے



جمیلؔ عظیم آبادی

رنگِ شفق سے مطلعِ انوار سے چلے
دن کا پتہ تو صبح کے آثار سے چلے

کیا کیا لکھا ہے وقت نے عبرت کے واسطے
شاید پتہ نوشتۂ دیوار سے چلے

ہر زاویہ کلام کا مجروح ہو گیا
کچھ ایسے تیر ترکشِ گفتار سے چلے

الزام پھر بھی سہل پسندی کا آ گیا
بچ کر ہزار سایۂ دیوار سے چلے

ماہ و نجوم سے بھی وہ آگے نکل گئے
جو زندگی میں برق کی رفتار سے چلے

صحرا کے خار و خس کو بھی اک تازگی ملی
جب رنگ و بو کے قافلے گلزار سے چلے

مشکل ہے شعر گوئی اب اس دور میں جمیلؔ
جب فن کی ناؤ فکر کے پتوار سے چلے

ثمر نظامی



پایابیوں کا شوق بھی مہنگا پڑا ہمیں
گہرے سمندروں میں اُترنا پڑا ہمیں

ہر لمحہ اک صدی کی مسافت میں آگیا
تیری گلی سے جب بھی گزرنا پڑا ہمیں

ہجر و وصال و درد، و ملال و سرور و کیف
کتنی تمازتوں سے گزرنا پڑا ہمیں

ہم خود سرابِ وقت کے سایوں میں ڈھل گئے
تجھ سے بھی تیرا نام چھپانا پڑا ہمیں

موسم طلب کا اور وہ بچپن کی خواہشیں
ساحل کی سیپیوں سے بہلنا پڑا ہمیں

اک حبس کے، تپش کے، تمازت کے باوجود
کچھ دیر سائبان میں رکنا پڑا ہمیں

باہر تمازتوں کے سوا اور کچھ نہ تھا
سائے کی طرح خود میں سمٹنا پڑا ہمیں

اُس کی سپردگی میں بھی تھیں غفلتیں بہت
دریا کے ساتھ رہ کے سلگنا پڑا ہمیں

کچھ حق تھے بستیوں کا بھی انساں کے روپ میں
کتنی بلندیوں سے اُترنا پڑا ہمیں

یہ شہرتِ گناہ بھی کافی نہ تھی ثمر
ہر رہ گزر پہ نام بھی لکھنا پڑا ہمیں

وہ تیرا ہجر کہ آئے خیال بھی کیا کیا
مگر یہ وصل کہ گزرے ملال بھی کیا کیا

جواب اُس کی ندامت نے بے تکان دیئے
نظر نے میری اُٹھائے سوال بھی کیا کیا

لبوں پہ نام سویروں کا اب نہیں آتا
سرابِ نور میں دیکھے کمال بھی کیا کیا

نہ آیا کوئی بھی گاہک یہ اپنی محرومی
وگرنہ ہم نے سجائے تھے مال بھی کیا کیا

نہ جانے خود کو بچا کر نکل گئے کیسے
وگرنہ راہ میں پھیلے تھے جال بھی کیا کیا

دل و نظر کا بھرم بھی نہ رہ سکا باقی
کہ تیرے شہر میں آئے زوال بھی کیا کیا

جھانکے اُن انکھڑیوں میں تو مر جائے آدمی
گہرے سمندروں میں اُتر جائے آدمی

یوں ٹوٹ کر کسی کو نہ چاہے کوئی کبھی
ایسا نہ ہو کہ پھر سے بکھر جائے آدمی

اندر سے چاہتوں کے جو چشمے اُبل پڑیں
باہر بھی ہر طرح سے نکھر جائے آدمی

قبضہ کسی مکاں پہ کیا ہے تو مان لے
یہ کیا کہ دل میں بس کے مکر جائے آدمی

اِک سمت تم ہو، ایک طرف ہے غمِ جہاں
ایسے میں تم بتاؤ کدھر جائے آدمی

اس جانِ آرزو سے کرے ترکِ التفات
یوں بھی نہ اپنی حد سے گزر جائے آدمی

تبسم رضوی

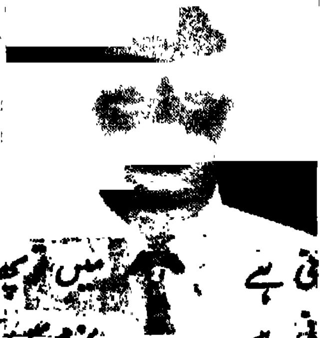
بادل کی طرح تو جو کبھی کھل کے برس جائے
یہ رنگ، یہ خوشبو مرے ہر انگ میں بس جائے

وہ کس سے کرے خوبیٔ قسمت کی شکایت
جو پھول کی آغوش میں خوشبو کو ترس جائے

شوخی نہ معاون ہو اگر بادِ صبا کی
کیوں ہجر زدوں تک تری خوشبوئے نفس جائے

یہ آنچ بدن کی، یہ ترے لمس کا جادو
ایسے میں نہ کیوں حد سے سوا دستِ ہوس جائے

شاید پلٹ آئے کوئی بھٹکا ہوا رہرو
صحرا میں اگر دور تک آوازِ جرس جائے



رئیس باغی

وہ جس نے شہرِ ستمگر کی خاک چھانی ہے
وہی سمجھتا ہے کیا چیز زندگانی ہے

ہمارے عہد کی اک یہ بھی کامرانی ہے
غمِ جہاں نے محبت سے ہار مانی ہے

وہ بات کرنے پہ آئے تو بولتا ہی رہے
عجیب اس کی طبیعت میں بھی روانی ہے

گزر نہیں مری دنیا میں اہلِ نفرت کا
کہ میرے دل پہ محبت کی حکمرانی ہے

رہِ حیات کے پتھر زمین پر ہی رہیں
یہاں کھنچی ہوئی دیوار سخت جانی ہے

یہ اپنے ذہن کی پستی نہیں تو کیا ہے کہ ہم
ہر اک بلا کو سمجھتے ہیں آسمانی ہے

حصار میں ہے غموں کے دلِ حزیں لیکن
اس آئینے ہی میں تصویرِ شادمانی ہے

زمانہ سنتا ہے کچھ اس طرح زباں سے مری
یہ آپ بیتی بھی جیسے کوئی کہانی ہے

جو پی رہا ہوں میں جامِ حیات سے باغیؔ
شراب کب ہے یہ غم کے پھلوں کا پانی ہے

میں تو پھر میں ہوں، وہاں میرا نہ سایا جائے
بزم میں جس کی ہر اک اپنا پرایا جائے

کسی حیلے سے اسے پاس بلایا جائے
اور پھر دل کا ہر اک زخم دکھایا جائے

دشمنی راس نہ آئی تو زمانے کی طرف
دوستی کے لئے اب ہاتھ بڑھایا جائے

لوگ بے درد ہیں دل توڑ دیا کرتے ہیں
ہم سے تو ایک گھروندا بھی نہ ڈھایا جائے

صبح ہوتے ہی خیالات کی تزئین کے لئے
روز کمرے کو نئے سر سے سجایا جائے

جسم کی جنتِ رنگیں سے کنارہ کر کے
روح کو نارِ جہنم نہ بنایا جائے

آج گر جائے گی بارش میں یہ چھت بھی لوگو
گھر کے خوابیدہ مکینوں کو بچایا جائے

ذہن میں پھول مہکتے ہیں جو کچھ یادوں کے
ان سے خوابوں کے دریچوں کو سجایا جائے

ہم سفر ساتھ وہاں تک تو چلیں اے باغیؔ
میرے ہمراہ جہاں تک مرا سایا جائے

شاہد کبیر

جائے گا بھی، تو کہاں جائے گا پاؤں والا
گھر سے نکلے کہ اٹھا ہاتھ دعاؤں والا

خوف سورج کی تمازت کا نہ سائے کا ملال
کانچ کا گھر ہے مرا، دھوپ نہ چھاؤں والا

محفلوں میں بھی وہ احساس ہے تنہائی کا
شہر میں جیسے اکیلا کوئی گاؤں والا

منتشر ہو گیا میں دشت میں ذرّوں کی طرح
آج موسم تھا بہت تیز ہواؤں والا

پھر اسی دھج سے سرِ راہ کھڑے ہیں شاہد
وہی انداز، فقیرانہ، صداؤں والا

محمد علوی

دکھ کا احساس نہ مارا جائے
آج جی کھول کے ہارا جائے

ان مکانوں میں کوئی بھوت بھی ہے
رات کے وقت پکارا جائے

سوچنے بیٹھیں تو اس دنیا میں
ایک لمحہ نہ گزارا جائے

ڈھونڈتا ہوں میں زمیں اچھی سی
یہ بدن جس میں اتارا جائے

ساتھ چلتا ہے جو سایہ اپنا
ایک پتھر اسے مارا جائے

سلیم کوثر



خود آشنائی کا لمحہ ذرا گزر جائے
پھر آئینہ مری پہچان سے مکر جائے

کبھی تو کشمکشِ وقت رک بھی جا کہ یہ شخص
ترے حصار سے نکلے تو اپنے گھر جائے

مذاقِ خانہ بدوشی سنبھال کر رکھنا
کہیں یہ حسرتِ دیوار و در نہ مر جائے

بس اک ستارے کو چھونے کی حسرتیں ہیں مجھے
پھر آسمان مرے صحن میں بکھر جائے

کئی دنوں سے وہ کشتی اِدھر نہیں آئی
مری صدا ذرا دریا کے پار اُتر جائے

گزشتہ نسل کی کوتاہیوں کا خمیازہ
جو میرے سر بھی نہ آئے تو کس کے سر جائے

سلیم جس کو مری جستجو کی خواہش تھی
اب آئے اور مجھے میرے سپرد کر جائے

پیڑوں کو درکار تو ہے ہریالی مٹی
لیکن کہاں سے لائے بوڑھا مالی مٹی
بنیادوں میں چھپا ہوا بیٹھا ہے پانی
دیواروں سے جھانکتی ہے مٹیالی مٹی
شام ڈھلی اور کہیں کنارے جا اترے گی
دن دریا میں موج اڑاتی کالی مٹی
پہلے بھی تو تجھ کو پاکر کھو ہی دیا
اب کے بھی کب ہم نے دیکھی بھالی مٹی
میرے لہو میں روشنی بن کر پھیل گئی
سدا سہاگن دھرتی کرماں والی مٹی
دھیرے دھیرے سارا سونا بکھر گیا
اب مٹی میں رہ گئی ہے بس خالی مٹی
پہلے یار سلیم پناہیں دیتی ہے
ماں بن کر پھر کرتی ہے رکھوالی مٹی

جمال احسانی

میں تنگ دست تھا الیا، گزارا کیا کرتا
کرم وہ کر کے بھی مجھ پر دوبارہ کیا کرتا
وہ روز دن ڈھلے آتا نہ گر دریچے میں
تو چاند کیا کیا کرتا ستارا کیا کرتا
کوئی بھی شخص اکیلا نہیں تھا ساحل پر
کسی کو ڈوبتے والا اشارا کیا کرتا
گنوانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا پاس مرے
میں اس گلی سے گذر کر دوبارا کیا کرتا
مری زمیں نے گو اچھا نہیں کیا مرے ساتھ
میں اپنی خاک سے لیکن کنارا کیا کرتا
نیا محاذ کوئی اور کھول دیتے ہم
وہ فتح یاب بھی ہو کر ہمارا کیا کرتا
میانِ صحن اک دیوار اٹھانے کے بدلے
میں ساری عمر تکلّف گوارا کیا کرتا

تنہا بھی منہ اٹھا کے نکلنا محال ہے
ہمراہ بھی ہجوم کے چلنا محال ہے
حرفِ دعا کا صفحۂ دست بلند پر
وہ بوجھ ہے کہ ہاتھ بدلنا محال ہے
دل نے جلائی ہیں جو سر طاق انتظار
ان موم بتیوں کا پگھلنا محال ہے
گم کیا ہوا ہے کاسۂ درویش اک یہاں
نظریں اٹھا کے شہر کا چلنا محال ہے
میرے بھی دستخط ہیں سر محضرِ شکست
میرے لئے بھی بچ کے نکلنا محال ہے
جن میں جمالؔ رات کو سوتے نہیں ہیں لوگ
ان آنگنوں سے چاند کا ڈھلنا محال ہے

عالمتاب تشنہ

لمحہ لمحہ میری راہ میں بکھرا ہے
سنگِ نفس سے شیشۂ ساعت ٹوٹا ہے
روشنیاں خوشبو لے کر اڑ جاتی ہیں
سانسوں سے یہ کون چراغ بجھاتا ہے
جینے کے آثار ابھی کچھ باقی ہیں
آئینۂ انفاس ابھی دھندلاتا ہے
ایک پرندہ کھلی فضا میں اڑنے کو
محبسِ جاں میں پَر پھیلائے بیٹھا ہے
بند اگر ہوں کان تو پھر اپنے اندر
طوفانوں کا شور سنائی دیتا ہے
جشنِ حسرتِ گریہ آج منائیں ہم
اے تنہائی وہ بھی آج اکیلا ہے
تنہا رات میں سرد ہوا کی نوحہ گری
سن کر کوئی دل کو پکڑ کر رویا ہے
آنکھوں کی جھیلوں میں عکس اترتے ہیں
تنہائی میں ہر چہرہ یاد آیا ہے
وہ نازک سی لڑکی وہ خوشبو پیکر
جس کا جسم سمندر ہے دل دریا ہے
جس کی آنکھوں میں زہراب تمنّا کا
جس کے ہونٹوں پر میخانہ کھلتا ہے
اس کے لمس کی شبنم دل پر گرتی ہے
اس کے قرب کا سورج سر پر آیا ہے
تجھے مبارک تشنہ دل کا خوں ہونا
تیری غزل میں رنگ تغزّل آیا ہے



جمیلؔ عظیم آبادی

رنگِ شفق سے مطلعِ انوار سے چلے
دن کا پتہ تو صبح کے آثار سے چلے

کیا کیا لکھا ہے وقت نے عبرت کے واسطے
شاید پتہ نوشتۂ دیوار سے چلے

ہر زاویہ کلام کا مجروح ہو گیا
کچھ ایسے تیر ترکشِ گفتار سے چلے

الزام سہل پسندی کا آ گیا
بچ کر ہزار سایۂ دیوار سے چلے

ماہ و نجوم سے بھی وہ آگے نکل گئے
جو زندگی میں برق کی رفتار سے چلے

صحرا کے خار و خس کو بھی اک تازگی ملی
جب رنگ و بو کے قافلے گلزار سے چلے

مشکل ہے شعر گوئی اب اس دور میں جمیلؔ
جب فن کی ناؤ فکر کے پتوار سے چلے

قمر نظامی



پایابیوں کا شوق بھی مہنگا پڑا ہمیں
گہرے سمندروں میں اُترنا پڑا ہمیں

ہر لمحہ اک صدی کی مسافت میں آگیا
تیری گلی سے جب بھی گزرنا پڑا ہمیں

ہجر و وصال و درد، و ملال و سرور و کیف
کتنی تمازتوں سے گزرنا پڑا ہمیں

ہم خود سرابِ وقت کے سانچوں میں ڈھل گئے
تجھ سے بھی تیرا نام چھپانا پڑا ہمیں

موسم طلب کا اور وہ بچپن کی خواہشیں
ساحل کی سیپیوں سے بہلنا پڑا ہمیں

اک حبس کے، تپش کے، تمازت کے باوجود
کچھ دیر سائبان میں رکنا پڑا ہمیں

باہر تمازتوں کے سوا اور کچھ نہ تھا
سائے کی طرح خود میں سمٹنا پڑا ہمیں

اُس کی سپردگی میں بھی تھیں غفلتیں بہت
دریا کے ساتھ رہ کے سلگنا پڑا ہمیں

کچھ حق ہے پستیوں کا بھی انساں کے روپ میں
کتنی بلندیوں سے اُترنا پڑا ہمیں

یہ شہرتِ گناہ بھی کافی نہ تھی قمر
ہر رہ گزر پہ نام بھی لکھنا پڑا ہمیں

وہ تیرا ہجر کہ آئے خیال بھی کیا کیا
مگر یہ وصل کہ گزرے ملال بھی کیا کیا

جواب اُس کی ندامت نے بے تکان دیئے
نظر نے میری اُٹھائے سوال بھی کیا کیا

لبوں پہ نام سویروں کا اب نہیں آتا
سرابِ نور میں دیکھے کمال بھی کیا کیا

نہ آیا کوئی بھی گاہک یہ اپنی محرومی
وگرنہ ہم نے سجائے تھے مال بھی کیا کیا

نہ جانے خود کو بچا کر نکل گئے کیسے
وگرنہ راہ میں پھیلے تھے جال بھی کیا کیا

دل و نظر کا بھرم بھی نہ رہ سکا باقی
کہ تیرے شہر میں آئے زوال بھی کیا کیا

کراچی

تبسم رضوی

جھانکے اُن انکھڑیوں میں تو مر جائے آدمی
گہرے سمندروں میں اُتر جائے آدمی

بادل کی طرح تو جو کبھی کھُل کے برس جائے
یہ رنگ، یہ خوشبو مرے ہر انگ میں بس جائے

یوں ٹوٹ کر کسی کو نہ چاہے کوئی کبھی
ایسا نہ ہو کہ پھر سے بکھر جائے آدمی

وہ کس سے کرے خوبیٔ قسمت کی شکایت
جو پھول کی آغوش میں خوشبو کو ترس جائے

اندر سے چاہتوں کے جو چشمے اُبل پڑیں
باہر بھی ہر طرح سے نکھر جائے آدمی

شوخی نہ معاون ہو اگر بادِ صبا کی
کیوں ہجر زدوں تک تری خوشبوئے نفس جائے

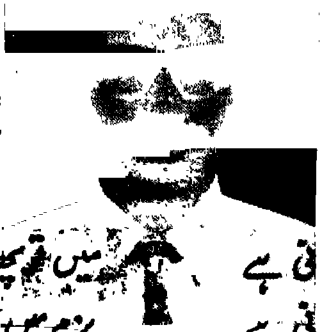
قبضہ کسی مکاں پہ کیا ہے تو مان لے
یہ کیا کہ دل میں بس کے مُکر جائے آدمی

یہ آنچ بدن کی، یہ ترے لمس کا جادو
ایسے میں نہ کیوں حد سے سوا دستِ ہوس جائے

اِک سمت تم ہو، ایک طرف ہے غمِ جہاں
ایسے میں تم بتاؤ کدھر جائے آدمی

شاید پلٹ آئے کوئی بھٹکا ہوا رہرو
صحرا میں اگر دور تک آوازِ جرس جائے

اس جانِ آرزو سے کرے ترکِ التفات
یوں بھی نہ اپنی حد سے گزر جائے آدمی



رئیس باغی

وہ جس نے شہرِ ستمگر کی خاک چھانی ہے
وہی سمجھتا ہے کیا چیز زندگانی ہے

ہمارے عہد کی اک یہ بھی کامرانی ہے
غمِ جہاں نے محبت سے ہار مانی ہے

وہ بات کرنے پہ آئے تو بولتا ہی رہے
عجیب اس کی طبیعت میں بھی روانی ہے

گزر نہیں مری دنیا میں اہلِ نفرت کا
کہ میرے دل پہ محبت کی حکمرانی ہے

رہِ حیات کے پتھر زمین پر ہی رہیں
یہاں کھنچی ہوئی دیوار سخت جانی ہے

یہ اپنے ذہن کی پستی نہیں تو کیا ہے کہ ہم
ہر اک بلا کو سمجھتے ہیں آسمانی ہے

حصار میں ہے غموں کے دلِ حزیں لیکن
اس آئینے ہی میں تصویرِ شادمانی ہے

زمانہ سنتا ہے کچھ اس طرح زباں سے مری
یہ آپ بیتی بھی جیسے کوئی کہانی ہے

جو پی رہا ہوں میں جامِ حیات سے باغیؔ
شراب کب ہے یہ غم کے پھلوں کا پانی ہے

میں تو پتھر میں ہوں، وہاں میرا نہ سایا جائے
بزم میں جس کی ہر اک اپنا پرایا جائے

کسی حیلے سے اسے پاس بلایا جائے
اور پھر دل کا ہر اک زخم دکھایا جائے

دشمنی راس نہ آئی تو زمانے کی طرف
دوستی کے لئے اب ہاتھ بڑھایا جائے

لوگ بے درد ہیں دل توڑ دیا کرتے ہیں
ہم سے تو ایک گھروندا بھی نہ ڈھایا جائے

صبح ہوتے ہی خیالات کی تزئیں کے لئے
روز کمرے کو نئے سر سے سجایا جائے

جسم کی جنتِ رنگیں سے کنارہ کر کے
روح کو نارِ جہنم نہ بنایا جائے

آج گر جائے گی بارش میں یہ چھت بھی لوگو
گھر کے خوابیدہ مکینوں کو بچایا جائے

ذہن میں پھول مہکتے ہیں جو کچھ یادوں کے
ان سے خوابوں کے دریچوں کو سجایا جائے

ہم سفر ساتھ وہاں تک تو چلیں اے باغیؔ
میرے ہمراہ جہاں تک مرا سایا جائے

شاہد کبیر

جائے گا بھی، تو کہاں جائے گا پاؤں والا
گھر سے نکلے کہ اٹھا ہاتھ دعاؤں والا

خوف سورج کی تمازت کا نہ سائے کا ملال
کانچ کا گھر ہے مرا، دھوپ نہ چھاؤں والا

محفلوں میں بھی وہ احساس ہے تنہائی کا
شہر میں جیسے اکیلا کوئی گاؤں والا

منتشر ہو گیا میں دشت میں ذرّوں کی طرح
آج موسم تھا بہت تیز ہواؤں والا

پھر اسی دھج سے سرِ راہ کھڑے ہیں شاہدؔ
وہی انداز، فقیرانہ، صداؤں والا

محمد علوی

دکھ کا احساس نہ مارا جائے
آج جی کھول کے ہارا جائے

ان مکانوں میں کوئی بھوت بھی ہے
رات کے وقت پکارا جائے

سوچنے بیٹھیں تو اس دنیا میں
ایک لمحہ نہ گزارا جائے

ڈھونڈتا ہوں میں زمیں اچھی سی
یہ بدن جس میں اتارا جائے

ساتھ چلتا ہے جو سایہ اپنا
ایک پتھّر اسے مارا جائے

سلیم کوثر



خود آشنائی کا لمحہ ذرا گزر جائے
پھر آئینہ مری پہچان سے مکر جائے

کبھی تو کشمکشِ وقت رک بھی جا کہ یہ شخص
ترے حصار سے نکلے تو اپنے گھر جائے

مذاقِ خانہ بدوشی سنبھال کر رکھنا
کہیں یہ حسرتِ دیوار و در نہ مر جائے

بس اک ستارے کو چھونے کی حسرتیں ہیں مجھے
پھر آسمان مرے صحن میں بکھر جائے

کئی دنوں سے وہ کشتی ادھر نہیں آئی
مری صدا ذرا دریا کے پار اتر جائے

گزشتہ نسل کی کوتاہیوں کا خمیازہ
جو میرے سر بھی نہ آئے تو کس کے سر جائے

سلیم جس کو مری جستجو کی خواہش تھی
اب آئے اور مجھے میرے سپرد کر جائے

پیڑوں کو درکار تو ہے ہریالی مٹی
لیکن کہاں سے لائے بوڑھا مالی مٹی
بنیادوں میں چھپا ہوا بیٹھا ہے پانی
دیواروں سے جھانکتی ہے مٹیالی مٹی
شام ڈھلی اور کہیں کنارے جا اترے گی
دن دریا میں موج اڑاتی کالی مٹی
پہلے بھی تو تجھ کو پا کر کھو ہی دیا
اب کے بھی کب ہم نے دیکھی بھالی مٹی
میرے لہو میں روشنی بن کر پھیل گئی
سدا سہاگن دھرتی کرماں والی مٹی
دھیرے دھیرے سارا سونا بکھر گیا
اب مٹھی میں رہ گئی ہے بس خالی مٹی
پہلے یار سلیم پناہیں دیتی ہے
ماں بن کر پھر کرتی ہے رکھوالی مٹی

جمال احسانی

میں تنگ دست تھا ایسا، گزارا کیا کرتا
کرم وہ کر کے بھی مجھ پر دوبارہ کیا کرتا

وہ روز دن ڈھلے آتا نہ گر دریچے میں
تو چاند کیا کیا کرتا ستارا کیا کرتا

کوئی بھی شخص اکیلا نہیں تھا ساحل پر
کسی کو ڈوبنے والا اشارا کیا کرتا

گنوانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا پاس مرے
میں اس گلی سے گزر کر دوبارا کیا کرتا

مری زمیں نے گوارا نہیں کیا مرے ساتھ
میں اپنی خاک سے لیکن کنارا کیا کرتا

نیا محاذ کوئی اور کھول دیتے ہم
وہ فتح یاب بھی ہو کر ہمارا کیا کرتا

میانِ صحن اک دیوار اٹھانے کے بدلے
میں ساری عمر تکلّف گوارا کیا کرتا

تنہا بھی منہ اٹھا کے نکلنا محال ہے
ہمراہ بھی ہجوم کے چلنا محال ہے

حرفِ دعا کا صفحۂ دست بلند پر
وہ بوجھ ہے کہ ہاتھ بدلنا محال ہے

دل نے جلائی ہیں جو سرِ طاقِ انتظار
ان موم بتیوں کا پگھلنا محال ہے

گم کیا ہوا ہے کاسۂ درویش اک یہاں
نظریں اٹھا کے شہر کا چلنا محال ہے

میرے بھی دستخط ہیں سرِ محضرِ شکست
میرے لئے بھی بچ کے نکلنا محال ہے

جن میں جمالؔ رات کو سوتے نہیں ہیں لوگ
ان آنگنوں سے چاند کا ڈھلنا محال ہے

جمال احسانی

ملنا نہیں تو یاد اسے کرنا بھی چھوڑ دے
دیوار چھوڑ دی ہے تو سایہ بھی چھوڑ دے

ایک آدمی سے ترکِ مراسم کے بعد بھی
کیا اس گلی سے کوئی گزرنا بھی چھوڑ دے

مضبوط کشتیوں کو پرکھنے کے واسطے
دریا میں ایک ناؤ شکستہ بھی چھوڑ دے

رستے کے پھیر کے سوا کیا ہے یہ کائنات
کیوں آدمی یہاں پہ بھٹکنا بھی چھوڑ دے

آنا اب اس نے چھوڑ دیا ہے اگر تو کیا
دل بے سبب چراغ جلانا بھی چھوڑ دے

پھیلا بھی دے یہ دستِ تہی بخت اس کی سمت
ایسا نہ ہو خدا یہ تقاضا بھی چھوڑ دے

اس کے سوا امید کوئی توڑتا نہیں
اس کے سوا کسی پہ بھروسہ بھی چھوڑ دے

اللہ کی زمین بڑی ہے بہت جمالؔ
عزت نہیں جہاں وہاں رہنا بھی چھوڑ دے



جمال وعدۂ یک نانِ خشک پر رہنا
ہمارے واسطے آساں ہے عمر بھر رہنا

کئی دنوں سے عجب حال ہو گیا اپنا
نہ اس گلی ہی میں جانا نہ اپنے گھر رہنا

کوئی بھی ہو اسے لاتا ہے کم وہ خاطر میں
ہمیں بھی اپنی ہوا میں زیادہ تر رہنا

سرہانا جان کے پتھر تلک چرالیں گے
سفر میں جاگتے رہنا جدھر جدھر رہنا

جمالؔ معرکۂ رزق ہو کہ عشق کی جنگ
مجھ ایک شخص کو دونوں محاذ پہ رہنا

تاجدار عادل

ہجر کی ساعتیں ، وصال کا وقت
خواب کا دور تھا خیال کا وقت
اُس کو چھوڑا تو دل دھڑکتا تھا
پھر گزر ہی گیا ملال کا وقت
زخمِ تازہ کی آرزو کرنا
جب نظر آئے اندمال کا وقت
دیکھتے جاؤ اس سے کچھ نہ کہو
ہے خموشی کا اور زوال کا وقت
وہ اچانک پلٹ کے آیا تھا
وقت آیا بڑے کمال کا وقت
میری آنکھوں میں ہجر کا لمحہ
تیری آنکھوں میں جو وصال کا وقت
کتنی صدیوں پہ پھیلتا جائے
ایک عکسِ رُخِ جمال کا وقت
ایک یادوں کی رات لاتی ہے
کتنے خوابوں سے بول چال کا وقت
جب وہ رخصت ہوا تو بات نہ کی
پھر نہ آیا وہ عرضِ حال کا وقت
پھر پرندے نہ لوٹ کر آئے
پھر نہ گزرا وہ ایک سال کا وقت
ہیں دعائیں بہت کہ لوٹ آئے
کرمِ ربِّ ذوالجلال کا وقت

زخم کب کا تھا درد اُٹھا ہے اب
اُس کے جانے کا دُکھ ہوا ہے اب
میری آنکھوں میں خواب ہیں جس کے
اس کی آنکھوں میں رت جگا ہے اب
سنتے آئے ہیں، قافلہ دل کا
رہ گزر میں کہیں رُکا ہے اب
وہ جو پتھر کا تھا مسافر، وہ
شہرِ افسوں سے آ گیا ہے اب
جو مری خواہشوں کی منزل تھی
اس کے آنے کا راستا ہے اب
جس کو ڈھونڈا تھا میں نے ہر جانب
میرے دل میں کہیں چھپا ہے اب
کتنے خوابوں میں رنگ اس کے ہیں
کتنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اب
کتنے موسم ہیں صرف اس کے لئے
کتنے چہروں پہ وہ سجا ہے اب
کتنی باتوں میں اس کی باتیں ہیں
کتنے لہجوں میں بولتا ہے اب
جو ترے شہر لے کے آتا تھا
رُخ وہ دریا بدل رہا ہے اب
آؤ دستک ہی دے کے دیکھیں تو
وہی دروازہ پھر کھلا ہے اب
اس حوالے سے زندگی میری
گھنے جنگل کا سلسلہ ہے اب
ایک دیوانہ اپنی وحشت میں
بات کہنے کی کہہ گیا ہے اب

غلام حسین ساجد

تمام رات جاگنے کے بعد چاند سو گئے
ستارہ ہائے وصل بھی کہیں غروب ہو گئے

میں اپنے گھر کے کھوج میں چراغ بھیجتا رہا
مگر وہ تیرے شہر کی کسی گلی میں کھو گئے

ترے دکھوں کے ابر بھی ترے کرم کی مثل تھے
کسی گلاب پر جھکے نہ کوئی پات دھو گئے

طلوعِ مہر بھی نہ تھا کہ زرد اوس کھِل اُٹھی
کسی کی یاد بھی نہ تھی کہ ہم اُداس ہو گئے

یہ مانتا ہوں مَیں نے پیار میں شکست کھائی ہے
مگر وہ رزمِ عشق سے کسی کے ساتھ تو گئے

خبر نہیں وہ آئیں بھی تو کب پلٹ کے آسکیں
ابھی جو ابرِ شہر کی گلی گلی میں رو گئے

گماں نہیں مَیں کھینچ لوں گا کیفِ خواب سے اُنہیں
اگر وہ میری گفتگو کے درمیاں سو گئے

پھر اک رات انوکھے پن کی، پھر اک شام سفر میں
جانے کتنے روز رہوں گا اس بے نام سفر میں

وہ بھی اپنے کھوج میں گھر کا رستہ بھول گیا ہے
شاید ممکن تھا اس قصّے کا انجام سفر میں

سورج نِکلا تو یوں میری جانب پھول جھکے ہیں
جیسے من میں بہتی یادوں کا ہنگام سفر میں

کیسی کیسی ان ہونی سے آنکھیں پھوڑ چکے ہیں
اب کی بار گھروں سے نکلیں گے اک عام سفر میں

کون بچا ان دھول میں ڈوبے رستوں کے اُس جانب
کس کے نام دیے جاتے ہیں اب پیغام سفر میں

دیکھو دُور اُفق پر بہتی ندی میں آگ لگی ہے
شاید کام کوئی بن پائے اپنا کام سفر میں

ساجد مَیں سمجھا تھا اب ہر الجھن ختم ہوئی ہے
اور لگائے بیٹھا تھا وہ پھر اک دام سفر میں



محمد علی سید

خطوں میں لکھی گئی تھیں عبارتیں کیسی
دلوں سے محو ہوئیں پھر وہ چاہتیں کیسی

ترے وجود سے کمرہ مہکنے لگتا تھا
بدن سے چھوٹتیں خوشبو تمازتیں کیسی

شبِ وداع ہے، تنہائیوں کا جنگل ہے
رُلا رہی ہیں مجھے ہجر ساعتیں کیسی

خبر نہ تھی جو تجھے جذبِ عشق کی تو پھر
وہ ڈائری میں لکھی تھیں حکایتیں کیسی

میں تیرے شہر میں کس کس کی بات رد کرتا
ترے خلاف تھیں محکم روایتیں کیسی

ہوس کی راہ سے تجھ تک پہنچنے والوں کو
ملی ہوئی تھیں سفر کی رعایتیں کیسی

ہر ایک چہرہ پہ تیرا گماں گزرتا ہے
بکھر کے رہ گئیں تیری شباہتیں کیسی

تمھاری سوچ کی آہٹ سنائی دیتی تھی
کہ ان دنوں میں تھیں جادو سماعتیں کیسی

کہیں سے آئی ہے پھر زرد موسموں کی خبر
افق پہ پھیل گئی ہیں علامتیں کیسی

بلا رہی ہے مجھے سبز جنگلوں کی ہوا
بچھی ہیں پاؤں کے نیچے مسافتیں کیسی

ہے سارے شہر پہ بیمار فیصلوں کا غبار
کہ دوستوں نے نکالیں عداوتیں کیسی

گزرے لمحوں میں جاگتے ہیں خواب
تیرے غم کو سنوارتے ہیں خواب

جب مرا سانس گھٹنے لگتا ہے
حرفِ تازہ اُتارتے ہیں خواب

وہ مرے بازوؤں میں رہتا ہے
مجھ کو کتنا سنبھالتے ہیں خواب

خیمۂ ذات، ریگ، تیز ہوا
صورتِ شمع کانپتے ہیں خواب

گر کبھی ٹوٹ پھوٹ جاتا ہوں
میرا غم آکے بانٹتے ہیں خواب

میں جسے چھوڑ کر چلا آیا
رات بھر اس کے جاگتے ہیں خواب

رات، جنگل ہے اور میں تنہا
دید کے سارے راستے ہیں خواب

کچھ تو مصروف وہ بھی رہتا ہے
کچھ بہانے تراشتے ہیں خواب

ہیں یہ رمز آشنا مرے دل کے
میرے ہر دکھ کو جانتے ہیں خواب

وہ ہے ناآشنائے منزلِ عشق
اس کی آنکھوں میں ناچتے ہیں خواب

وہ تو کوہِ ندا کی سمت گیا
جس کا چہرہ تراشتے ہیں خواب

بدر جمیل

الجھا ہوا سا تھا کبھی سہما ہوا سا تھا
اک عکس آئینے میں بڑا بے تکا سا تھا

کیوں آج مجھ سے راہ میں آنکھیں چرا گیا
وہ شخص جس سے درد کا اک سلسلہ سا تھا

لوگوں کا اک ہجوم تھا دریا کے آس پاس
اور سطحِ آب پر فقط اک بلبلہ سا تھا

اب دل میں اور دماغ میں وہ سلسلے کہاں
وہ دن گئے کہ ان میں کوئی رابطہ سا تھا

حیرت سے یوں نہ دیکھ مرے انتشار کو
میرا وجود بھی کبھی اک آئینہ سا تھا

اپنائیت کا زہر ہمیں ڈس گیا جمیل
[illegible] وہ کوئی دوسرا سا تھا

س یونس

بندہ جبر کو دعویٰ، مرد خدا کیسے ہو
چیخ جو دل میں دبی ہے وہ دعا کیسے ہو
ہر قدم پہ ہوں جہاں جو تنے سہارے اتنے
اپنے پیروں پہ کوئی شخص کھڑا کیسے ہو
یونہی ہر روح اگر جسم سے انکار کرے
پھر جو مطلوب ہے وہ حشر بپا کیسے ہو
کوئی میداں نہ بچا کارگذاری کے لئے
صرف باتوں سے اب انسان بڑا کیسے ہو
پیرویٔ روشِ عام کا قانون ہے سخت
فرض سے اپنے کوئی عہدہ برا کیسے ہو
مہرباں ہو کے پشیماں وہ ہوا ہے کیا کیا
یعنی اب سوچ رہا ہے کہ خفا کیسے ہو
روئیں روئیں کو مرے جسم کے بیدار کیا
شکریہ آپ کا لفظوں میں ادا کیسے ہو

دل شیر ساجد

بیتی رت کا میں ہوں ساتھی لوگ مجھے پہچانیں کیا
جس کا چہرہ بنجر بن ہو اس کو بھلا وہ جانیں کیا
تپتے تھلوں، روہی وادی کا میں اجڑا شہزادہ ہوں
جس کے پیلو، ڈیلے میٹھے عظمت کی ہیں شانیں کیا
بھیرویں کافی کو ورثے میں ہم نے ہی سُر تال دئے
چولستان کی مدھم لے پر گونج رہی ہیں تانیں کیا
مجھ کو پیار ہے ان کانٹوں سے میں دھرتی کا باسی ہوں
کیکر جال کی چھاؤں ٹھنڈی لوگ اسے پرمانیں کیا
یاد رہیں گے منظر سب یہ ریوڑ کالی بھیڑوں کے
جھوٹ کے پاؤں کٹ جاتے ہیں جھوٹ کی چادر تانیں کیا
ریت کے ان ابھرے تودوں کا میں ساجد پروردہ ہوں
چٹیل میدانوں، صحراؤں میں ہم خاک یہ چھانیں کیا

ٹیڑھی ٹیڑھی راہ مجھے کس موڑ پہ لے کر جائے گی
پگ پگ سوچتا جاتا ہوں آواز کوئی تو آئے گی
موتی بن بن جھیل کنارے کنکر غم کے چمکے ہیں
وہ بھی سمے آئے گا جب تو کنکر چننی آئے گی
کرنوں میں وہ بھولی بھالی پیاری مورت بھی دیکھوں گا
چاند کی نیا جب تاروں کی اوٹ سے بہتی جائے گی
جن پھولوں میں باس نہیں ہے پریم کے پھول وہ کاغذ ہیں
کاغذ کے بیکار سے پرزوں کی رنگت اڑ جائے گی
دل کا گھروندا ٹوٹا ساجد اشکوں کی برساتوں میں
اک دن اپنی جیون کٹیا برکھا میں بہہ جائے گی

شاہدہ حسن

ہوا پہ چل رہا ہے چاند راہ وار کی طرح
قدم اٹھا رہی ہے رات اک سوار کی طرح

تڑپ رہا ہے بادلوں میں میرے جسم کا شجر
سیاہ ابر میں گھرے ہوئے چنار کی طرح

انہی اداسیوں کی کائنات میں کبھی تو میں
خزاں کو جیت لوں گی موسمِ بہار کی طرح

ترے خیال کے سفر میں تیرے ساتھ میں بھی ہوں
کہیں کہیں کسی غبارِ رہ گذار کی طرح

عبور کر سکی نہ فاصلوں کی گردشوں کو میں
بلند ہو گئی زمین کوہسار کی طرح

ترے دیے کی روشنی کو ڈھونڈتا ہے شام سے
مرا مکاں کسی لٹے ہوئے دیار کی طرح

تنہائی سے دامن بھر لائی
اک خواب کی آہٹ گھر لائی

آنکھوں کے شیش کٹوروں کو
ٹھنڈے جل سے دھو کر لائی

بارش کی ہوا بھیگی ہوئی لٹ
جلتے ہوئے ماتھے پر لائی

جب شام ہوئی تو تنہائی
تاروں سے جلا بستر لائی

دن دھوپ دکھاتے تھے ہر پل
چھاؤں میں راہ گزر لائی

خاموش تھا میرے اندر تو
میں کیوں ترا دکھ باہر لائی؟

شاہدہ حسن

کوئی سرد ہوا لبِ بام چلی
پھر خواہشِ بے انجام چلی

کیا خاک سکوں سے ناؤ چلے
جب موج ہی بے آرام چلی

وہ بات جو ساری عمر کی تھی
بس ساتھ مرے دو گام چلی

اک حرفِ غلط کو چھوتے ہی
میں مثلِ خیالِ خام چلی

اب رات سے مل کر پلٹوں کیا
جب صبح سے میں تا شام چلی

خود ڈھہ گئی وہ دیوار مگر
گرتے ہوئے گھر کو تھام چلی



خاک ہوں یا کسی سحاب میں ہوں
تشنگی کون سے سراب میں ہوں

اپنی کروٹ سے خود ہی زخمی ہوں
خاک ہوں اور رگِ گلاب میں ہوں

کٹ گئی رات جب تو یاد آیا
نہ نظر آنے والے خواب میں ہوں

اشک ہوں اپنی چشمِ سادہ میں
صورتِ آب، عکسِ آب میں ہوں

کوئی ڈھونڈے تو اس کے ہاتھ آؤں
ورنہ اک [illegible]

شاہدہ حسن

جب گھر ہی جدا جدا رہے گا
پھر ہاتھ میں ہاتھ کیا رہے گا

وہ میرے خیال کا شجر ہے
آنکھوں میں ہرا بھرا رہے گا

مہمان وہ خال و خد رہیں گے
جب تک مرا شب کدہ رہے گا

رشتہ مرے ساحلِ نفس سے
اس موجِ سراب کا رہے گا

وہ حرف جو اس نے لکھ دیا ہے
تا عمر یوں ہی لکھا رہے گا

اے معجزۂ ہوا سنا دے
وہ مجھ میں سدا کھِلا رہے گا

سوادِ شام سے تا صبح بے کنار گئی
ترے لئے تو میں ہر بار ہار ہار گئی

کہاں کے خواب کہ آنکھوں سے تیرے لمس کے بعد
ہزار رات گئی اور بے شمار گئی

کمال کم نگہی، ہے یہ اعتبار ترا
وہی نگاہ بہت ہے جو دل کے پار گئی

میں مثلِ موسمِ غم تیرے آئینے میں رہی
کہ خود بکھر گئی لیکن تجھے نکھار گئی

وہ سوچتا ہے کہ اب اور قربتیں کیا تھیں
میں ساتھ رہ کے بھی اکثر اسے پکار گئی

خبر نہیں کہ یہ پوچھوں تو کس سے پوچھوں میں
وہاں تلک میں گئی ہوں کہ رہ گزار گئی

شاہدہ حسن

جب سے وہ مہمان ہوا
گھر میری پہچان ہوا
تارہ، اوجِ اشک تری
قسمت پر حیران ہوا
نیند گئی کیا آنکھوں سے
چہرہ تک ویران ہوا
تکتے تکتے خود مجھ کو
آئینہ بے جان ہوا
وہی ہوا جو ہونا تھا
دل ناحق ہلکان ہوا
میں کیا کہتی جب وہ غم
خود اپنا اعلان ہوا
تنہا تھی میں رستوں پر
رستہ جب انجان ہوا

چراغِ شام ہی تنہا نہیں ہے
ہوا! میں نے بھی گھر دیکھا نہیں ہے
وہ بادل ہے مگر اس دشتِ جاں پر
ابھی دل کھول کر برسا نہیں ہے
بکھرتی جا رہی ہوں اور خوش ہوں
سمٹنے میں کوئی سچا نہیں ہے
خوشا اے روئے شاخ سبز تجھ پر
سرابِ آئینہ کھلتا نہیں ہے
زباں گم تھی اثر کے ذائقوں میں
ترا مجرم لبِ گویا نہیں ہے
تجھے پایا ہے جب سے شام آلود
مری آنکھوں میں دن اترا نہیں ہے
میں کیوں دیکھوں ہجوم مہر و مہ کو
مری تنہائیوں میں کیا نہیں ہے
نہیں جاتے ہیں دکھ اب گھر میں آ کر
کہ یہ آنا ترا آنا نہیں ہے
بھٹک جائیں گی راتیں جن کے ہاتھوں
ابھی اس خواب کا چرچا نہیں ہے

شاہدہ حسن

لمس آہٹ کے ہواؤں کے نشاں کچھ بھی نہیں
خواب ہی خواب ہے یہ شہر یہاں کچھ بھی نہیں

کوئی گزری ہوئی شاموں میں کبھی چمکا تھا
اس گھنی شب کے اندھیرے سے عیاں کچھ بھی نہیں

چند ساعت کے ستارے ہیں سرِ بامِ طلوع
دن اتر جائیں تو پھر گھر کا سماں کچھ بھی نہیں

اک خموشی ہے لئے حیرتِ صد نقش و نگار
ورنہ بدلے ہوئے موسم کی زباں کچھ بھی نہیں

آسماں، آج تری چھاؤں میں آ بیٹھی میں
اب مرے سر پہ ترا کوہ گراں کچھ بھی نہیں

موسم ہی مرے ، نہ اُن کی ہوں میں
چلنے سے ہوا کے کیا کِھلوں میں

ہاں اپنے ہی کشت و ابر میں وہ
لَو دے جو کہیں تو سانس لوں میں

کیوں اپنا حسابِ شب دکھاؤں
جب تیرے ہی رات دن گنوں میں

تو دیکھ یہ دکھ کہ تجھ سے مل کر
سائے کی طرح گری رہوں میں

پھر شام سی ہو چلی ہے شاید
پھر تیرے خیال سے ملوں میں

شاہدہ حسن

کیا ہوا صبح کے تارے نے جو در کھول دیا
اس کی آہٹ نے مرا بابِ خبر کھول دیا

ترے قدموں کے نشاں ہیں مری بینائی تک
میں نے اس رہ کو ترے پیشِ نظر کھول دیا

صبح سے شام ہواؤں نے سمیٹا مجھ کو
دستکِ شب نے مرا زخم مگر کھول دیا

میں نے جب بھی کبھی جانے کی اجازت چاہی
اس نے بڑھ کر مرا اسبابِ سفر کھول دیا

تتلیاں تھیں مری آنکھوں میں کہ وہ نیندیں تھیں
خواب کے ٹوٹتے ہی جیسے کہ پر کھول دیا

ایک چھوٹی سی کہانی ہے تری یاد مجھے
کر رہا ہے غمِ تنہائی بہت شاد مجھے

وہی وحشت تھی بہاروں کی مگر اب کی بار
خون تک چوم گئی گردشِ نوباد مجھے

میرے سرسبز خیالوں میں ترا آ جانا
دے گیا عمر کا ایک لمحۂ برباد مجھے

میری قامت میں اجالے ہیں پرانے تیرے
تیری خوشبو سے جلاتا ہے یہ شمشاد مجھے

میں نہ تھی سنگِ در و بام کی تاریکی میں
چھاؤں دیتا تھا کوئی قریۂ آباد مجھے

شاہدہ حسن

ستارہ چشم ہے اور مہرباں ہے
وہ مری خاک پر اک آسماں ہے

ہوا سے رشتۂ جاں کیا نبھاؤں
کسی کی یاد ہی جب بدگماں ہے

حدِ آئندگاں پر ایک لمحہ
مری مجبوریوں کا رازداں ہے

جسے جانا تھا وہ رکتا ہی کیوں کر
مگر جب تک کسی کا میہماں ہے

ترا ملنا نہ ملنا ایک ہی سے
یہ تنہائی تو اب جوئے رواں ہے

رہی رگوں میں دیر تک
کسی امید کی چمک

سماں ہے تیرے روپ کا
زمیں ہے تا سرِ فلک

تری کرن نے چھین لی
مرے چراغ کی کھنک

نہیں کہیں ترے سوا
مرے وجود کی جھلک

مرے لہو سے آ ملی
ہے تیرے خون کی لپک

ترے بغیر زندگی
تھی صرف زندگی کا شک

سیپ



تبصرے

کوندے

افسانہ نگار: تقی حسین خسرو
ناشر: ادارہ نوائے سروش، شاہ فیصل کالونی، کراچی ۲۵
صفحات: ۱۹۲، قیمت: ۱۵ روپے

اردو میں مختصر افسانوں کی روایت دوسری بڑی زبانوں کے افسانوی ادب کی طرح بہت پرانی نہیں۔ لیکن ہمارے افسانے اپنے ماضی کی گراں قدر داستانوں کی روایت کے تسلسل کا حصہ ضرور ہیں اور طویل داستانوں نے اپنا یہ ورثہ مکمل ثقافتی دیانت اور عہد بہ عہد بدلتے ہوئے سماجی شعور کے ساتھ اس طرح بتدریج منتقل کیا ہے کہ نصف صدی کی یہ صنف ادب صدیوں سے ارتقاپذیر زبانوں کے افسانوی ادب سے آنکھیں ملا کر کلام کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

لکھنے کو تو بے شمار افسانے لکھے جا رہے ہیں اور ادب کے پنڈتوں کی طرح اسے بدشگونی بھی نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اسی تجرباتی عمل سے گزر کر ہی معاشرے کو کسی منزل پر اپنے حقیقی ترجمان مل جاتے ہیں لیکن افسانوں کی اس افزائش اور ارزانی میں ہمارے لیے اچھی کہانیوں تک پہنچنا اسی طرح دشوار ہو جاتا ہے جس طرح چہروں کے ہجوم میں اپنی شناخت کے انسان کو تلاش کرنا۔ بہر حال اسی آشوب تخلیق کے دور میں تقی حسین خسرو بہت خاموشی لیکن نہایت اعتماد کے ساتھ اپنے افسانوں کا مجموعہ لے کر آگئے ہیں۔ اور اس سے زیادہ طمانیت اور مسرت کی بات یہ ہے کہ یہ اضافہ ہماری ان توقعات کے عین مطابق ہے جو ہم نے ان سے وابستہ کر رکھی تھیں۔

"کوندے" میں ۱۸ کہانیاں ہیں اور ہر کہانی اپنے موضوع کے ساتھ انصاف برتنے میں کامیاب ہے۔ خسرو صاحب نے کتاب کے حرف آغاز میں بتایا ہے کہ ان کی پہلی کہانی "سفید رنگ" ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی، یقیناً وہ اس سے پہلے سے لکھ رہے ہوں گے اور اس طرح وہ اپنے معاصرین میں ایک کہنہ مشق افسانہ نگار کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔

خسرو صاحب کی کہانیاں پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے گرد و پیش پر گہری مشاہداتی نظر رکھی ہے بلکہ ترقی یافتہ زبانوں کے افسانوی ادب کا مطالعہ بھی کیا ہے ـــــ اور مشاہدہ و مطالعہ کی اس قوت کو اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بنا لیا ہے۔

زندگی کی طرح پھیلے ہوئے ان کے افسانوں کے موضوعات کا محور بھی وسیع تر انسانی زندگی اور اس کے پیچیدہ مسائل ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کہیں بھی رسمی ترقی پسندوں کی طرح طبقاتی کشمکش یا معاشی ناہمواریوں کا نعرہ نہیں لگایا لیکن ان کا کوئی افسانہ بھی زندگی کے تلخ تجربات کے اظہار، ان کے فنکارانہ تجزیے اور جدلیاتی نتائج سے خالی نہیں، اور یہی سبب ہے کہ انھوں نے اپنے اظہار کے لئے نامانوس زبان اور ناقابلِ فہم لہجے سے شعوری طور پر گریز کیا۔ یہی ان کے موضوعات کا تقاضا تھا اور یہی ان کے قارئین کا مطالبہ ـــ وہ اپنے عہد میں لکھے جانے والے ان تجرباتی افسانوں کے حشر کا عرفان رکھتے ہیں جو علامت اور تجرید کے نام پر ابلاغ کی ناکامی کا اشتہار بنے ہوئے ہیں۔

خسرو صاحب ابھی جواں سال ہیں۔ ان کو ابھی بہت کچھ لکھنا ہے۔ وہ موضوع پر گرفت حاصل کر چکے ہیں اور اسلوب پر قدرت حاصل کرنے کی کامیاب جد و جہد میں مصروف ہیں، اسلوب ہی فنکار کی شناخت ہے اور ہمیں امید رکھنا چاہئیے کہ وہ بہت جلد اپنے فنی تشخص کے حصول میں بھی کامیاب ہوں گے۔

سرشار صدیقی

سطحِ آب

شاعر: سعید احمد اختر
ناشر: مکتبہ احباب، پشاور
صفحات: ۱۲۰، قیمت: سولہ روپے

"سطحِ آب" سعید احمد اختر کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جس میں ایک کم ایک سو غزلیں اور بہت سارے متفرق شعر شامل ہیں۔ پہلا مجموعہ "دیارِ شب" تھا، اور فلیپ پر دی ہوئی فارغ بخاری کی تحریری اطلاع کے مطابق سطحِ آب کی اشاعت سے صرف دو سال پہلے شائع ہوا تھا۔ اس انکشاف کا تذکرہ یہاں اس لئے غیر مناسب نہیں ہے کہ شاعر کی تخلیقی رفتار کے بارے میں جو شعر گوئی کا ایک بنیادی عنصر ہے، کوئی معقول رائے قائم کی جا سکے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس مذکورہ مختصر مدت میں اگر مقدار کے مطابق اتنی غزلیں لکھنے کی شعوری کوشش بھی کی جائے تو معیار کی سطح کو برقرار رکھنا دشوار ہو جائے گا۔ اور جب میں یہی بات "سطحِ آب" کے سیاق و سباق میں کہوں گا تو مجھے اس میں یہ بھی اضافہ کرنا ہو گا کہ "سطحِ آب" کی غزلوں کا معیار بہرحال ایسا نہیں ہے کہ ع "چل مرے خامے بسم اللہ" کہہ کر کشتوں کے پشتوں کی طرح غزلوں کا انبار لگا دیا جائے۔ زود گوئی اور بسیار نویسی ممکن ہے صحافتی وصف ہو لیکن تخلیقی شاعری میں اس ہنر کو عیب سمجھا جاتا ہے۔ سعید احمد اختر ایک سنجیدہ شاعر ہیں۔ ان کے لہجے میں ان کی سبک رفتار فکر کی کھنک ہے۔ میں ان پر زود گوئی کا الزام عائد نہیں کر سکتا۔ چنانچہ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انھوں نے ۴۳ سال تک (فارغ بخاری کی دوسری اطلاع کے حوالے سے) بہت جم کر خاموشی کے ساتھ مشقِ سخن جاری رکھی اور اپنے سرمایۂ کلام کا بہترین انتخاب "دیارِ شب" کے نام سے شائع کیا۔ ان کے اس رویّے سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ "کاتا اور لے دوڑی" کے قائل نہیں اور نہ دوسرے بر خود غلط معاصرین کی طرح قبل از وقت اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار ہیں۔ اپنے کلام کا محتاط انتخاب ان کی خوش سلیقگی کا ثبوت ہے اور یہ ساری باتیں ان کے پہلے مجموعے میں موجود ہیں۔

اس دوسرے مجموعے میں ان کی تازہ غزلوں کے علاوہ بیشتر وہ کلام بھی شامل ہے جو "دیارِ شب" میں شامل نہ کیا جا سکا تو یہی سبب ہے کہ سطحِ آب میں موجوں کی طرح فکری مد و جزر محسوس ہوتا ہے۔ بعض غزلیں اپنی مجموعی فضا کے اعتبار سے تازہ واردات میں شمار ہوتی ہیں جب کہ بعض، پچھلے تجربوں کی بازگشت ہیں۔

غزل کی تیکنیکی محدودات میں نئی بات کہنا یا پرانی بات کو نئے انداز اور سلیقے سے بیان کرنا بجائے خود ایک بڑائی ہے اور پھر جب اس اظہار میں طرزِ احساس کی انفرادیت شامل ہو تو اچھی شاعری کا وجود لازمی قرار پاتا ہے۔

بیٹھا ہے کب سے سانپ چھپا گھونسلے کے پاس　　لوٹے خدا کرے نہ پرندہ اڑان سے

چکور خوش ہے کہ بچوں کو آگیا اڑنا　　اداس بھی ہے کہ رت آگئی بچھڑنے کی

جو آیا پیار سیکھ کے ہم سے چلا گیا　　صحرا کی جائیداد، جزیروں میں بٹ گئی

یہ اور ایسے متعدد شعر اس مجموعے کی بیشتر غزلوں میں تجربے اور مشاہدے کے خوبصورت زاویوں سے روشناس کراتے ہیں۔ جن سے شاعر کی وسعت فکر کی گواہی ملتی ہے۔

سعید احمد اختر ذات کے حوالے سے کائنات کے اسرار سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش میں ہیں۔ یہ بہر حال ایک صحت مند اور فکری رویہ ہے۔ ان کی شاعری میں جن علامتوں اور استعاروں کو استعمال کیا گیا ہے وہ جدید ہو کر بھی تجریدی نہیں کہے جا سکتے اور اسی لئے غالباً وزیر آغا نے کہا ہے کہ " وہ کلاسیکی دنیا اور جدید دور دونوں کے ذائقے سے آشنا ہیں اور چاہتے ہیں کہ تجربہ روایت کی انگلی تھام کر چلنا سیکھے " اور میں اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ وہ دن دور نہیں جب سعید احمد اختر کی شاعری کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ وہ سنجیدہ غزل لکھنے والوں کے اس مختصر گروہ میں شامل ہیں جن کے تجربے کی انگلی تھام کر غزل کی روایت آگے بڑھ رہی ہے۔

سرشار صدیقی ——————

والکینو

شاعر : محمود کنور
ناشر : ادارہ نئی سمتیں، کراچی
صفحات : ۱۶۴، قیمت : سولہ روپے

ادب میں چونکا دینے والی باتیں کہنے کی روایت بہت پرانی نہیں ہے۔ افسانوں میں ایسی باتیں کہنے کی ابتداء منٹو سے ہوئی، تنقید میں یہ کام پروفیسر حسن عسکری مرحوم نے انجام دیا، جسے ہمارے دوست سلیم احمد نے آگے بڑھایا۔ حسن عسکری مرحوم اور سلیم احمد کی تحریروں سے لوگ اس لئے چونکتے ہیں کہ ان پر فن پاروں کے نئے معانی و مفاہیم کا انکشاف ہوتا ہے اور لفظ و معنی کے روایتی رشتوں کے علاوہ ان کے باطنی امکانات کے افق روشن ہوتے ہیں۔ یہ ان کے مطالعے کے لئے نامانوس، غیر متوقع لیکن خوشگوار تجربہ ہوتا ہے۔ اس تجربے کی مقبولیت سے فائدہ اٹھانے کے لئے ادھر کچھ برسوں سے ہمارے بیشتر لکھنے والے صرف چونکا دینے والا ادب پیدا کرنے کی شعوری کوششوں میں مصروف ہیں۔ جن میں سے اکثریت ایسے ناپختہ کار اہل قلم کی ہے جو اس ہنر کو محض بازی گروں کی طرح برت رہے ہیں۔ ٹوپی کے نیچے انڈا چھپا کر اس میں سے پلا چلایا پھڑ پھڑاتا ہوا کبوتر نکال کر دکھلاتے ہیں اور پرائمری کے کمسن بچوں کی تالیوں کی گونج کو اپنے فن کی تصدیق تصور کرتے ہیں۔ شعر کا خام مواد نثر ہی سے حاصل ہوتا ہے لیکن سوچ کے اس خام مواد کو تہذیب فن کے مرحلے سے گزارے بغیر بلا کم و کاست ضبط تحریر میں لانا اور پھر اس تحریر کو شاعری تسلیم کئے جانے پر اصرار کرنا ناقابل فہم معصومیت ہے۔ میں نے نظم آزاد اور نظم معریٰ کا ابتدائی دور دیکھا ہے اور ان کے خلاف وزن و بحر میں دو مصرعے موزوں کرنے والے کم اندیش شاعروں اور ان کے [illegible]

ہزیمت کا نقشہ بھی میرے سامنے ہے۔ ویسے بھی تخلیقی عمل کی ارتقائی تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ جذبے کے اظہار کے سانچے ہر عہد میں اپنے عصری تقاضوں کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہے ہیں تو پھر اپنے زمانے کی ضرورتوں کے حوالے سے سر اٹھانے والے کسی اجنبی تجربے کو سوچے سمجھے اور دیکھے پرکھے بغیر مسترد کر دینا نہ صرف جہل ہے بلکہ جاہلانہ مخاصمت بھی۔

میں نثری نظم نہیں لکھتا، لیکن نثری نظم کو ایک تو دریافت صنف کی حیثیت سے تسلیم ضرور کرتا ہوں۔ میرے عہد کی اس تجرباتی صنف کو افتخار جالب اور قمر جمیل جیسے باشعور اہلِ قلم نے اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے اور سر دست یہی بات ہمارے اطمینان کے لئے کافی ہے۔ البتہ اس خالصتاً تکنیکی مہم میں جو اکثریت صرف فیشن کے طور پر یا سستی شہرت کی حرص میں شامل ہوگئی ہے اس پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

"والکینو" کا مصنف بھی اس مہم میں شریک ہے اور اس کی نظموں نے غیر مبہم طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس نے نثری نظم کے مثبت تجربے کئے ہیں اور وہ اپنے فن کے ساتھ مخلص بھی ہے اور پر اعتماد بھی — محمود کنور کو اپنے عہد کی معنویت کا ادراک حاصل ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول کی تفصیلی جزئیات کا علم بھی رکھتے ہیں اور تجزیے کا حوصلہ بھی —— اس کی شاعری ایسے شخصی تجربات و مشاہدات کا حاصل ہے جو کھلی آنکھوں اور کھلے دل کی متقاضی ہے۔ اب اس کے انفرادی نتائج سے اختلاف تو کر سکتے ہیں انحراف نہیں کر سکتے۔ محمود کنور کی شاعری میں اظہار کی توانائی کا عنصر بھی خاصا نمایاں ہے۔ یہ قوت کسی فنکار کو اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب اسے اپنے وسیلۂ اظہار پر کلی اعتماد حاصل ہو جائے۔

کتاب کے آخر میں قمر جمیل کی ایک بے عنوان لیکن نہایت اہم تحریر ہے۔ جسے پڑھنے کے بعد مصنف اور تصنیف دونوں کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اور ہم مجموعی طور پر نثری نظم کے دور افتادہ مستقبل سے مایوس نہیں ہوتے۔

سرشار صدیقی

گذرے وقتوں کی عبارت

شاعر : ریاض مجید
ناشر : قرطاس پبلشرز، پیپلز کالونی، فیصل آباد
قیمت : ساڑھے سات روپے

زیرِ نظر مجموعے میں ریاض مجید کی غزلیں شامل ہیں۔ ادبی رسائل کے حوالے سے ریاض مجید کا نام ادب کے حلقوں میں معروف ہے۔ وہ نظم و غزل، دونوں اصناف کو فنکارانہ مہارت کے ساتھ اپنے احساسات کو زبان دینے کے لئے استعمال کرنے پر قادر ہیں۔

'گذرے وقتوں کی عبارت' میں شامل غزلوں کے مطالعے سے یہ یقین مزید تقویت پاتا ہے کہ ریاض مجید ایک منفرد سوچ اور حساس دل رکھنے والے شاعر ہیں جو زندگی، معاشرے، انسانوں اور خود اپنی ذات کو بھی حقیقت پسندی کے زاویے سے دیکھتے ہیں۔ وہ گرد و پیش موجود و متحرک اشیا کو اور لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی صورت حال کو زندگی کی مثبت قدروں کے حوالے سے پرکھتے اور برتتے ہیں۔

ریاض مجید کے یہاں روایت اور ماضی سے گریز کی روش نہیں ہے لیکن بنیادی طور پر وہ جدید طرزِ احساس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے لفظ، استعارے اور علامتیں غزل کے تناظر [illegible]

اور ان قدروں کی پامالی پر شدید روحانی کرب محسوس کرتے ہیں۔ یہی کرب ان کے فن میں ڈھل کر اسے خلوص اور تاثیر سے معمور کرتا ہے۔ ریاض مجید زندگی کے سفاک رویے کے ساتھ ساتھ اس کے جمالیاتی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ یہ مجموعۂ غزل، اردو غزل کے ارتقا کا عکس گر ہے۔

—————— حسن اکبر کمال

سورج کی آنکھ

شاعر : اعجاز فاروقی
ناشر : سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
قیمت : پچیس روپے

گذشتہ برسوں میں اردو شاعری اور افسانے میں علامت پسندی کے رجحان نے فروغ پایا ہے اور جیسا کہ کسی بھی نئے رجحان یا تجربے کے سلسلے میں اندیشہ ہوتا ہے۔ کچھ لکھنے والے علامت کے استعمال اور علامت نگاری کے فنی رموز سے مطلوبہ باخبری اور میلان طبعی سے محرومی کی بنا پر ابہام اور دروں بینی کی انتہا کی جانب رواں ہو گئے اور تاحال سفر میں ہیں۔

اعجاز فاروقی جن کی نظموں کا مجموعہ "سورج کی آنکھ" گذشتہ برس شائع ہوا ہے علامت کو اپنے اسلوب کا جزوِ غالب بنانے کے باوجود قاری کو ابلاغ سے محروم نہیں رکھتے کہ ان کی علامتیں اسی کائنات اور عالم آب و گل سے مستعار ہیں۔ وہ زندگی کی نمو پذیر توتوں، عہد جدید کے مسائل اور انسان کی بڑھتی ہوئی نفسی پیچیدگیوں کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ عارف عبدالمتین نے فلیپ پر رائے دیتے ہوئے بڑی حقیقت پسندی کے ساتھ اعجاز فاروقی کے منفرد لہجے، ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور ان کے فن میں لو دیتی حرارت اور توانائی کو ہم پر منکشف کیا ہے۔ فلیپ نہ پڑھا جائے تب بھی اعجاز فاروقی کی نظمیں یہی اوصاف قاری پر منکشف کر سکتی ہیں۔ یہ مجموعہ جدید اردو شاعری میں اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

—————— حسن اکبر کمال

نئے شعری تجزیے

مصنف : ڈاکٹر تبسم کاشمیری
ناشر : سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
قیمت : پندرہ روپے

ڈاکٹر تبسم کاشمیری ادبی تنقید کا ایک معروف نام ہیں۔ ان کی تحریریں مجموعی طور پر زندگی سے مثبت رویے اور سچے تعلق کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ وہ کسی فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین کرتے وقت صرف مجرد خیالات کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ یہ بھی دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی فن پارہ زندگی کے کس رویے کی پیداوار ہے اور زندگی پر کس طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ ان کی زیر نظر کتاب "نئے شعری تجزیے" بھی ان کے اس مثبت رویے کی شہادت دیتی نظر آتی ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس شہادت پر اگر جرح کی جائے تو کچھ اہم سوالات ابھر کر سامنے آ جائیں اور بات کو سمجھنے میں کچھ دشواری بھی پیش آ جائے لیکن آخری نتیجے میں شہادت کو منحرف (HOSTILE) نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

"نئے شعری تجزیے" تیرہ مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین انجمن پنجاب کی شعری تحریک سے لے کر جدیدیت کے بارے میں اہم مباحث کا ارتقائی جائزہ ہیں۔ تبسم کاشمیری نے اس جائزہ میں حالی، میرا جی، راشد، تصدق حسین خالد، مجید امجد اور ناگی کے حوالے سے نئے رجحانات کی تشریح کی ہے۔ آخری مضمون "جدیدیت کیا ہے" میں کچھ الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ کیونکہ ڈاکٹر تبسم نے اس مضمون میں جدیدیت کے اصطلاحی معنی سے قطع نظر اس لفظ کے لغوی معنی ہی کو کافی سمجھا ہے اور اسی طرح انھوں نے جدیدیت کو ہر زمانے میں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تجزیے میں تبسم صاحب نے یہ بات بالکل فراموش کر دی کہ کسی بھی زمانے میں کوئی دو شاعر منفرد بھی ہو سکتے ہیں اور اہم بھی۔ ان کے اسالیب میں جدّت بھی ہو سکتی ہے اور نیا پن بھی، لیکن یہ دونوں شاعر ضروری نہیں کہ جدید کہلائیں۔ مثلاً داغ اور حالی ہم عصر شاعر ہیں اور دونوں اہم ہیں۔ دونوں منفرد ہیں لیکن داغ روایتی شاعر ہیں جب کہ حالی نے جدیدیت کی بنیاد رکھی ہے۔ اسی طرح ہم یگانہ، فانی اور آرزو کو اہم اور منفرد شاعر تو کہہ سکتے ہیں لیکن وہ راشد، میرا جی، فیض اور فراق کی طرح جدید نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جدیدیت کا تعلق کیلنڈر سے کم اور طرزِ احساس سے زیادہ ہے۔ روایتی طرزِ احساس مابعد الطبیعاتی ہے جب کہ جدید حسیت اپنے جوہر میں مادّی اور زمینی ہے۔ جدید حسیت کی ابتدا یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے بعد ہوتی ہے جب کہ ہمارے ملک میں اس کا باقاعدہ شعور سرسید تحریک نے ابھارا ہے۔ بہر حال یہ تو یونہی ایک جملۂ معترضہ تھا۔ حقیقت میں ڈاکٹر صاحب کی یہ کاوش لائق تحسین ہے۔ انھوں نے جدید شاعری کا جس انداز سے مطالعہ کیا ہے وہ نئی ادبی صورت حال کو سمجھنے میں خاصی مدد کرتا ہے۔

______ احمد ہمدانی

کتنی دیر چراغ جلا

شاعر : باقی صدیقی
ناشر : ادبی تحریک، راولپنڈی
قیمت : بارہ روپے

باقی صدیقی غزل کے رسیا بھی تھے اور غزل کے رمز آشنا بھی۔ انھوں نے غزل کے روایتی انداز میں کسی نمایاں تبدیلی کی ضرورت کو محسوس کئے بغیر اپنی آواز پیدا کی ہے۔ اس آواز میں نہ تو نئی علامتوں اور نئی تمثیلوں کی بھرمار ہے اور نہ قدیم استعاروں اور تلمیحات سے آزاد ہونے کی شعوری کوشش۔ اس کے باوجود باقی کی غزل تازگی کے انبساط آگیں تاثر سے خالی نہیں۔ وہ تازگی اور جدت کو اپنے احساس سے باہر تلاش کرنے کے قائل معلوم نہیں ہوتے۔ عام استعاروں، رواں اور مانوس الفاظ چھوٹی اور مترنم بحروں میں غزلیں کہنا باقی کا شعار ہے لیکن یہ شعار کہیں بھی تقلید محض کی صورت اختیار کرتا نظر نہیں آتا۔ وہ زیر لب گفتگو کو بلند آہنگی پر ترجیح دیتے ہیں اور اس طرح ان کے لہجے میں ایک ایسا دھیما پن آجاتا ہے جو غزل کی جان ہے۔ ان کے مجموعہ کلام "کتنی دیر چراغ جلا" کی اکثر غزلیں ان کے دھیمے لہجے اور کچھ نہ کہہ کر سب کچھ کہہ دینے کے سلیقے کی آئینہ دار ہیں۔ چند شعر سنیئے۔

یہ غم دل یہ شب تنہائی ـــــ سوچتے سوچتے سو جاتے ہیں
بعض اوقات ہوا کے جھونکے ـــــ لو چراغوں کی بڑھا دیتے ہیں

اس طرح محفل یہ ہے اس کی نظر ـــــ سب ہیں تنہا اور کوئی تنہا نہیں
آج باقی کیا ہوا کو ہو گیا ـــــ دور تک پتّہ کوئی ہلتا نہیں

______ احمد ہمدانی

تعارف

شاعر : شریف منوّر
ناشر : کاروان پبلی کیشنز، کراچی
قیمت : دس روپے

جدید طرزِ احساس کے بیشتر شعراء کی طرح شریف منور بھی اپنی شاعری میں خود اپنی ذات سے الجھا نظر آتا ہے۔ وہ اس کارگاہِ شیشہ گری کو خود اپنے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن شریف منور کی یہ کوشش اس وجہ سے بالکل مختلف اور الگ بات ہے جس میں کہا جاتا تھا "یاں وہی ہے جو اعتبار کیا" ـــــ وہی ہے جو اعتبار کیا کہنے کے لئے محو کرنے کے عمل سے گزر کر حقیقت کا سراغ لگایا جاتا تھا۔ جب کہ جدید رویہ ذاتی احساس کو مرکز بنانے کا رویہ ہے۔ یہاں ذات کو محو کر لے یا فنا کرنے کے بجائے ذات کو ابھارنے یا اجاگر کرنے پر زور دیا جاتا ہے ـــ اپنی ذات کو مرکز بنانے کے رویے ہی نے شاید غیر شعوری طور پر شریف منور کو مجبور کیا کہ وہ اپنے پہلے مجموعہ کلام کا نام "تعارف" رکھیں۔ اور پھر اپنا تعارف کچھ اس طرح کرایا ہے ؎

میں اپنا رنگ سمجھتا ہوں روپ جانتا ہوں　　مجھے تو آپ ہر اک احتساب کرنا ہے
نظر میں موسم امروز بھی ہے فردا بھی　　گئی رتوں کا بھی مجھ کو حساب کرنا ہے
ہر ایک زخم سہا ہے اس اعتماد کے ساتھ　　ہر ایک زخم کو رشکِ گلاب کرنا ہے
بری بھلی شبِ ہجراں تو کاٹ دی ہم نے　　اب اس کی یاد میں دن بھی خراب کرنا ہے

شریف منور اپنے احساس کی شمع جلاتے ہیں تو اس کے اجالے میں بہت سی اور صورتیں بھی نظر آنے لگتی ہیں۔ اگر وہ شمع افروزی کے اس عمل میں مہارت پیدا کر لیں تو شاعری ان کی شناخت بن سکتی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ ان کی ابتدائی کوششوں کا نتیجہ ہے اور اس حیثیت سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ آئندہ وہ شمع افروزی کے اس عمل میں ضرور مہارت پیدا کر لیں گے۔

ـــــــــــــ احمد ہمدانی

میں محسوس کرتا ہوں میں سوچتا ہوں

شاعر : احسن علی خاں
ناشر : فیروز سنز، راولپنڈی
قیمت : پندرہ روپے

احسن علی خاں فکر اور احساس کے امتزاج کے شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت انسانی مرکز تہذیب سے تشکیل پائی ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری قدم قدم پر ذاتی احساس کی آنچ میں کندن بننے والے سماجی شعور کی شاعری ہے۔ ان کے دکھ اور ان کے سکھ دونوں سماجی رشتوں سے منسلک نظر آتے ہیں۔ یوں تو سب ہی کے دکھ سکھ سماجی رشتوں سے منسلک ہوتے ہیں لیکن اکثر اوقات سماجی شعور کی کمی کی وجہ سے لوگ انھیں سماجی رشتوں سے الگ کر کے دیکھتے ہیں جس سے ان کے احساس میں ایک ایسی اجنبیت آ جاتی ہے۔ جس سے کچھ حبس اور گھٹن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ احسن علی خاں کے دکھ اور سکھ دونوں کھلی فضا میں پھیلتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں انبساط آگینی کے ساتھ ایک عجیب تاثر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور شاید اسی انبساط آگیں تاثر کا نام شاعری ہے۔ احسن علی خاں کا زیرِ نظر مجموعہ ان کے بیان کی پختگی اور الفاظ پر ان کی گرفت کا احساس دلاتا نظر آتا ہے۔ وہ سادگی میں پُرکاری کے قائل نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ظاہری زمین سے الگ اندرونی حسن کی غماز ہوتی ہے۔ ان کا اسلوب جدید و قدیم کے جھگڑوں سے الگ ایک ایسی دلکشی کا حامل ہے جو ہر پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

ـــــــــــــ احمد ہمدانی

لوک تماشہ

مولف: عبدالغفور درشن، منصور قیصر
ناشر: لوک ورثہ کا قومی ادارہ، اسلام آباد

لوک تماشہ، لوک ادب کی تاریخ میں ایک نئے اور شاندار باب کا اضافہ ہے۔ ہماری طاقتور عوامی ثقافت میں لوک شعر و قصہ گوئی کی طرح لوک تماشے کو بھی بڑی اہمیت حاصل رہی ہے لیکن علم و دانش کے ایوانوں میں اسے کبھی پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ اقتدار کی طرح دانش کے محلات میں بھی عوامی سوچ اور عوامی ثقافت کا داخلہ ممنوع رہا ہے۔ اور دانشور جو جسمی طور پر نہ سہی ذہنی طور پر ہمیشہ محلات میں زندگی بسر کرتا ہے، خوف زدہ حکمراں طبقوں کی طرح اس نے کبھی کبھی عوامی ثقافت کے قریب آنے کی کوشش نہیں کی، اور لوک تماشے جیسا جاندار صیغۂ اظہار نظر انداز ہوتا رہا۔ اور اب منصور قیصر اور عبدالغفور درشن کے توسط سے لوک ورثے کے قومی ادارے نے اس جاندار کھیل کو کتابی شکل دے کر اسے نہ صرف ایک صنف کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے بلکہ آج جب ہم سائنسی فضاؤں کی بلندیوں پر سفر کرنے کے سبب زمینی رشتوں سے کٹتے جا رہے ہیں، ہماری زندگی کا ایک خوشگوار پہلو آنے والے وقتوں اور نسلوں کے لئے محفوظ ہو گیا ہے۔ لوک تماشے میں شامل بندر، سانپ، بجو، ریچھ، پتلیوں اور بندر، کتے اور بکری کا مشترکہ تماشہ پنجاب کے مقبول عام کھیل ہیں۔ جو نہ صرف دیہاتی زندگی کے پسندیدہ تماشے ہیں بلکہ شہروں کے لئے بھی غیر مانوس نہیں۔ لوک ورثے کے محقق عبدالغفور درشن نے گاؤں گاؤں گھوم کر انھیں عوامی اجتماعات سے ریکارڈ کیا ہے۔ جس کے سبب ان کی اصل شکل بگڑنے نہیں پائی۔ اور مداری کی اپنی زبان، اپنے لہجے اور اپنے رویے کو ضبط تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے۔ گو اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس کے ثقافتی پس منظر سے آگاہی ضروری ہے۔ لیکن جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اس سے لوگ تماشے کی ایک شکل بنتی چلی جاتی ہے جو نئے قاری کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ میرے نزدیک اس کتاب کے کئی افادی پہلو ہیں۔ اول یہ کہ لوک تماشے کی تاریخ کا کھوج لگانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ہماری ثقافتی زندگیوں میں لوک ادب و تماشے کے عمل دخل کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ لوک ادب کا یہ پہلو زیادہ جاندار ہے کہ اس میں ہمارے عصر کی بھرپور جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ گو یہ تصویریں صدیوں سے نسل در نسل، سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی عصر حاضر تک پہنچی ہیں۔ لیکن مداری کی ذہانت اسے موجود کے حوالے سے ہماری طرف اچھال دیتی ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ ہماری معاشی اور معاشرتی سرحدیں اس طرح تشکیل پاتی ہیں کہ صدیوں سے اب تک ان میں قابل محسوس تبدیلی نہیں آئی۔ ہماری عوامی زندگی کے صدیوں پرانے رنگ ڈھنگ ہنوز موجود ہیں۔ اور اکثر مقامات پر جب ہم مداری کی لچھے دار گفتگو کے سحر میں قید ہوتے ہیں، وہ مسلسل ہماری معاشرتی کج روی پر طنز کے تیر چلا رہا ہوتا ہے۔ اس کے لفظوں میں عوامی دانش کے موتی اس طرح جڑے ہوتے ہیں، جو ہماری سماجی اور عوامی زندگی کے صحیح آئینہ دار ہوتے ہیں۔ وہ جا بجا اس جبر کے معاشرتی اسٹرکچر پر حملہ آور ہوتا ہے۔ ہمارے درمیان منافقت کی نشاندہی کرتا ہے اور دیمک زدہ شہتیر کی طرح ہماری کھوکھلی زندگی کو طنز کی قمچیوں سے مسلسل بجا کر ہمیں خالی خولی ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

دوسرا اہم پہلو تماشوں کی من و عن نقل ہے۔ محقق اور مترجم نے مداری کی پوری گفتگو جس طرح سنی بالکل اسی طرح تحریر کے دائرے میں لے آیا۔ اس سے نہ صرف تماشے کے بنیادی فلسفے پر روشنی پڑتی ہے بلکہ مداری کی ذہنی وابستگی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے مذہبی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی رجحانات و رویوں کا پتہ بھی چلتا ہے۔ اس لئے کہ مداری نہ صرف ریچھ، بندر یا سانپ کو نچا رہا ہوتا ہے بلکہ بیک وقت وہ عوامی جذبات سے بھی کھیلتا ہے۔ وہ وہی بات کہتا ہے جسے لوگ پسند کرتے ہیں۔ وہ وہی حرکتیں کرتا ہے جس سے لوگ محظوظ ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کے کمزور اور دکھی پہلو تلاش کر کے اس پر ضرب لگاتا ہے، اور اس طرح مداری عوامی ذہن کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ اس کتاب کا ایک اور افادی پہلو تماشے کے فن اور فن سے وابستہ لوگوں کا تعارف ہے۔ مداری اور اس کے خاندان کے بارے میں مختصر گفتگو

سے ایک مختصر سی تاریخ مرتب ہوتی چلی جاتی ہے، جو اس فیلڈ میں آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لئے بڑی معاون ثابت ہو سکے گی۔ کیونکہ اس سے ایک بات سامنے آتی ہے کہ ماضی میں اس کھیل کو زبردست عوامی حمایت حاصل تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتی جارہی ہے۔ اور بقول ایڈیٹر اگر اس کی صحیح سرپرستی نہ کی گئی تو یہ عوامی کھیل دم توڑ جائے گا۔ لوک تماشے اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جسے تحقیق کے بعد عبدالغفور درشن نے پنجابی میں اور اردو افسانے کے ممتاز نام منصور قیصر نے اسے خوبصورت اردو میں منتقل کیا ہے۔ اپنے مواد کے اعتبار سے یہ ایک قیمتی کتاب ہے جو ثقافت کے دلدادہ لوگوں کے لئے بڑی مفید رہے گی۔

_____ اعجاز راہی

مجلہ انجمن عباسیہ

ترتیب: سکندر نقوی
ناشر: انجمن عباسیہ، جے ون ۲۷۲، کورنگی، کراچی۔

انجمن عباسیہ کراچی نے ایک مجلہ شائع کیا ہے جس کے نگراں جناب سید اصغر حسین رضوی اور جناب سید احمد جوہر دہلوی ہیں۔ اس کے مدیر یا اس کے مرتب جناب سکندر نقوی ہیں۔ اس مجلہ کا مجموعی تاثر گہرا اور خوبصورت ہے۔ یہ بات انتہائی اہم ہے کہ معروف استاد، دانشور، محقق جناب پروفیسر کرار حسین کے بھی دو مضامین شامل اشاعت ہیں۔ کرار صاحب کا طرزِ گفتگو ہو کہ طرزِ تحریر، بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات۔ اس کے علاوہ مولانا سید احمد جوہر دہلوی نے جو خطابت کا جوہر خاص رکھتے ہوئے تحریر میں محققین کا رویہ رکھتے ہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر بہت بلیغ مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ دوسرے معاونین قلم نے بھی اس مجلّے کے شایانِ شان مضمون اور شعر لکھے ہیں۔ اس مجلّے کے نگران صاحبان اور مرتب جناب سکندر نقوی دلی داد کے مستحق ہیں۔

_____ مہر افروز

نسیم درانی (ایڈیٹر، پبلشر) نے انجمن پریس (پرنٹر) سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ 'سیپ' بلاک ڈی، نشیر شاہ کالونی، کراچی ۲۸ سے شائع کیا۔ (اشاعت شمارہ ۴۰، مارچ اپریل ۱۹۸۰ء)

آرٹس انٹرنیشنل

اُردو زبان میں فنونِ لطیفہ پر شائع ہونے والا واحد رسالہ ،

پکاسو نمبر کی تیاری کر رہا ہے

عظیم پکاسو جدید مصوّری کا ہیرو ہے ،

پکاسو اپنے فن کی طرح شخصیت میں بھی پیچیدہ اور پرکار ہے

پکاسو اپنے زمانے کی ہر تحریک میں پیش پیش ہے ،

پکاسو مر گیا

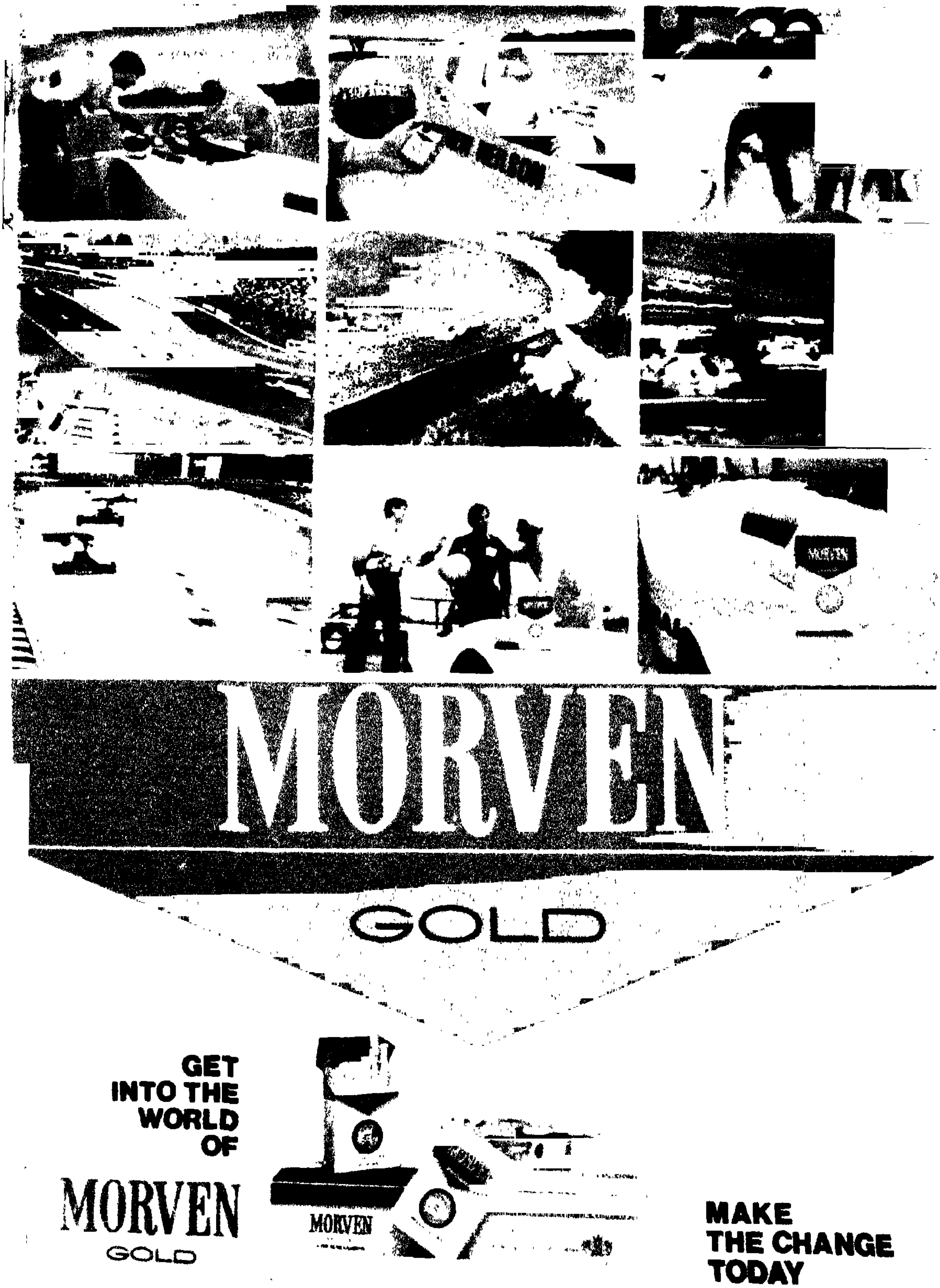
مگر پکاسو کا فن زندہ ہے ،

عظیم مصوّر کے خراجِ عقیدت میں

آرٹس انٹرنیشنل

پکاسو نمبر عظیم پکاسو کے

شایانِ شان ترتیب دے رہا ہے ،


MORVEN
GOLD
GET
INTO THE
WORLD
OF
MORVEN
GOLD
MORVEN
MAKE
THE CHANGE
TODAY